اِنشاء



ہمارا حرفِ صداقت انسانی منشور بنے گا

جلد : ۱۳ شمارہ : ۱۱-۱۲ نومبر دسمبر ۱۹۹۸ء

ماہنامہ **انشاء** کلکتہ

ISSN : 0971 - 6009

رسالے کا دسواں خاص نمبر

بخش لائلپوری نمبر

Bakhsh Lyallpuri Number

رہنما : احمد سعید ملیح آبادی
ڈاکٹر قمر رئیس

مدیر ف۔ س۔ اعجاز

اس شمارے کے معاون : کریم رضا مونگیری
مدیر "روزنامہ عکاس" کلکتہ

مشیران محمد امیر الدین، افضل اقبال

سابقہ خصوصی شمارے :

(۱) ★ احمد سعید ملیح آبادی نمبر (۲) ادیبوں کی حیات معاشقہ
(۳) قمر رئیس نمبر (۴) انشاء عالمی اردو افسانے (۵) باہری مسجد نمبر
(۶) صدی شمارہ (۷) [illegible] ادب نمبر (۸) [illegible] نمبر
(۹) [illegible] نمبر

اس شمارے کی قیمت
ہندوستان میں -/60 روپے
غیر ممالک میں £ 5 یا US$ 8

عام شمارے کی قیمت
ہندوستان میں -/10 روپے

سالانہ ممبری فیس
ہندوستان میں -/100 روپے
غیر ممالک میں £ 12 یا
US $ 20

گرافکس ثاقب فیروز

انشاء گرافکس
۶-۱ اے، کنائی سیل اسٹریٹ، کلکتہ - ۷۰۰۰۷۳
فون ۔ ۲۳۵-۳۱۰۷

Mailing Address :
Mahnama Insha
Insha Publications
25-B, Zakaria Street, Calcutta - 700 073
Phone : 235-4616 ★ Fax : C/o. 238-8268
(Attn. Mahnama Insha)

CARE :
Drafts / Cheques are accepted in favour of "M/s. Insha Publications"
(U.K. Subscribers are advised to send bearer B.P.O.)

فہرست

ترتیب نمبر	عنوان		مصنف	صفحہ نمبر
۱	گفتنی ترقی پسند روایت کا امین بخش لائلپوری	(اداریہ)		۴
۲	مختصر کوائف			۷
۳	بخش لائلپوری میرا بھائی	نجی تاثرات	کریم رضا مونگیری	۸
۴	انتخاب کلام بخش لائلپوری	مرتب	ف۔س۔اعجاز	۱۰
	[صفحہ ۱۰ تا ۳۷ اور صفحہ ۱۱۸-۱۲۳-۱۳۰-۱۳۵-۱۳۷-۱۶۱]			
۵	ضمیر کا رزمیہ — بخش لائلپوری کی شاعری	مضمون	ڈاکٹر سعادت سعید	۳۸
۶	پاکستاں کی محبت میں چور لندن میں فیصل آباد کا بخش لائلپوری	مضمون	محمود ہاشمی	۴۹
۷	لہو کے خراج کا شاعر	مضمون	فارغ بخاری	۶۰
۸	ایک کرمکِ شب تاب بخش لائلپوری	مضمون	پروفیسر جمیل ملک	۷۱
۹	بخش کا لہجہ دوٹوک ہے	مضمون	ڈاکٹر صلاح الدین حیدر	۷۷
۱۰	اردو شاعری میں احتجاج کی روایت	مضمون	ڈاکٹر طارق عزیز	۸۱
۱۱	اس غنچۂ خیال کا ذوقِ نمو تو دیکھ	مضمون	(از مکتوب) نصر ملک	۸۳
۱۲	لہو کے خراج کو خراج	مضمون (از مکتوب)	ایم۔ایم حیدر	۹۱
۱۳	بخش لائلپوری کی ''باد شمال'' کا تعارف	مضمون	مسعود منور	۹۴
۱۴	بخش لائلپوری شاعرِ حق پرست	مضمون	پروفیسر محمد شریف بقا	۱۰۱
۱۵	'باد شمال' کا ایک سرسری جائزہ	مضمون	پروفیسر سلیم اختر	۱۰۶
۱۶	بخش لائلپوری زندہ ادب کا شاعر	مضمون	جاوید شاہین	۱۱۲
۱۷	بخش لائلپوری اور ''باد شمال''	مضمون	سیدہ نسرین نقاش	۱۱۶
۱۸	بخش لائلپوری کا شعری اجتہاد	مضمون	موسیٰ نظامی کلیم	۱۱۹

فہرست

ترتیب نمبر	عنوان		مصنف	صفحہ نمبر
۱۹	بخش لائلپوری زندہ اصولوں کا شاعر	مضمون	پروفیسر سجاد حارث	۱۲۴
۲۰	"زندانِ شہر" کی شاعری اور شاعر	مضمون	پروفیسر محمد حسن	۱۳۱
۲۱	ایک حرف میرا بھی	مضمون	جاوید حکیم قریشی	۱۳۶
۲۲	موسم بدلنے کا منتظر	مضمون	پروفیسر پرویز پروازی	۱۳۸
۲۳	"چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا"	مضمون	حیدر طباطبائی	۱۴۱
۲۴	سخن کا اک نیا انداز	مضمون	مسعود منور	۱۵۰
۲۵	ابھی موسم نہیں بدلا	مضمون	نعیمہ ضیاء الدین	۱۵۶
۲۶	"ابھی موسم نہیں بدلا" ایک تاثر	مضمون	کرشن ادیب	۱۶۲
۲۷	بخش لائلپوری سے خصوصی انٹرویو	مرتب	سید ابرار حسین ترمذی	۱۶۸
۲۸	بخش کے نام پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک خط			۱۹۶
۲۹	مرقعِ بخش			۱۹۷
	دو انگریزی مضامین :			
۳۰	Bakhsh Lyallpuri, The prophet of Change		Anwar Shaikh اردو صفحات (۲۲۲تا۲۱۰)	3 to 15
۳۱	A poet outside his milieu		Rakshat Puri اردو صفحات (۲۰۹تا۲۰۶)	16 to 19

مشاہیر کے مختصر آرا

رئیس امروہوی ۴۸ فیض احمد فیض ۵۹ گوپی چند نارنگ ۷۰
ڈاکٹر قمر رئیس ۸۰ ڈاکٹر انور سدید ۸۴ عابد حسن منٹو ۹۰
شہریار ۹۳ ڈاکٹر شکیل رضوی ۱۰۵ پروفیسر امین مغل ۱۱۵

گفتنی

اداریہ

ترقی پسند روایت کا امین بخش لائلپوری

یہ ہے "بخش لائلپوری نمبر"۔ اس کے تناظر میں بخش کے بارے میں قارئین انشاء سے کچھ کہنا واجب ہے۔

دو قوم بننے کے بعد بر صغیر کے ادباہ تادیر انوکھی انسانی واردا توں کا اثر قبول کرتے رہے۔ ان کا تخلیقی رد عمل جس سطح پر ظاہر ہوا وہ تقسیم ملک کی نفی کی سطح تھی۔ مذہبی تنگ نظری اور لسانی عصبیت کو اچھے ادیبوں نے آڑے ہاتھوں لیا۔

بٹوارے کے چند سال بعد دیکھا گیا کہ دونوں طرف کے عوام کو لوٹا اور گمراہ کیا جا رہا ہے۔ سرمایہ دار اور جاگیر دار مزدوروں اور کسانوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ دونوں طرف کے سیاستداں اپنے اپنے ملک کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ لوٹ، ڈکیتی، رنا، بے قاعدگی و رشوت کا دور دورہ ہے۔ مذہب کے نام پر اکثریتی و اقلیتی فرقے ایک دوسرے سے بدگماں اور متصادم ہیں۔ پاکستان فوجی ڈکٹیٹروں کے ہاتھوں برباد ہوتا رہا اور مارشل لا پاکستانی عوام پر تھوپا جاتا رہا۔ تا حال پاکستان کا کوئی منضبط آئین نہیں ہے۔ ہندوستان بہر حال ایک مکمل جمہوریت ہے اور ایک جامع آئین رکھتا ہے۔ لیکن یہاں بھی سیاسی اور اقتصادی بھیڑیے فلاح اور سوشلزم کے نام پر عوام کا خون چوستے آرہے ہیں۔ دونوں

ملکوں میں ترقی کے جدید نظریات اور منطق و عمل میں کوئی تال میل نہیں ہے۔ ہمارا معاشرتی اور سرکاری نظام ہماری روشن خیالی کا متحمل نہیں ہو سکتا اور نہ اس نام نہاد پیش رفت کی کفالت کر سکتا ہے جس کے ہم دعوئی دار بنے پھر رہے ہیں۔ اگر پاکستان کا موجودہ وزیر اعظم غوری میزائل لانچ کر کے اترا رہا ہے تو ہندوستان کا پردھان منتری اگنی، پرتھوی میزائل لانچ کرنے اور ۵ نکلیائی دھماکے کر گزرنے پر نازاں ہے۔ دونوں قومیں فاقہ مستی کا ناچ ناچ رہی ہیں۔ لوگوں کو مناسب قیمتوں پر اناج اور سامان دستیاب نہیں ہیں لیکن ایٹمی فتوحات کا ڈھنڈورا پیٹنے کا خبط لیڈروں کے سروں پر سوار ہے۔ کوئی بلدیاتی، صوبائی یا مرکزی بجٹ ایسا نہیں آتا جسے غریب کا ہمدرد کہا جا سکے۔

یہ حالات تقسیم ہند کے پہلے کے حالات سے یکسر مختلف ہیں۔ ان حالات میں دونوں طرف کے باشعور ادیب ذہنی اذیت جھیلتے آرہے ہیں۔ وہ آگ پیتے ہیں اور آگ ہی اگلتے ہیں اور ان شرمناک اور افسوسناک حالات کے جبر کو صاف پہچان سکتے ہیں۔ آزادی سے قبل ہمارا دشمن انگریز تھا۔ اب ہمارے دشمن ہمارے اپنے نمائندے ہیں۔ بقول علی سردار جعفری ۔

بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل نظامِ دار و رسن وہی ہے

اس احساس کے تحت ادب میں مزاحمت کا انداز

بدل گیا ہے۔ طنز اور احتساب اور لیڈروں کا ضمیر جھنجھوڑنے کی روش شعرا کے عام مذاق میں شامل ہو گئی ہے۔ معاشرے سے اس طرح کی وابستگی یقیناً شعرا کی سنجیدگی اور تشویش کا بیّن ثبوت ہے۔ فرد اور سماج کے رشتے معناً تبدیل ہو چکے ہیں اور تبدیلی کا یہ عمل ہمہ وقت جاری ہے۔ آدمی انسانی بم بننے پر آمادہ ہے، سوسائٹی دہشت زدہ ہے۔ لیکن طبیعت پر جھلاہٹ سوار ہونے کے باوجود شاعروں کی عینیت پرستی اور تخیل زدگی میں کمی نہیں آئی۔ ان کا ادب مایوس اور نامراد فرد کو کسی نہ کسی قسم کا تحفظ فراہم کر رہا ہے جسے برصغیر ہند و پاک کے ارباب اقتدار کتے کی موت مار کر اپنی ناپاک ہوس پوری کرنا چاہتے ہیں۔

سقوط ماسکو کے بعد برصغیر کے مورچہ بند ادیب اگرچہ تنظیمی طور پر سرگرم نہیں رہ گئے لیکن ان میں سے کئی اپنی تخلیقات کے ذریعہ اپنے مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور روس کے زوال کو اشتراکیت کی شکست سے تعبیر کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بخش لائلپوری اس قبیل کے ایک شاعر ہیں۔

بخش کی غزلیں، نظمیں وغیرہ اسی پس منظر کی دین ہیں۔ اگرچہ اب وہ برطانیہ کے شہری ہیں لیکن ''سمجھو دہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا'' کے مصداق آج بھی جسے یہ اپنا دلی اور ذہنی وطن تسلیم کرتے ہیں وہ پاکستان ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ مغرب میں بسے ہوئے کئی معتبر ادیبوں کے برعکس ان کے یہاں ہجرت کا کرب اور ہجرت کے مضامین کم ملتے ہیں۔ بخش انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ کے بانیوں میں سے ہیں اور انجمن کے صدر ہیں۔ وہ لبرل ڈیموکریٹ نہیں ہیں، ریڈیکل ماڈرنسٹ نہیں ہیں۔ بخش نے خود کو ایسی کوششوں سے باز رکھا ہے اور اس میں ان کے اپنے مزاج کو بڑا دخل ہے۔ اور مقصد کو بھی۔ انہوں نے شاعری کو عوام کی نجات کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ اور اب تک خطۂ پاک کا منظر نامہ تبدیل کرنے کے لئے ایک بے باک اور جری شاعر کا فرلفیہ انجام دیتے آئے ہیں۔ جب وہ اپنی نظم کے ذریعہ کہتے ہیں ''ابھی موسم نہیں بدلا'' تو ان کا پیغام ہوتا ہے کہ ''موسم'' بدلنے کی تحریک کو جاری رہنا چاہئے۔ اگر فیض کی طرح بخش کے دل میں حرف حق کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے تو بطرز حبیب جالب انہوں نے احتجاج کو اپنی شاعری کا محض رسمی عنصر بننے نہیں دیا بلکہ اپنے طور پر احتجاج کو ایک فنی حرکت اور حرمت عطا کی ہے۔ بنیادی طور پر بخش کی شاعری غیر عشقی اور غیر رومانی ہے اور جس نہج کے وہ فنکار ہیں اس میں بنیادی سماجی حقیقتوں کا اعتراف بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں ''آئین جواں مردی حق گوئی و بیباکی'' کے سوا کوئی کلیہ کارگر نہیں کہا جا سکتا۔ بخش کے دل میں سرفروشی کی تمنا ہے اور وہ بازوئے دشمن کا زور آزمانے کے درپے ہیں۔ ان کی شاعری عزم، توانائی اور بے تابی کی شاعری ہے۔ انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جبلی ۸۶ء میں لندن میں منائی اور اس طرح تحریک سے اپنی عملی وابستگی کا ثبوت فراہم کیا۔ پاکستان، برطانیہ اور مغرب بعید میں ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا اپنا مقام ہے۔

انشاء کا یہ شمارہ بخش لائلپوری کے فنی جہات سے متعلق لکھے گئے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں ان کا کچھ منتخب کلام بھی شامل ہے۔ اپنے خود نوشت سوانح کی کسر انہوں نے باقی رہنے دی ہے۔ لیکن مشمولہ مضامین میں ان کے سوانحی حالات جابجا بیان ہوئے ہیں۔ ان سے لیا گیا ایک طویل انٹرویو سید ابرار حسین ترمذی نے مرتب کیا ہے جس سے نہ صرف ان کے نظریات بلکہ تخلیقی مزاج اور افتاد طبیعت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

کامیاب ادب یا ادب کی کامیابی کے لئے اختلاف

رائے ایک ضروری امر ہے۔ بعض ناقدوں نے بخش کو ایک احتجاجی شاعر قرار دیا ہے۔ کاش وہ یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا فرماتے کہ احتجاج کے خلاف بھی احتجاج ہوتا ہے۔ ہماری رائے میں بخش کی شاعری ترقی پسندی کا روشن ثبوت ہے اور ترقی پسندی مزاحمتی ادب کے مقابلے میں ایک وسیع اصطلاح بھی ہے۔ اگر کوئی بخش کی شاعری کو مزاحمتی ادب کے زمرے میں شمار کرتا ہے تو ضرور وہ اس نظریہ کا حامی ہوگا کہ ادب بذات خود ایک مزاحمت ہے۔ لیکن یہ اگر سچ ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ ادب کو مزاحمت ترقی پسندی نے سکھائی ہے، مزاحمت نے ادب کو ترقی پسند کے آداب نہیں سکھائے ہیں۔ آدمی ناموافق حالات میں اکثر خوفزدہ یا دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ ایک عوامی شاعر اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کو اس خوف اور دہشت سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ چاہے وہ ظلم اور جبر اپنے وطن کے ظالموں اور جابروں کا ہو یا دنیا کے کسی خطہ میں کسی ظالم و جابر کا ہو۔ بخش نے نظام پاکستان کے مضر اثرات کے خلاف آواز اٹھائی ہے تو سامراجی طاقتوں اور یہودی غاصبوں کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کیا ہے جو مسلمانوں کے قبلۂ اول پر ناجائز قبضہ کئے بیٹھے ہیں۔ آج ترقی پسندی صرف اپنے وطن اور روس میں اشتراکی نظریہ کی حفاظت کے خیال اور کوشش تک محدود نہیں رہ گئی ہے۔ ان حالات میں شاعر کا یہ کہنا کہ ؎

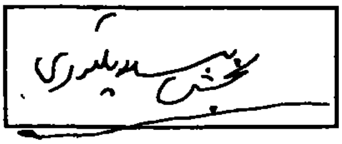
بخش ہمارا حرف صداقت
انسانی منشور بنے گا

ہمیں اپنے خیال کی تائید معلوم ہوتا ہے۔ بخش کی شاعری بجا طور پر انسانی منشور کی ایک شق ہے۔ امید ہے لوگ اسے اسی تناظر میں دیکھیں گے اور پڑھیں گے۔

چونکہ پاکستان، برطانیہ اور مغرب بعید میں بخش کی شاعرانہ حیثیت مسلّم ہے اس لئے بیشتر ان ہی ملکوں کے ناقدوں نے بخش کے بارے میں کھل کر اظہار خیال فرمایا ہے۔ ہندوستان میں نسبتاً انہیں کم لوگ جانتے ہیں البتہ حلقۂ انشاء ان سے اچھی طرح متعارف ہے۔ اب اس شمارے کے ذریعہ اہلِ نقد اُن سے اور اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔ وہ بلا شبہ ترقی پسند روایت کے امین ہیں۔ اور آزادئ رائے کے حامی ہیں۔ ان کے بارے میں لکھے گئے مضامین اہل الرائے کی اپنی اپنی فکری اپج اور صواب دید کے مطابق ہیں۔ اگر صاحبِ موضوع کی پسندیدگی کے اعتراف میں کہیں کوئی پرستار کوئی خاص دعویٰ کر بیٹھا ہے تو ایسی تحریریں بھی اس دستاویز میں شامل ہیں جن میں ان دعووں کو رد کر دیا گیا ہے۔ کھلے ذہن کے ناقدوں کا جذبۂ ستائش مشروط نہیں ہوتا۔ بہر حال دونوں طرح کے مضامین پر مشتمل یہ شمارہ اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔ قارئین کو دعوت ہے کہ وہ حسب معمول اپنی کھلی رائے سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

اس دستاویز کے محرک و معاون ہمارے اور بخش لائلپوری کے مشترک دوست جناب کریم رضا مونگیری مدیر روزنامہ ''عکاس'' (کلکتہ) ہیں۔

مختصر کوائف



نام کرم بخش

ادبی نام بخش لائلپوری

تاریخ پیدائش ریکارڈ میں گیارہ نومبر ۱۹۳۴ء قیاساً ۱۹۳۱ء

جائے پیدائش موضوع فتوڈھینگہ، کپور تھلہ مشرقی پنجاب۔

تعلیم ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں۔ ثانوی تعلیم رندھیر ہائی اسکول کپور تھلہ۔ ایم بی ہائی اسکول اوکاڑہ۔ اکاؤنٹس اور معاشیات میں اسناد کراچی یونیورسٹی سے۔

ملازمت پاکستان ائیر فورس ہیڈ کوارٹر ماڑی پور، سات سال، نیشنل بنک آف پاکستان، ہیڈ آفس کراچی، ڈھائی سال، برٹش ائیر ویز فلائٹ سیکشن لندن ائیرپورٹ اٹھارہ سال۔ ۱۹۸۲ء میں ملازمت سے خود اختیاری ریٹائیرمنٹ۔ ذاتی کاروبار پانچ سال۔ دوبارہ ملازمت گروپ فور سیکورٹی میں آٹھ سال۔ نومبر ۱۹۹۵ء میں ہارٹ اٹیک کے بعد میڈیکل گراؤنڈ پر مکمل طور پر ریٹائیر ہوں۔

ادبی سرگرمیاں لندن ورود ستمبر ۱۹۶۱ء میں ہوا، ۱۹۶۷ء میں حلقۂ اہل سخن برطانیہ قائم کیا۔ ۱۹۸۳ء میں مجاہد ترمذی سے مل کر فیض کلچرل اکادمی کی بنیاد رکھی۔ فیض صاحب کے ساتھ ۱۹۸۴ء میں لندن یونیورسٹی کے اشتراک سے پہلے اور آخری فیض مذاکرے اور بین الاقوامی مشاعرے کا انعقاد کیا، جس میں بھارت اور پاکستان کے مشاہیر ادیبوں نے شرکت کی۔ فارغ بخاری، جاوید حکیم قریشی اور دیگر احباب سے مل کر لندن میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی از سرِ نو تشکیل کی۔ اگست ۱۹۸۵ء انجمن کی گولڈن جبلی کا انعقاد کیا جس میں تقریباً تمام ممالک سے ساٹھ مندوبین نے شرکت کی۔ غالباً ۱۹۹۰ء سے میں انجمن کا صدر ہوں اور جاوید حکیم قریشی انجمن کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے تھے اور تادم تحریر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بین الاقوامی مشاعروں اور کانفرنسوں کے حوالے سے امریکہ، کینیڈا، یورپ اور بھارت کے کئی ایک دورے کر چکا ہوں۔ لندن میں بھارت اور پاکستان سے آنے والے شعراء اور ادباء کے اعزاز میں علمی و ادبی تقریبات منعقد کرتا رہا ہوں۔

تصانیف شعری (۱) لہو کا خراج ۱۹۸۵ء (۲) زندانِ شہر ۱۹۸۷ء (۳) بادِ شمال ۱۹۸۹ء (۴) ابھی موسم نہیں بدلا ۱۹۹۴ء (۵) ایک سمندر میرے اندر۔ (زیرِ اشاعت)

BAKHSH LYALLPURI
337, STAINES ROAD, HOUNSLOW, MIDDX, LONDON TW4 5AP0 PHONE · 181-5-70-9282

بخش لائلپوری، میرا بھائی

کریم رضا مونگیری، ایڈیٹر روزنامہ عکاس کلکتہ

۱۹۶۷ء میں جب میں نے فلمی ہفت روزہ ''عکاس'' خریدا تھا تو مجھے علم نہیں تھا کہ آہستہ آہستہ یہ سیاسی ہفت روزہ ہو جائے گا اور پھر یہ ایک روزنامہ کی حیثیت سے جانا جائے گا اور ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ یہ روزنامہ مجھے لندن تک لے جائیگا۔ سیاحت کا شوق تو مجھے شروع ہی سے تھا اور اپنی فاقہ کشی کے دنوں میں بھی سیر و تفریح سے باز نہیں آتا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں جب موقع ملا کہ انگلستان کی سیر کی جائے تو پہلا مسئلہ غیر ملکی زر مبادلہ کا تھا اور دوسرا ایک انجان ملک کے انجان شہر میں وارد ہونا اور پھر وہاں سے بخیر و خوبی اپنے ملک واپس آنا۔ برطانیہ کے ایک اور شہر برمنگھم میں میرے ایک قلمی دوست جے ایس چوہان (مرحوم) رہتے تھے۔ انکی نگارشات اکثر عکاس میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ میں نے اس سلسلے میں انکا تعاون چاہا تو انہوں نے مطلع کیا کہ برمنگھم میں ان کے گھر مہمان بننے کے بعد یہ ممکن نہیں کہ روزانہ لندن جاکر سیر و تفریح کی جائے۔ اس کے لئے لندن میں ہی کسی کے یہاں قیام کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے از راہ ہمدردی مجھے کچھ ایسے لوگوں کے نام پتے لکھے جنکا تعلق یا تو شعراء کی برادری سے تھا یا پھر ادباء کی۔ میں نے کئی خط لکھے اور ہر کسی سے یہ اطلاع فراہم کرنے کی گذارش کی وہاں کے گیسٹ ہاؤس یا پھر متوسط قسم کے ہوٹلوں کے یومیہ کرائے کتنے ہوتے ہیں۔ کسی کا جواب نہیں آیا تو مایوسی ہونے لگی اور ایسا محسوس ہوا کہ انگلستان کا سفر ایک خواب ہی رہ جائیگا۔ اچانک ایک روز ایک خط لندن سے آیا۔ کھولا تو پتہ چلا کہ برطانیہ کے ترقی پسند شاعر جناب بخش لائلپوری کا ہے۔ انہوں نے نہ صرف مجھے لندن آنے کی دعوت دی بلکہ انہوں نے اپنا مہمان بنانا بھی منظور کر لیا۔ ان کے اس خط سے مجھے بڑا حوصلہ ملا اور ایسا لگا کہ اب لندن کا سفر ممکن ہو جائے گا۔ میں اپنی بیگم کے ہمراہ ۱۹۸۴ء ماہ جون میں لندن گیا اور بخش لائلپوری صاحب کا مہمان ہوا، بخش لائلپوری سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس پہلی ملاقات میں ہی بخش صاحب اور ان کی اہلیہ جو اب میرے لئے بھابھی کا درجہ رکھتی ہیں اور ان کے بچوں نے ہماری اتنی پذیرائی کی کہ ہم لوگ ان کے احسان مند ہو گئے۔ اپنے ۲۰، ۲۲ روزہ قیام کے دوران ایسا محسوس ہی نہیں ہوا کہ ہم دیار غیر میں ہیں اور اپنے وطن سے دور ہیں۔ بخش فیملی سے ہمارے رشتے

اتنے مضبوط ہوگئے کہ ہمیں ایسا لگا کہ ہماری پہچان برسوں پرانی ہے۔

اس کے بعد تو پھر لندن میرا خانۂ ثانی بن گیا اور بخش بھائی کے دولت خانہ کو غلط یا صحیح اب میں اپنا ہی گھر سمجھتا ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ گذشتہ ۱۵ برسوں میں ۸ بار میں لندن گیا اور پھر لندن سے دیگر ممالک کو گیا۔

کبھی کبھی دوستی کا رشتہ بڑے سے بڑے رشتوں سے بالا ہو جاتا ہے بخش بھائی کے ساتھ میرا تجربہ کچھ ایسا ہی ہے اور اب میں بخش کو اپنا بڑا بھائی ہی تصور کرتا ہوں۔ ان کے کئی دیوان منظر عام پر آچکے ہیں۔ بحیثیت ترقی پسند شاعر ان کی شخصیت ادبی حلقوں میں اور ہم عصروں میں تسلیم کی جاچکی ہے۔ ''انشاء'' کے اس خاص نمبر میں ان کے کلام کی روشنی میں ان کے مختلف فنی پہلوؤں پر تفصیلی بحث ہوئی ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ میں ''بخش لائلپوری میرا بھائی'' کے عنوان سے ان کی شخصیت پر کچھ روشنی ڈالوں اور اپنے بھی تاثرات مختصراً قلمبند کروں۔ میں اپنے ہم عصر اور دوست جناب ف۔س۔اعجاز کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے بخش لائلپوری پر یہ نمبر شائع کر کے ان کی حیات اور فنی جہات کو ایک دستاویزی حیثیت دی ہے۔ بخش کی شاعری لوگ پڑھتے رہے ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ف۔س۔اعجاز نے جس ہنر سے اس نمبر کو ترتیب دیا ہے اور مختلف اہل الرائے کی نگارشات کو اس میں جس کھلے اور عالمانہ انداز سے جگہ دی گئی ہے اس سے بخش صاحب کی شخصیت اور شاعری میں ایک نئی کشش اور دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کاوش میں سخن بخش اور سخنور بخش کے کئی نہاں گوشے منور ہوگئے ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ باتوں کا کامیابی کے ساتھ احاطہ کر لیا گیا ہے۔

بخش بھائی کے لئے میں صرف ایک مصرع لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہوں گا۔

ع ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے

دُعا

اے خُدائے خشک و تر!
حادثوں کے وار سے
فکر کے جہاں کا
ہر لباسِ آگہی
خاک و خوں میں ڈھل گیا
پیکرانِ امن و خیر
ظُلم کے نصاب کی
سُولیوں پہ چڑھ گئے
زہروارِ عشق کی
یاد تازہ کر گئے
ناقدانِ نیک و بد
بے ضمیر ہیں یہاں
ظلمتوں کے راج میں
روشنی کا ہر چراغ
اک سراب بن گیا
نورِ علم و آگہی
ایک خواب بن گیا

◆ ◆ ◆

اے خدائے خشک و تر!
اے عہدِ نو جہاں!
جستجو کے دور میں
ہر رفتار بند ہے
ہر نظر خموش ہے
ہر بشر کی سوچ کی
کھیتیاں اُجڑ گئیں
پیاس کی زمین پر
آج تک ہر اک شجر
بے مراد و بے ثمر
زیست کی شاخیں
بے ثمر و بے اثر

◆ ◆ ◆

اے خُدائے خشک و تر!
چار سُو جہاں میں
نان و رزق و آب کا
قحط بے حساب ہے
بے کسانِ دہر کی
زندگی خراب ہے
تیرِ حرص و آز سے
رُوح داغدار ہے
بھوک کے عذاب سے
جسم و جاں کے قافلے
گردِ رہگزار ہیں
کاروبارِ زندگی
اِک دروغ ہے یہاں
وحشتِ خیال کو
اب فروغ ہے یہاں

◆ ◆ ◆

اے خدائے خشک و تر!
زہروانِ عقل و ہوش
شاہراہِ خبر کی
منزلوں سے دُور ہیں
عِلم کے امین بھی
جہل کے حصار میں

بند ہو کے رہ گئے
موسموں کی آگ سے
آشیاں بھی جل گئے
کونپلیں جھلس گئیں
گلشنِ حیات کی
لرزشِ مدام میں
نبضِ کائنات ہے
موت کی پناہ میں
عالمِ حیات ہے

◆ ◆ ◆

اے خدائے خشک و تر!
گلستاں میں سوگ ہے
طائرِ چمن پرست
اب قفس بدوش ہے
وَلوَلے بہار کے
ہیں خزاں کی گود میں
ہر زمینِ امن پر
عالمانِ جنگ کے
نعرۂ فساد سے
شہر کی سہاگنیں
پیار کے جہاد میں
بیوگی کے درد سے
ہجر کی صلیب پر
کروٹیں بدل بدل
بین کر کے سو گئیں

◆ ◆ ◆

اے خدائے خشک و تر!
ہر یتیم نونہال
بے مکان و بے زمیں
نفرتوں کے دشت میں
ہجرتوں کے خار سے
زخم زخم ہوگیا
سامراج و سامری
بد نہاد و بد خصال
تاجرانِ سیم و زر
کارگاہِ دہر میں
اہلِ امن و خیر پر
ایٹمی شرار کے
کر رہے ہیں تجربے
صبح کے مکان کی
خون پوش کھڑکیاں
اہلِ اقتدار کے
سایۂ مہیب سے
کانپتی ہیں رات دن

◆ ◆ ◆

اے خُدائے خشک و تر!
تیری بارگاہ میں
جُھک رہی ہے ہر نظر
سر بہ خم ہے اِک جہاں
سجدۂ خلوص میں
اُٹھ رہے ہیں اپنے ہاتھ
اب دُعا کے واسطے
اس گھٹن کے دور میں
رحمتوں کی اِک نظر
زندگی کے دشت پر
بھیج دے تو اس طرف
اِک ہوائے تازہ تر
اِک صدائے بُت شکن
اِک رسولِ خوش کلام
اِک مسیحِ معتبر
جو نوائے درد سے
گنبدِ سکوت کی
خامشی کو توڑ دے
اصلِ کائنات کا
معنیٔ حیات کا
بھید ہم پہ کھول دے

◆ ◆ ◆

اے خُدائے خشک و تر!
اے عدیلِ دو جہاں
رحمتوں کی اِک نظر
اہلِ عرضِ حال پر
اہلِ انتظار پر
اے خدائے خشک و تر!
اے خدائے خشک و تر!

◆ ◆ ◆

خدائے شہرِ صنعت بس یہی اجرِ عمل دے گا
سیاہی کارخانے کی ہر اک چہرے پہ مل دے گا

ہمیں اک چکرِ آسودگیٔ جسم و جاں دے کر
ہماری روح کو ظالم مشینوں میں کچل دے گا

مجھے تو آس تھی اُس شخص سے میعادِ تحکم کی
خبر کیا تھی مرے گھر کا وہ نقشہ ہی بدل دے گا

حصولِ رزق کا ہر ایک حیلہ چھین کر مجھ سے
فقط الفاظ کے پیکر میں بے کاری کا حل دے گا

اُنہیں یہ زُعم ہے اس کو وہ مٹی میں ملا دیں گے
ہمیں دعویٰ زمیں کا پیٹ چائی اُگل دے گا

صد افسوس اپنا جھونپڑا تک ہم لٹا آئے
شُبہ یہ تھا کہ وہ خانہ بدوشوں کو محل دے گا

مگر صیّاد مجھ پر مہرباں ہوگا تو کیا حاصل
زیادہ سے زیادہ میری زنجیریں بدل دے گا

تو اپنی کشتِ دل پر چاردیواری بنا، ورنہ
تری محنت کا ہر پودا ترے دشمن کو پھل دے گا

■▼■

دیوار و در میں روزنِ تصویرِ یاس ہے
اس پر بھی تو مجھے کسی دستک کی آس ہے

گاڑے ہیں میرے جسم میں ہر بوالہوس نے دانت
میرے لہو میں دوستو! کتنی مٹھاس ہے

لوح و قلم کتاب کیا، تن کا لباس بھی
ہر شے اُدھار کی مرے بچوں کے پاس ہے

اک وہ کہ شب کو صورتِ رنگِ سحر کریں
اِک ہم کہ جن کو رات پہ دن کا قیاس ہے

بھیگا ہوا لہو میں ہے لفظوں کا پیرہن
خونبارئ غزل مرے فن کی اساس ہے

ہر لحظہ مضطرب ہے تمہارے فراق میں
تم کیا گئے ہو گردشِ دوراں اداس ہے

کھولے وہ میری فال تباہی کے بُرج سے
کس درجہ پُرفریب ستارا شناس ہے

■▼■

مرا رشتہ

ہر اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کی سیاہی میری
نسلوں کا مقدر ہے
ہر اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کی بلندی
عرشِ اعظم سے بھی ارفع ہے
جوار بابِ تعیش کے ستم خانوں
سے نکلی ہے
یہ شب ہے یا جہنم ہے
قیامت ہے کہ فتنہ ہے
ہر اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کی طنابیں
میری آنکھوں کے دریچوں میں
گڑی ہیں روزِ اوّل سے
یہ وہ شب ہے جسے میری
معیشت کے خداوندانِ ظلمت نے
تظلم کے پہاڑوں سے
محبت کی زمینوں پر
ریاکارانہ حربوں سے
ہوس گیری کے تیشوں سے
تراشا ہے بنایا ہے
زمانے بھر کے مظلوموں
کی آنکھوں کے فریموں میں
سجایا ہے
یہ وہ شب ہے کہ جس کے آہنی
پنجوں میں دنیا بلبلاتی ہے
ہر اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کے تصور ہی سے
انسانوں کی روحیں کانپ جاتی ہیں
وہ شب جس کے در و دیوار پر
بے چہرہ لوگوں کے ہزاروں نقش کندہ ہیں
ہر اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کی صلیبوں پر
سحر کی لاش جلتی ہے
کہ جس کے تیرہ خانے میں
کئی سورج امیدوں کے
کئی کرنیں مقدر کی
کئی جگنو نگاہوں کے
مسخر ہیں مقید ہیں
ہر اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس کی کالی چوکھٹ پر
جھکی ہیں سجدہ ریزی میں
جبینیں بے ضمیروں کی
جہاں کوئی نہیں سنتا ہے فریادیں
اسیروں کی
ہر اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کے سمندر میں
اذانیں نوامیدی کی
مؤذن صبح خیزی کے
گلے میں پھانسیاں ڈالے
سسک کر ڈوب جاتے ہیں
ہر اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کی طوالت کی
گرانباری کئی صدیوں پہ بھاری ہے
فسوں جس کے توہم کا
کئی نسلوں پہ طاری ہے
ہر اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس کی کوکھ میں
دُرّہ زنوں کی فوج پلتی ہے
یہ وہ شب ہے کہ استقبال کو جس کے
کمربستہ کھڑا ہے ایک لشکر
شہریاروں کا
ہر اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کی سیاہی
میری نسلوں کا مقدر ہے

سر نہیں نوکِ سناں پر تن نہیں ہے دار پر
سرد مہری کا گماں ہے گرمیٔ بازار پر

تجھ کو کیا معلوم اے ظالم ہمارے خوں سے
کتنی شمعیں جل اُٹھی ہیں شہر کی دیوار پر

اک بنامِ دوستی ہے اک برائے دشمنی
ہاتھ دونوں ہیں ہمارے قبضۂ تلوار پر

کس قدر اچھلیں گے سر، یہ تجھ کو اندازہ نہیں
بات بس پڑتی ہے تو زد ہی نہیں دو چار پر

دشت کا ہر ایک ذرہ ہو گیا گلشن فروش
اس یقیں کے ساتھ ہم نے پاؤں رکھا خار پر

اک طرف دنیا کے دکھ ہیں اک طرف روزی کے غم
ہم کیا سوروں کریں زلف و لب و رخسار پر

دشمنوں کی دشمنی کا تو ہمیں کچھ غم نہیں
اشک آنکھوں میں بھر آئے دوستوں کے وار پر

برستے بادلوں کے رقص آسمان میں تھے
دہکتے پیاس کے کانٹے بھی ہر زبان میں تھے

تمام عمر جو بوتے رہے زمینوں کو
وہ کاشتکار ابھی قحطِ رزق و نان میں تھے

ترس رہا تھا جو خود ایک ایک قطرے کو
فرات و دجلہ بھی اُس شخص کی امان میں تھے

کئی برس کے مسلسل قیام کے بعد اب
کھلا یہ ہم پہ کہ آفت زدہ مکان میں تھے

تنی ہوئی تھیں کمندیں اگرچہ تا بفلک
جنہیں یقین پر و بال تھا، اُڑان میں تھے

محاذِ شعر پہ مجھ کو شکست کیا ہوتی
خیال و فکر کے لشکر مری کمان میں تھے

سمندروں پہ تو تھا اِک سکوت کا عالم
بلا کے حادثے کشتی و بادبان میں تھے

سرک رہے تھے ریا کے نقاب چہروں سے
کچھ ایسے رمز و کنائے مرے بیان میں تھے

غریب شہر کے بچوں کی آنکھ پُر نم تھی
وہ دل فریب کھلونے سجے دکان میں تھے

کس نظر میں خار پیوستہ نہیں
کون سا دل ہے جو خوں بستہ نہیں

مضطرب کیوں ہے مرا ذوق نمو
زندگی پھولوں کا گلدستہ نہیں

یوں تو منزل ہے نظر کے سامنے
موت سے خالی مگر رستہ نہیں

کون سے گھر میں نہیں ماتم بپا
کس گلی میں موت کا تختہ نہیں

میری آنکھوں میں سما کر دیکھئے
زندگانی رازِ سر بستہ نہیں

غیر تو ہیں غیر لیکن اب ہمیں
آشنا بھی آشنا لگتا نہیں

جس تعلق میں گماں شامل رہا
وہ تعلق پیار کا رشتہ نہیں

جان دے کر دل کا سودا کیجئے
عشق میں مہنگا نہیں سستا نہیں

کبھی تو اپنے کبھی میں پرائے بس میں رہا
مرا تمام سفر عالمِ ہوس میں رہا

بجھا سکیں نہ اُسے آندھیاں زمانے کی
وہ ایک شعلہ سا جو میرے خار و خس میں رہا

کبھی ملا نہ شرف اُن سے خوش کلامی کا
مرا ہر ایک نفس جن کی دسترس میں رہا

بہت بلند تھی آواز راہزن کی مگر
خضر کا شور فقط قالبِ جرس میں رہا

تمام عمر رہی کربلا تعاقب میں
تمام عمر میں اِک پنجۂ ہوس میں رہا

مقابلے کا جنوں سرد پڑ گیا لیکن
مزاحمت کا فسوں گرمیٔ نفس میں رہا

بڑے خلوص سے اپنا لیا ہے گھر کی طرح
میں تاحیات نظر بند جس قفس میں رہا

کربِ تخلیق

میرے حسنِ تخیل کے شکم میں جو ازل سے
بلبلانا چاہتا ہے
بظاہر یہ لہو کا ایک کم مایہ سا قطرہ ہے
جو میری کوکھ کے اس پالنے میں
سانس لینا چاہتا ہے
وہ جسم زخمِ مادر کی کٹھالی کے
جہاں آب و گل میں ہر نفس کی
حرارت سے پگھلنا چاہتا ہے
مثالِ قطرۂ سیماب اچھلنا چاہتا ہے
وہ موجودات کے اس عالمِ فانی
میں نمرود کے محلوں کی
ہر اک شہر مصر کے حصاروں کی جبینوں سے
گناہوں کی سیاہی کو مٹانا چاہتا ہے
سمائے محبت کے چراغوں سے
تصور کو نئی دنیا سجانا چاہتا ہے
جو ہر دیوانے کو تسلیمِ جبر موجوں کی
روانی میں بہانا چاہتا ہے
وہ جس میں گوتم و عیسیٰ کی روحیں
سانس لیتی ہیں
جوان روحوں کی خوشبو سے زمانے کی
پراگندہ ہواؤں کو بسانا چاہتا ہے

وہ اک معصوم بچہ جو فسادِ باہمی
میں امنِ پائیدار کی تخلیق کا
نقاشِ اوّل ہے پیمبر ہے مبلّغ ہے
جو سامانِ ہلاکت کی تباہی کا یقیں ہوگا
جو احساسِ تحفظ کا امیں ہوگا
میں اپنی ذات کے ہر کرب سے
گویا گزر کر
میں اس کے سانس میں لپٹی ہوئی
چیخوں سے اپنی گود بھرنا چاہتا ہوں
میں اس بچے کو موجودات کے
عالم میں جننا چاہتا ہوں
میں اس کا رنگ روپ اور نام لکھنا چاہتا ہوں
کہ یہ بچہ مری تخلیقِ حسنِ کار کے
پہلے پڑاؤ کی ضمانت ہے

دیوانہ لب کھولے گا
کانوں میں رس گھولے گا

لوک لہر جب اٹھے گی
راج سنگھاسن ڈولے گا

محفل میں جو ہنستا ہے
تنہائی میں رو لے گا

بادِ نوی کا ہر جھونکہ
ذہنوں کے پٹ کھولے گا

ظلم و ستم کا ہر تختہ
جسم ہمارا تولے گا

جس کو منزل پیاری ہے
ساتھ ہمارے ہولے گا

استحصالی سیل ہمیں
اپنے ساتھ ڈبو لے گا

گھر ہے نہ جس کا گھاٹ کہیں
وہ فٹ پاتھ پہ سولے گا

پریتم پیار کے نشتر سے
دل کے زخم ٹٹولے گا

ظلمت کے سناٹے میں
بولنے والا بولے گا

◆ ◆ ◆

یہود کی نذر

آوازوں کو قتل کروگے
ناممکن ہے ناممکن ہے
تیغِ ستم کی نوک پہ رقصاں
جسم و جاں کی فصل کروگے
ناممکن ہے ناممکن ہے
ہجرت پر مجبور ہمارا
کیا تم ذوقِ وصل کروگے
ناممکن ہے ناممکن ہے
ظلم و تشدّد کے حربوں سے
ختم ہماری نسل کروگے
ناممکن ہے ناممکن ہے
خون سے دامن تر ہے اپنا
دار پہ روشن سر ہے اپنا
قبلۂ اوّل بیتِ مقدس
روزِ ازل سے گھر ہے اپنا
ظلم و تشدّد کے حربوں سے
اس گھر سے بے دخل کروگے
ناممکن ہے ناممکن ہے
یہ مٹی ہمراز ہے اپنی
اس مٹی نے جنم دیا ہے
یہ مٹی دمساز ہے اپنی
عزمِ بغاوت دین ہے اپنا
فطرت بھی جانباز ہے اپنی
دارِ شکن ہیں اپنے جذبے
کوہ شکن پرواز ہے اپنی
پروازوں کو قتل کروگے
ناممکن ہے ناممکن ہے

اہلِ قفس کو مژدۂ تازہ ہوا ہی دے
اور کچھ نہیں تو زندگی کا حوصلہ ہی دے

دل میں جگر میں روح میں جنبش کہیں تو ہو
اس عالمِ سکوت میں کوئی صدا ہی دے

ہر برگِ زرد کو کبھی دل سے لگا کے پوچھ
شائد چمن کی داستاں تجھ کو سُنا ہی دے

کیا سوچتا ہے منظرِ خوں رنگ دیکھ کر
ہم دم نشانِ ظلم و ستم کو مٹا ہی دے

جس کی ہر ایک خشت میں لاکھوں شگاف ہیں
بہتر ہے اس مکاں کو تو اب گرا ہی دے

رہبر کھڑا ہے راہ میں جیسے کوئی پہاڑ
منزل تو خیر کیا یہ ہمیں راستا ہی دے

اے ناخدا تو شاعرِ شہرت پسند کی
اب کشتیٔ نمود کنارے لگا ہی دے

منصف ہر اک کھڑا ہے یہاں اہلِ زر کے ساتھ
مفلس کے حق میں کون اب اُٹھ کر گواہی دے

زبان دی ہے تو پھر جرأتِ سوال بھی دے
شمیمِ حرف کو رعنائی خیال بھی دے

عطا کیا ہے اگر منصبِ سخن مجھ کو
قلم کے ساتھ مجھے حرفِ لازوال بھی دے

وبالِ جاں ہے یہ آسودگی بھی منزل کی
سفر نصیب کو اندیشۂ ملال بھی دے

کوئی فرشتہ مدد کے لئے نہ آئے گا
تُو اپنے ذہن سے یہ واہمہ نکال بھی دے

مجھے جو دشمنِ قوم و وطن سمجھتا ہے
کسی کتاب سے اِس جرم کی مثال بھی دے

ترے فراق میں کتنی گزر گئیں صدیاں
مرے حبیب مجھے لمحۂ وصال بھی دے

پڑا ہے جس کو بھی رزقِ حرام کا چسکا
مرے خدا تُو اُسے لذّتِ حلال بھی دے

ترے حضور میں کس چیز کی کمی ہے دوست!
دیئے ہیں زخم تو زخموں کا اندمال بھی دے

گھرے ہیں بخش یہاں آہنی فصیلوں میں
ہمارے ہاتھ میں اِک تیشۂ کمال بھی دے

تم روشنی میں رات کے اسباب کی طرح
ہم تیرگی میں کرمکِ شب تاب کی طرح

شاخِ شجر سے دیکھ کے ٹوٹی ہوئی کلی
اندر سے میں پگھل گیا برفاب کی طرح

نکلے بھنور سے ڈوبنے والے تو یہ کھلا
ساحل ہے ان کے سامنے گرداب کی طرح

نورِ سحر کا دامنِ شب رنگ دیکھ کر
آنکھیں بھر آئیں ساغرِ خوناب کی طرح

بزمِ سخن میں دیکھ کے رنگِ سخن مرا
دشمن گلے سے مل گئے احباب کی طرح

پتے ہلے تو خوف سے چیخیں نکل گئیں
یہ زندگی ہے درد بھرے خواب کی طرح

چہروں کے خدّ و خال پہ رنگِ سکوت ہے
دل مضطرب ہیں قطرۂ سیماب کی طرح

دیکھا قریب سے تو سراپا نقاب تھا
چہرہ جو دور سے لگا مہتاب کی طرح

اُونچے پہاڑ آن میں جڑ سے اُکھڑ گئے
نکلے ہیں لوگ جب کبھی سیلاب کی طرح

دریا رواں جہاں سے ہیں فکرِ جدید کے
ٹھہرے ہوئے ہیں ہم وہیں تالاب کی طرح

◆ ◆ ◆

مشقت کا خزانہ مانگتا ہے
مری محنت زمانہ مانگتا ہے

ہر اک لمحہ دلِ آوارہ فطرت
مسافت کا بہانہ مانگتا ہے

مقدّر سے جسے مانگا تھا میں نے
اُسے مجھ سے زمانہ مانگتا ہے

عجب پاگل ہے میرے مَن کا پنچھی
قفس میں آشیانہ مانگتا ہے

حقیقت کا کوئی طالب نہیں ہے
جسے دیکھو فسانہ مانگتا ہے

اٹھا کر ہاتھ ہر بے گھر پرندہ
چمن میں آشیانہ مانگتا ہے

حرم میں مست ہر پیرِ طریقت
تراشِ آزرانہ مانگتا ہے

ہمارے شہر کا مردِ تنک سر
کلاہِ خسروانہ مانگتا ہے

مرا ہر اک منافق یار مجھ سے
خلوصِ دوستانہ مانگتا ہے

◆ ◆ ◆

کبھی رسن سے کبھی معرکہ تھادار کے ساتھ
کٹی ہے عمر ہماری بڑے قرار کے ساتھ

کسی یزید کے آگے نہ جھک سکی گردن
لیا جو سانس بھی ہم نے تو افتخار کے ساتھ

اب اہلِ شہر کو حاجت ہی کیا ہے شیشوں کی
ہر ایک آنکھ تو ذہد لا گئی نکھار کے ساتھ

وہ بدنصیب کسی دشتِ بے امان میں تھے
چلے تھے شوق سے جو بادِ نو بہار کے ساتھ

رگیں کٹیں تو چلا خوں روشنی کی طرح
ہمیں تو موت بھی آئی عجب وقار کے ساتھ

ہر ایک نوک اُگلتی زمیں ہماری ہے
ہمارے نام کو نسبت ہے ہر دیار کے ساتھ

حیات دہر کی رنگینیاں نہ پوچھ ہمیں
لہو لہو ہے بدن سنگ روزگار کے ساتھ

لکھا جو شعر بھی اُس نے تو خود ستائی کی
کیا ہے نام کسی پیدا تو اشتہار کے ساتھ

◆ ◆ ◆

مقتلِ شہر میں اِک شور سنائی دے گا
سر بکھرا کوئی سر دار دکھائی دے گا

ایک دن عدل کی زنجیر ہلے گی یارو!
وقت کا لمحہ ہمیں اذنِ رہائی دے گا

چہرۂ زیست سے سرکے گی جو شب کی چادر
ہم کو خورشیدِ جہاں تاب دکھائی دے گا

شور تا حشر بپا ہوگا ستم گر کے خلاف
ہم نہ ہوں گے تو کوئی اور دُہائی دے گا

ذہن میں اُبھریں گے گم گشتہ محبت کے نقوش
جب وہ ہاتھوں میں مرے دستِ حنائی دے گا

منصب و جاہ کی جس سے ہے تجھے بخشؔ اُمید
وہ ترے ہاتھ میں کشکول گدائی دے گا

◆ ◆ ◆

شبِ سیاہ میں روشن خیال میرا تھا
میں کچھ نہیں تھا مگر یہ کمال میرا تھا

مرے لہو کی چمک تھی نگار خانوں میں
تجوریوں کے جو اندر تھا مال میرا تھا

محاذِ فکر پہ کوئی بھی ڈٹ کے جم نہ سکا
عدو کے سامنے بس اک سوال میرا تھا

ہوا نے کاٹ دیا ہر بلند قامت کو
ہوا کے لہجے میں جاہ و جلال میرا تھا

جسے کریدا وہی کھل رہا تھا اندر سے
ہر ایک جسم میں عکسِ جمال میرا تھا

اُچک کے لے گئے سگ ہائے شہریار جسے
اُفاقِ جاں میں وہ رزقِ حلال میرا تھا

◆ ◆ ◆

منزلوں نے سوچا ہے فاصلوں نے دیکھا ہے
حشر کاروانوں کا راستوں نے دیکھا ہے

حق پرست دنیا میں روز سولی چڑھتے ہیں
فائلوں میں لکھا ہے منصفوں نے دیکھا ہے

ساری دنیا جانے ہے نقشہ گھر کے باہر کا
آنگنوں کا پس منظر روزنوں نے دیکھا ہے

ناخدا سے کیا پوچھیں ناخدا کو کیا معلوم
ڈوبتے سفینوں کو پانیوں نے دیکھا ہے

قاتلوں کے ہاتھوں کو پھانسیوں کے پھندوں کو
گردنوں نے ناپا ہے مقتلوں نے دیکھا ہے

بارشوں کی باتیں تو مصلحت کی باتیں ہیں
پیاس کی زمینوں کو بادلوں نے دیکھا ہے

بخش کون پڑھتا ہے تیری بھی تحریریں
جو قلم نے لکھا ہے کاغذوں نے دیکھا ہے

◆ ◆ ◆

رسن کا ذکر، بیانِ گلو نہیں ہوگا
سناں کی نوک پہ اپنا لہو نہیں ہوگا

چمن بدر تو کیا ہے کلی کلی کو مگر
چمن بدر کبھی ذوقِ نمو نہیں ہوگا

پئیں گے ہم بھی اسی دستِ ناز سے اب کے
شریکِ جشنِ طرب تو ہی تو نہیں ہوگا

فراز دار پہ چڑھ کر ذرا اذان تو دے
کوئی بھی شخص یہاں بے وضو نہیں ہوگا

ہمیں یقیں ہے شہادت کی رزم گاہوں میں
ہمارے بعد کوئی سُرخرو نہیں ہوگا

بہار آئے یہاں یا خزاں کا دور چلے
ہمارا چاکِ گریباں رفو نہیں ہوگا

کھلیں گے بانجھ زمینوں میں پیار کے گلشن
کہ رائیگاں کبھی دل کا لہو نہیں ہوگا

◆ ◆ ◆

بدن کی بھینٹ نہیں سر کا انتساب نہیں
دیارِ شوق میں خوں رنگ انقلاب نہیں

بصارتوں پہ وہ خوف و ہراس طاری ہے
کسی بھی آنکھ میں اب زندگی کے خواب نہیں

گزر رہی ہے جنوں میں کچھ اس طرح واعظ!
گنہ کا ذوق نہیں نیتِ ثواب نہیں

رگِ حیات پہ بے رحم وقت کا خنجر
لٹک رہا ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

بخیل اپنا شکم بھر کے یہ سمجھتا ہے
کہ سارے شہر میں اب بھوک کا عذاب نہیں

یہ مت سمجھ کہ وہ ماہر ہیں سازشوں کے فقط
منافقت میں بھی انکا کوئی جواب نہیں

جو ہر مکاں کو منور کرے اجالوں سے
افق کے طاق میں روشن وہ آفتاب نہیں

ہمارے شہر کی رسمیں عجیب رسمیں ہیں
کہ رہزنوں کا یہاں کوئی احتساب نہیں

ہر ایک پست کو تو نے سکندری دے دی
مرے جہان کے مالک ترا جواب نہیں

◆ ◆ ◆

جو بے کمال کو اوجِ کمال دیتے ہیں
وہ زندگی کو نئے خدّ و خال دیتے ہیں

وہ باکمال ہیں شاعر جو زندہ لفظوں سے
نوائے درد کو جاہ و جلال دیتے ہیں

وہ مدّ و جزر بپا ہیں ہماری آنکھوں میں
ہم اِک نظر سے سمندر اُچھال دیتے ہیں

مشاہداتِ ستم پر، ستم گرانِ جہاں
غلافِ چشم سے آنکھیں نکال دیتے ہیں

حرام رزق پہ جن کی حیات پلتی ہے
وہ اہلِ شہر کو درسِ حلال دیتے ہیں

عجیب لوگ ہیں وہ بھی کہ ہر شبک سر پر
فضیلتوں کی جو دستار ڈال دیتے ہیں

تم اِن حقیر سے ذرّوں کا احترام کرو
کہ چڑھتے سورجوں کو یہ زوال دیتے ہیں

سوال پیٹ کا ہم بخش جب اٹھاتے ہیں
شماریات کے فن سے وہ ٹال دیتے ہیں

❖ ❖ ❖

بے ثمر گلشن پہ گِھر گِھر کا سحاب آیا تو کیا
خانماں برباد کو جنت کا خواب آیا تو کیا

تیرگی نے ہر نظر سے روشنی ہی لوٹ لی
نور برساتا ہوا اب آفتاب آیا تو کیا

اہلِ حق ہر دور میں سُولی پہ لٹکائے گئے
ہم پہ ناکردہ گناہوں کا عتاب آیا تو کیا

وارثانِ برگ و بَر جب ہو گئے گلشن بدر
پھر گلوں پہ رنگ کلیوں پر شباب آیا تو کیا

عُمر بھر آیا نہیں انساں پرکھنے کا ہنر
اب پسِ مُردن شعورِ انتخاب آیا تو کیا

مَے نہیں مینا نہیں ساقی نہیں محفل نہیں
ایسے عالم میں اگر وقتِ شراب آیا تو کیا

جو خدا کی ذات سے منکر ہوئے اُن کے لئے
بے کتاب آیا تو کیا، اہلِ کتاب آیا تو کیا

درد و غم کی شدّتیں جب کام دل کا کر چکیں
بخش تجھ کو دل کے زخموں کا حساب آیا تو کیا

❖ ❖ ❖

وہ قتل تھا کہ نہیں، سانحہ عجب ہوگا
کوئی ضرور مری موت کا سبب ہوگا

شگاف پڑ گئے ہیں اب نظر کے روزن میں
خدا ہی جانے کہ کب اختتامِ شب ہوگا

زمینِ یاس پہ جب بھوک نوحہ خواں ہوگی
دیارِ حرص میں اک نغمۂ طرب ہوگا

ہے وقت کا یہ تقاضا کہ ہم کلام کریں
شعارِ خامشی اے ہمنوا غضب ہوگا

ہرے بھرے یہ سمندر دھواں دھواں ہوں گے
کنارِ دشت میں جب کوئی جاں بلب ہوگا

ہم آسمانِ ستم کا حساب رکھتے ہیں
ہمیں خبر ہے کہ سورج طلوع کب ہوگا

▼▲▼
▼

نگارِ فکر پہ رنگِ شباب آئے گا
دل و نگاہ میں اِک انقلاب آئے گا

کبھی نہ چھونے دیا ایک پھول تک جس نے
وہ میری قبر پہ لے کر گلاب آئے گا

ابھی تو سوئے ہوئے ہیں کھلے گی آنکھ تو پھر
ہر ایک زخمِ جگر کا حساب آئے گا

جو انتظارِ سحر میں اُجڑ گئی ہیں دوست
اب اُن نگاہوں میں کب کوئی خواب آئے گا

ہر ایک در پہ یونہی دستکیں دئے جانا
کسی تو گھر سے بھلا سا جواب آئے گا

یہ ننھے ننھے سے پودے بھی گلفشاں ہوں گے
بلند قامتوں پر جب عذاب آئے گا

▼▲▼
▼

جہانِ جبّہ و دستار کی حمایت کیا
یزیدِ وقت ہے کیا اور اس کی بیعت کیا
منافقانہ روش عام ہوتی جاتی ہے
نقاب پوشیٔ احباب کی شکایت کیا
کسی بھی شخص کو اب حرفِ حق کا پاس نہیں
پنپ رہا ہے یہاں پر دروغِ حکمت کیا
مجاورانِ جہالت کے بالا خانوں میں
سخن طرازیٔ علم و ادب کی قیمت کیا
مزہ تو جب ہے کہ رنگِ سخن ہو وجہِ نمود
جو اشتہار کی محتاج ہو وہ شہرت کیا
مرے رفیق فروغِ جنوں کے عالم میں
ہے چاک چاک گریباں تو اس پہ حیرت کیا
جو مل رہا ہے تمہیں غیر کی عنایت سے
بھی ہے سانس تو اس سانس کی ہے قیمت کیا
زباں بھی ایک زمیں بھی ہے ایک رنگ بھی ایک
تو پھر میانِ مَن و تو یہ اجنبیت کیا
جھپٹ رہے ہیں سبھی سیم و زر کے لقموں پر
ہوس گری ہے فقط منصبِ وزارت کیا
سیاہ داغ ہیں یہ روشنی کے چہرے پر
مریدِ جہل ہے کیا پیشۂ طریقت کیا
ازل سے بخشؔ رہِ پرخطر سے گزرے ہیں
جفا شناسیٔ احباب کی شکایت کیا

◆ ◆ ◆

نگہِ گل چیں شکار مانگتی ہے
شاخِ گل پر نکھار مانگتی ہے
کوہ کن کی متاعِ تیشہ پر
خسروی اختیار مانگتی ہے
وہ جو طوقِ ستم سے خائف تھی
اب وہ گردن بھی دار مانگتی ہے
عالمِ انتشار میں ایدوست!
نبضِ ہستی قرار مانگتی ہے
جیب خالی ہے کیا زلیخا کی
مجھ سا یوسف ادھار مانگتی ہے
دوستی کو مذاق مت سمجھو
دوستی اعتبار مانگتی ہے
پتا پتا خزاں رسیدہ ہے
ڈالی ڈالی بہار مانگتی ہے
دن کو قاتل پھریں تعاقب میں
رات فتنے ہزار مانگتی ہے
ہجرتوں سے لہو لہو خلقت
خوبصورت دیار مانگتی ہے
کشتِ جاں کو لہو پلاتے رہو
فصلِ گل انتظار مانگتی ہے
زندگی جبر کے حصاروں سے
بخشؔ راہِ فرار مانگتی ہے

◆ ◆ ◆

پڑے ہیں راہ میں جو لوگ بے سبب کب سے
پکارتی ہے انہیں منزلِ طلب کب سے

یہ اور بات کسی کو کچھ خبر نہ ہوئی
لگا رہے تھے محافظ مگر نقب کب سے

کوئی بھی حربۂ تشہیر کارگر نہ ہوا
تلاش میں ہی رہی شہرتِ ادب کب سے

وہ ہم نے پھول دیئے تنقید کی صلیبوں پر
مچل رہے تھے جو کچھ حرف زیرِ لب کب سے

اُکھڑ گئی ہیں طنابیں ستم کے خیموں کی
اُلٹ گئی ہے بساطِ حسب نسب کب سے

نہ حوصلہ ہے دعا کا نہ آہ پر ہے یقیں
کہ ہم سے روٹھ گیا ہے ہمارا رب کب سے

بجھے ہیں دیپ جلاؤ سیاہ رات کٹے
سجی ہوئی ہے یہاں محفلِ طرب کب سے

ہر ایک مرحلۂ جاں منزلِ سراب ہوئی
اَٹی ہے دھول سے چہروں کی تاب و تب کب سے

سمندروں سے کوئی موج سر بلند اُٹھے
کہ ساحلوں پہ تڑپتے ہیں جاں بلب کب سے

فقط تمہی نہیں بدلے، تمہارے لہجے نے
بدل دیئے ہیں مری زندگی کے ڈھب کب سے

❖ ❖ ❖

برستے بادلوں کے رقص آسمان میں تھے
دہکتے پیاس کے کانٹے بھی ہر زبان میں تھے

تمام عمر جو بوتے رہے زمینوں کو
وہ کاشتکار ابھی قحطِ رزق و نان میں تھے

ترس رہا تھا جو خود ایک ایک قطرے کو
فرات و دجلہ بھی اُس شخص کی امان میں تھے

کئی برس کے مسلسل قیام کے بعد اب
کھلا یہ ہم پہ کہ آفت زدہ مکان میں تھے

تنی ہوئی تھیں کمندیں اگرچہ تا بفلک
جنہیں یقینِ پر و بال تھا، اُڑان میں تھے

محاذِ شعر پہ مجھ کو شکست کیا ہوتی
خیال و فکر کے لشکر مری کمان میں تھے

سمندروں پہ تو تھا اِک سکوت کا عالم
بلا کے حادثے کشتی و بادبان میں تھے

سرک رہے تھے ریا کے نقاب چہروں سے
کچھ ایسے رمز و کنائے مرے بیان میں تھے

غریب شہر کے بچوں کی آنکھ پُر نم تھی
وہ دل فریب کھلونے سجے دکان میں تھے

❖ ❖ ❖

کڑی رُتوں میں کوئی سائبان دے نہ سکے
ستم کی دار پہ مومن اذان دے نہ سکے

ہر ایک منظرِ خوں رنگ تھا نگاہوں میں
زباں کھلی تھی مگر ہم بیان دے نہ سکے

قدم قدم پہ تھی درپیش کربلا لیکن
ہم اہلِ حق کی طرح امتحان دے نہ سکے

جو دے رہے تھے سبق ہم کو سر فروشی کا
سرِ صلیب تو وہ اپنی جان دے نہ سکے

خدا کے نام پہ بے گھر تو کردیا لیکن
خدا کے واسطے مجھ کو مکان دے نہ سکے

بڑا ہی ناز تھا معجز بیانیوں پہ جنہیں
وہ حرف و صوت کو اپنی زبان دے نہ سکے

ثباتِ زندگی جن پر تھا شب گزیدوں کا
وہی ستارے سحر کا نشان دے نہ سکے

میں کس زباں سے کروں بخش منصفوں کا گلہ
مرے رفیق بھی کوئی بیان دے نہ سکے

وہ لوگ جن سے کہ یارانے عمر بھر کے تھے
یہ اب کھلا وہی دشمن ہمارے سر کے تھے

تفنگ و تیر بدیسی تھے پر تفنگ انداز
نظر اُٹھا کے جو دیکھا سب اپنے گھر کے تھے

کھلا فریب تھی تقسیم رزق و دولت کی
یہ شرمناک رویّے بھی اہلِ زر کے تھے

پلس[1] کچھ نہ کہے، واردات کہتی ہے
کہ رہزنی کے سب انداز راہبر کے تھے

ہر ایک منزلِ جاں بھی پرائی منزل تھی
جو ہم رکاب تھے، ساتھی اِدھر اُدھر کے تھے

اُڑے جو ہم تو قفس کو بھی ساتھ لے کے اُڑے
یہ معجزے بھی ہمارے ہی بال و پر کے تھے

ہر اک گزر گہہ ایّام مجھ سے روشن تھی
فلک شناس ستارے مری نظر کے تھے

[1] Police

رت نہ بدلے تو بھی افسردہ شجر لگتا ہے
اور موسم کے تغیر سے بھی ڈر لگتا ہے

دربدر ہجرت کے ستائے ہوئے لوگوں کو کہیں
سایۂ در بھی نظر آئے تو گھر لگتا ہے

ایک ساحل ہی تھا گرداب شناسا پہلے
اب تو ہر دل کے سفینے میں بھنور لگتا ہے

بزم شاہی میں وہی لوگ سرافراز ہوئے
جن کے کندھوں پہ ہمیں موم کا سر لگتا ہے

کھا لیا ہے تو اے دوست اگلتے کیوں ہو
ایسے پیڑوں پہ ایسا ہی ثمر لگتا ہے

...یت کا وہ عالم ہے کہ ہر آن یہاں
اپنا گھر بھی ہمیں اغیار کا گھر لگتا ہے

شب کی سازش نے اجالوں کا گلا گھونٹ دیا
ظلمت آ... اب نور سحر لگتا ہے

مرحلۂ سخت سے ہم یوں تو نکل آئے ہیں
اور جو باقی ہے قیامت کا سفر لگتا ہے

گھر بھی ویرانہ لگے تازہ ہواؤں کے بغیر
بو خوش رنگ چلے دشت بھی گھر لگتا ہے

◆ ◆ ◆

کبھی آنکھوں پہ کبھی سر پہ بٹھائے رکھنا
زندگی تلخ سہی، دل سے لگائے رکھنا

لفظ تو لفظ ہیں کاغذ سے بھی خوشبو پھوٹے
صفحۂ وقت پہ وہ پھول کھلائے رکھنا

چاند کیا چیز ہے سورج بھی اُبھر آئے گا
ظلمتِ شب میں لہو دل کا جلائے رکھنا

حرمتِ حرف پہ الزام نہ آنے پائے
سخنِ حق کو سرِدار سجائے رکھنا

فرش تو فرش فلک پر بھی سنائی دے گا
میری آواز میں آواز ملائے رکھنا

کبھی وہ یاد بھی آئے تو ملامت کرنا
کبھی اس شوخ کی تصویر بنائے رکھنا

بخش سیکھا ہے شہیدانِ وفا سے ہم نے
ہاتھ کٹ جائیں علم منہ سے اٹھائے رکھنا

◆ ◆ ◆

مرے ہر لفظ کی توقیر رہنے کے لئے ہے
میں زندہ ہوں مری تحریر رہنے کے لئے ہے

ستم گر نے جو پہنائی مرے دستِ طلب میں
یہ مت سمجھو کہ وہ زنجیر رہنے کے لئے ہے

مرا آئینۂ تصنیف دیتا ہے گواہی
مرا ہر نقطۂ تفسیر رہنے کے لئے ہے

رہے گا تُو نہ تیرا ظلم، پر روزِ ابد تک
ہمارے درد کی جاگیر رہنے کے لئے ہے

جسے میری نگاہوں نے کبھی دیکھا نہیں ہے
مرے دل میں وہی تصویر رہنے کے لئے ہے

سرِ باطل کیا دولخت جس نے بھی جہاں میں
سلامت بس وہی شمشیر رہنے کے لئے ہے

جنونِ شوقِ تخریبِ جہاں مٹ کر رہے گا
مگر ہر جذبۂ تعمیر رہنے کے لئے ہے

نہ لکھا شعر کوئی اور سمجھ بیٹھے ہیں ناداں
ادب میں حربۂ تشہیر رہنے کے لئے ہے

گزر جائیں گے ہم دارِ فنا سے بخش لیکن
ہمارے شعر کی تاثیر رہنے کے لئے ہے

حرفِ حق کی مُہر لازم ہے زبانوں کے لئے
خاک و خوں اکسیر ہے زندہ فسانوں کے لئے

صنعتِ فرعون کو تازہ لہو مل جائے گا
مائیں بچے جن رہی ہیں کارخانوں کے لئے

وہ پرندے مر گئے قیدِ قفس میں دوستو!
منتظر تھے آسماں جن کی اُڑانوں کے لئے

اُس عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہیں ہم جہاں
نطقِ گویائی ترستا ہے بیانوں کے لئے

کار فرما جس پہ ہو جاگیر دارانہ نظام
وہ زمیں فاقے اُگلتی ہے کسانوں کے لئے

شب گزیدہ سُورجوں سے روشنی ملتی نہیں
ڈھونڈیئے جگنو کوئی اپنے مکانوں کے لئے

سنگِ در میں سجدہ ریزی کی کشش پیدا کریں
سر ہمارا چاہیئے جن آستانوں کے لئے

بخش ہم روزِ ازل سے گوش بر آواز ہیں
شہرِ بے توفیق میں حق کی اذانوں کے لئے

xxxxxxxxxxxxxx

زخم دل پر کبھی مرہم بھی شفا کا رکھنا
چارہ گر ہو تو بھرم اپنی دوا کا رکھنا

ہم نے داغوں کو سر بام جلا رکھا ہے
اپنی فطرت میں نہیں خوف ہوا کا رکھنا

باغباں کا یہ تقاضا ہے کہ اب گلشن میں
باد صرصر بھی چلے، نام صبا کا رکھا

یہ عجب بات کہ ساعت ہو قبولیت کی
حوصلہ دل میں مگر ترکِ دُعا کا رکھنا

سرد موسم میں کہیں سانس نہ جمنے پائے
جسم کے خول میں اک شعلہ صدا کا رکھنا

آگہی کا ہو فسوں یا کہ جنوں کا عالم
ہم نے سیکھا ہی نہیں چاک قبا کا رکھنا

واسطہ لاکھ پڑے راہزنوں سے لیکن
بخش تم دھیان ذرا راہ نما کا رکھنا

◆ ◆ ◆

بظاہر شان و شوکت سے کھڑے ہیں
سب اندر سے مگر ٹوٹے پڑے ہیں

مسلسل بارشِ سنگِ گراں میں
یہ شیشے کے مکاں اب تک کھڑے ہیں

ہمارے شہر کی ہر اک گلی میں
ہزاروں بے کفن لاشے پڑے ہیں

زمیں کی سر بلندی کے لئے ہم
ازل سے آسمانوں سے لڑے ہیں

یہ تم بے رحمیٔ حالات دیکھو
کہیں دھڑ ہے کہیں پر سر پڑے ہیں

عمل پیرا کسی پر بھی نہیں ہم
ہمارے پاس منصوبے بڑے ہیں

میں اُن ہاتھوں کو بھی پہچانتا ہوں
کہ جن ہاتھوں پہ دستانے چڑھے ہیں

اُٹھائیں کس طرح بارِ تبسم
گلوں کے جسم کانٹوں میں جڑے ہیں

اندھیرے میں اُجالے کا نشاں ہیں
یہ جگنو آفتابوں سے بڑے ہیں

◆ ◆ ◆

کھا کر ستم کی ٹھوکریں بیدار تو ہوئے
ہم انقلابی لہر سے دوچار تو ہوئے

مشقِ فُغاں سے کٹ گئی زنجیرِ بے حسی
حرف و سخن کے ولولے تلوار تو ہوئے

گھر میں نہ جل سکے جو حوادث کے خوف سے
روشن وہی دیئے سرِ دیوار تو ہوئے

یہ بھی ہے ایک معجزہ حبسِ دوام کا
تازہ ہوا کے لوگ طلبگار تو ہوئے

مانا حصارِ شب ابھی ٹوٹا نہیں تمام
لیکن نمودِ صبح کے آثار تو ہوئے

دُرّہ زنی کی مشق سے لرزاں تھے جو کبھی
دُرّہ زنوں سے بر سرِ پیکار تو ہوئے

تاریخ کو نہ کر سکے ہم لالہ گوں تو کیا
رنگیں ہمارے خون سے بازار تو ہوئے

واقف نہ تھے جو لذتِ حسنِ کلام سے
وہ لب شہیدِ گرمیٔ گفتار تو ہوئے

جن کو بڑا ہی ناز تھا قدآوری پہ بخش
اب سرنگوں وہ طرّہ و دستار تو ہوئے

◆ ◆ ◆

کلی میں رنگِ نمو شاخ پر لباس رہے
خزاں کے قہر میں بھی زندگی کا پاس رہے

ہمیں ہر آن بچھڑنے کا احتمال رہا
تمہارے قرب میں جب تک رہے اُداس رہے

میں اُن کی اور وہ میری پکار سُن نہ سکے
اگرچہ کوئے ستم میں ہم آس پاس رہے

نیا زمانہ ہے کوئی تو تازہ بات لکھو
فقیہِ شہر جو رہتا ہے بد حواس رہے

تمہیں بتاؤ کہاں پر وہ زہر نوش کرے
تمہارے جسم کی خوشبو جسے نہ راس رہے

کوئی گزند نہ پہنچے کسی نشیمن کو
چمن پرست نظر میں چمن کی پیاس رہے

لبِ فرات پہ قابض رہیں ہزار یزید
ہماری تشنگی اے دوست حق شناس رہے

◆ ◆ ◆

حریمِ جسم میں تیغِ ستم گڑی ہے ابھی
سیاہ ظلم مرے سامنے کھڑی ہے ابھی

کہاں پہ مر گئے غسال عصرِ حاضر کے
ہر ایک لاش یہاں بے کفن پڑی ہے ابھی

رہا نہ حق ہمیں جس گھر میں اب سکونت کا
ہمارے نام کی تختی وہاں جڑی ہے ابھی

نظر میں دھول، زباں بند، فکر پہ قدغن
گلے میں طوق تو ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے ابھی

دیارِ شام میں جو اہلِ حق پہ گزری تھی
دل و نظر میں وہی حشر کی گھڑی ہے ابھی

کسی کی طفل تسلی قرار دے نہ سکی
ہر ایک آنکھ میں ساون کی اک جھڑی ہے ابھی

یہ مت سمجھ کہ سیاہی کا قلعہ ٹوٹ گیا
سحر کے سامنے دیوارِ شب کھڑی ہے ابھی

سجاؤ بخش سبیلیں ہوائے تازہ کی
فضائے شہرِ وفا میں گھٹن بڑی ہے ابھی

◆ ◆ ◆

ظلم سہتے ہیں دہائی نہیں دیتا کوئی
گرمیِ تیغ نوائی نہیں دیتا کوئی

مقتلِ شہر میں اب قہر کا سناٹا ہے
جسم سولی پہ دکھائی نہیں دیتا کوئی

جو بھی آیا نئے محبس ہی سجانے آیا
قیدِ پیہم سے رہائی نہیں دیتا کوئی

دوستو! ہر کڑی منزل سے گزرنا ہوگا
گھر میں بیٹھے تو خدائی نہیں دیتا کوئی

یوں تو ہر ایک شبستاں میں دیے روشن ہیں
روشنی میں بھی دکھائی نہیں دیتا کوئی

دوست ہوتا ہی نہیں چھوڑ کے جانے والا
دوست بن کر تو جدائی نہیں دیتا کوئی

کس کی آغوشِ محبت میں پناہیں ڈھونڈیں
دورِ ظلمت میں دکھائی نہیں دیتا کوئی

خود ہی مجبورِ طلب ہوتا ہے انساں، ورنہ
بخش کشکولِ گدائی نہیں دیتا کوئی

◆ ◆ ◆

ہر اک رگِ حیات پہ قاتل کا ہاتھ ہے
یہ سانحہ بھی زندگی کے ساتھ ساتھ ہے

کندھوں پہ دن کا بوجھ ہے جیسے کوئی پہاڑ
جو سر پہ جھومتی ہے قیامت کی رات ہے

روشن رہے گا کرمکِ شب تاب کی طرح
لوحِ ورق پہ جو مرا حرفِ ثبات ہے

کب تک رکیں گے شاخ پہ پھولوں کے قافلے
موجِ خزاں کے ایک تھپیڑے کی بات ہے

انساں کے دَم سے رقص ہے بزمِ حیات میں
محشر بپا جہان میں انساں کی ذات ہے

یخ بستہ سانس موم کی صورت پگھل گئے
کس کی نظر کی دھوپ کا یہ التفات ہے

ہے کربلا کا منظرِ خوں رنگ ہر طرف
تشنہ لبوں پہ بندشِ آبِ فرات ہے

تجھ کو ملا ہے منصبِ جلاد، مجھ کو دار
ایدوست! اپنے اپنے مقدّر کی بات ہے

◆ ◆ ◆

رہرو کھڑے ہیں قافلہ سالار سے پرے
گرنے لگے ہیں سائے بھی دیوار سے پرے

آئینۂ ضمیر پہ سکوں کی دُھند ہے
ہے شوخیٔ کلام بھی معیار سے پرے

ہر پستیٔ گناہ میں دستار ہے پڑی
اور سر بھی ہیں پڑے ہوئے دستار سے پرے

جو ظلمتِ جہان کی شہ رگ کو کاٹ دے
وہ روشنی ہے سرحدِ افکار سے پرے

اک ناخدا ہی پنجۂ گرداب میں نہیں
ٹوٹی پڑی ہیں کشتیاں منجدھار سے پرے

سانسیں اکھڑ رہی ہیں قفس کے حصار میں
تازہ ہوا ہے روزنِ دیوار سے پرے

بکتے ہیں ہر دکان پہ بوم و کلاغ و زاغ
یوسف پڑے ہیں حسن کے بازار سے پرے

کچھ اور بھی ہیں سانحے حدِّ نظر سے دور
کچھ اور بھی ہیں سُرخیاں اخبار سے پرے

◆ ◆ ◆

رسن کا ذکر چلا دار کا سوال ہوا
ستم کے باب میں ہر معرکہ کمال ہوا

تمام اہلِ قلم سے قلم کشائی کی
لکھا جو ہم نے وہی حرفِ لازوال ہوا

مزاجِ گردشِ دوراں بدل سکا نہ کبھی
نہ جانے کتنا لہو صرفِ ماہ و سال ہوا

زباں جس کی کھلی تھی ستم گروں کے خلاف
ادائے فرض میں وہ شخص بے مثال ہوا

میں کچھ نہیں ہوں مگر یہ بھی اک حقیقت ہے
مری نگاہ سے محکم ترا جمال ہوا

ہمارے گھر میں ہوا کے ہر ایک جھونکے پر
کسی کے آہنی قدموں کا احتمال ہوا

تمہارے ہجر میں ایسی بھی ساعتیں آئیں
تھما جو دردِ جگر، دردِ دل بحال ہوا

xxxxxxxxxxxx

کسی مقام پہ بھی خضرِ دل رکا ہی نہیں
پڑاؤ جیسے کوئی راستے میں تھا ہی نہیں

بھٹک رہا ہے ہر اک راہ گیر رستے میں
کسی بھی طاق پہ روشن کوئی دیا ہی نہیں

چمن چمن جسے گل چیں تلاش کرتا ہے
ابھی وہ غنچہ کسی شاخ پر کھلا ہی نہیں

قدم قدم پہ ہمیں یہ سراغ ملتا ہے
فریبِ راہ نما سے کوئی بچا ہی نہیں

دکاں بھی ہے طبیبانِ دینِ فطرت کی
مگر کسی کے مرض کی کوئی دوا ہی نہیں

وطن بھی ایک، تمدن بھی ایک، رنگ بھی ایک
وہ اِس ادا سے ملا ہے کہ جانتا ہی نہیں

دلِ غریب نے جب آسماں پہ دستک دی
صدا یہ لوٹ کے آئی وہاں خدا ہی نہیں

xxxxxxxxxx

ریموٹ کنٹرول

یہ کس کی جنبشِ ابرو کے اک
ادنیٰ اشارے پر
سگانِ شہریاری صورتِ روبوٹ
محورِ رقص ہوتے ہیں
ہے افسونِ نظر کس کا جو انکے
ذہنِ باطل کی ہر اک پھرکی گھماتا ہے
ہر اک پرزہ ہلاتا ہے
مسلط کون ہے اِن زنگ آلودہ
مشیرانِ جہالت کے ضمیروں پر
جو علم و آگہی کے نام پر
ہر اک دوکانِ جہالت کو سجاتے ہیں
ہے کس کے قبضۂ قدرت میں ایسا
مرکز و محور
جہاں خودکار تخریب و جفاکاری
کی شیطانی مشینیں سانس لیتی ہیں
وہ طاقت کونسی ہے دوست!
جس کے پاس ہیں سب اختیاراتِ خداوندی
زمینوں، کے زمانوں کے
فلک کے اور فضاؤں کے
جو ہر مفلوک و پسماندہ ریاست کے
ہوس پیشہ اماموں کی ذہانت پر
خود اپنی مصلحت بینی کی مہریں
ثبت کرتا ہے
جو اپنی قوتِ زر کے فسوں کارانہ حربوں سے
طلبگارانِ مسند کے، پرستارانِ مذہب کے
ہوس خوردہ دماغوں میں عوامی
دشمنی کا سمِ قاتل گھول دیتا ہے
جو اِن مکروہ چہروں پر
ہوا و حرص کی اندھی نقابیں
ڈال دیتا ہے جو انکے دست و بازو پر
بلا خوف و خطر اپنی اطاعت کی
کمندیں ڈال دیتا ہے
وہ خفیہ ہاتھ کس کے ہیں کہ جن کے
آہنی پنجوں میں اپنے عہد کے ہر
کج کلاہِ کرم خوردہ کی
کلیدِ حکمرانی ہے
ہمیں یہ سوچنا ہوگا
تمہیں بھی سوچنا ہوگا

xxxxxxxx

ابھی موسم نہیں بدلا

ہمارے گھر کے ہر اک بام و در میں
دندناتی پھر رہی ہے فوج چوہوں کی
یہ چوہے جو وڈیرہ شاہی مکتب کے
اماموں کی غلامانہ سیاست کے
ریاکارانہ حربوں میں یگانہ
اور یکتا ہیں
کہ جن کی گردنوں میں تمغۂ لعنت
لٹکتا ہے بدیسی حکمرانوں کی
اطاعت کا
کہ یہ تمغہ فقط جاگیردارانہ وراثت کا
عطیہ ہے جو نسلاً منتقل ہوتا رہا
ان کو فرنگی بادشاہوں کے
وظیفہ خوار آبا سے
بدیسی حکمراں اکثر انہیں
حقِ عبودیت پہ جاگیروں کے
ٹکڑے پھینک دیتے تھے
یہ جاگیروں کے ہیبت ناک چوہے
جو پلے پوسے ہمارے خرمنِ ہستی
کے دانوں پر
کہ جن کے جسمِ فربہ کی غلاظت سے
تنفس کی طنابیں ٹوٹ جاتی ہیں

جنہوں نے چھید کر ڈالے
ہمارے کعبۂ دل کی فصیلوں میں
کہیں مکروہ دانتوں سے
کہیں منحوس پنجوں سے
شگاف اتنے بڑے ہیں
اب یہ دیواریں پلستر سے بھی عاری ہیں
ہر اک کمرے میں جل تھل ہے
ہر اک کمرہ ٹپکتا ہے
ہر اک حجرے میں کربل ہے
ہر اک حجرہ سلگتا ہے
یہ برساتوں کی وحشت ناک راتیں
اب ہمارے شہر کے خانہ خرابوں پر
قیامت سے بھی بھاری ہیں
ہماری قوم کے مظلوم بچے
اور مرد و زن جواں بوڑھے
دعائیں مانگتے ہیں رات دن
موسم بدلنے کی
ستم کے شہر میں معصوم سی
انکی تمنائیں تڑپتی ہیں ترستی ہیں
کبھی دامن کی چھاؤں کو
کبھی تازہ ہواؤں کو
مگر یہ حبس کا عالم کسی گھر سے
نہیں جاتا

کسی عفریت کا سایا کسی در سے
نہیں جاتا
مصائب کی طوالت ہے کہ کم ہونے
نہیں پاتی
کلاشنکوف کی آواز بھی مدھم
کبھی ہونے نہیں پاتی
کہ اس عالم میں اب خلقِ خدا بھی
رات بھر سونے نہیں پاتی
ہر اک کھڑکی ہر اک روزن
بھڑک اٹھا تعصب خیز شعلوں سے
یہ گھر ہے یا کہ گورستان ہے
اجڑے مقابر کا
کہ جس کے باسیوں پہ اب گماں ہے
ایسے مُردوں کا
جنہیں زندہ ہی دفنایا گیا ہے
نکل کر ہم حصارِ ان مقابر سے
کہاں جائیں
کہاں دستِ کرم ڈھونڈیں
کہاں رنگِ وفا پائیں

کہ سارے شہر میں اب مہرباں
کوچہ نہیں کوئی
جہاں بوئے محبت نفرتوں کو
کاٹ دیتی ہے
عجب ماحول ہے جس میں
ہر اک بونا قدو قامت میں بالا ہے
یہ کیسا المیہ ہے شہر کے پستہ قدوں نے
اب ہمارے عہد کے قد آوروں کو
روندڈالا ہے
نظامِ بربرّیت کے ہوس خوردہ
نقیبوں نے نہالانِ محبت کو
جڑوں سے کاٹ ڈالا ہے
کسی گل کی مہک کا اب نہیں
ملتا نشاں کوئی
کہیں سے ڈھونڈ لائے
نسخۂ ردِ خزاں کوئی
ہر اک طاقِ نظر میں
بس اندھیرا ہی اندھیرا ہے
ہر اک شاخِ تمنا پر
سپیروں کا بسیرا ہے
یہ کیسا مجلسِ آئین سازی کا ادارہ ہے
کہ جس کی مسندِ حق پر منافق
جلوہ آرا ہیں
جہاں دستور کے چہرے پہ دھبے ہیں
گناہوں کی سیاہی کے
جہاں دوشیزۂ جمہوریت ہمدم
کسی بیوہ کی صورت عالمِ بے چارگی

میں مجمعِ اہلِ ہوس میں
رقص کرتی ہے، گریباں چاک پھرتی ہے
مگر ہر اک حلف بردار آئینِ مقدس
کے لبوں پر ایک شیطانی تبسم ہے
ہمیں اے دوست آزادی کے اندھے
غار میں رستہ نہیں ملتا
کہاں پر سر چھپائیں
اور کہاں جائے اماں ڈھونڈیں
محلّے بھر میں جشنِ قتل و غارت کے
دمامے ہیں
نئی جمہوریت کے گورکن لاشیں اٹھا کر
تھک گئے شاید
سکوتِ شب کا پہرا چھا گیا
گونگے مکانوں پر
گماں ہوتا ہے خطرے کا
مؤذّن کی اذانوں پر
مسلسل گولیوں کی سنسناہٹ رک گئی شاید
مگر شاید یہ ٹھہراؤ بھی کوئی
پیش خیمہ ہے حوادث کا
قبائے جبہ و دستار کے
منحوس سائے میں
شبستانِ ملامت کے مکیں ہیں
منہمک اک سازشِ نو میں

تم اب اس کرفیو کے مختصر
وقفے میں اے ہمدم!
کسی نادیدہ خوش فہمی میں مت رہنا
مشیرانِ تشدد کا فسوں اب تک
نہیں ٹوٹا
ابھی فکر و نظر کا زاویہ
ہرگز نہیں بدلا
ہوائے وقتِ ناہنجار کا
سرگم نہیں بدلا
دعائیں مانگتے رہنا
ابھی موسم نہیں بدلا

xxxxxxxxx

ضمیر کا رزمیہ — بخش لائلپوری کی شاعری

پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید

جس عہد میں ہم سانس لے رہے ہیں وہ شعور کشی کا عہد ہے۔ میری اس رائے سے اہل دانش کا اختلاف امر لازم ہے کہ ہم معلومات کے عظیم طوفان میں گھرے ہوئے ہیں۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلیویژن اور کمپیوٹر کی کائنات نے ہمیں ذہنی طور پر مسحور کر رکھا ہے۔ سی ڈی ٹیلیاویژن اور متعدد قسم کے نیٹ ورکوں نے ہماری سوچوں اور خیالوں پر وہ شب خون مارا ہے کہ خدا کی پناہ! معلومات کے ذخیرے اور خیالات کے پھیلاؤ کی رواتوں میں ہمیں بہائے لئے جا رہے ہیں کہ ہم بلا ضرورت جوابوں کے رستے میں ہیں۔ مصنوعی سوالات یا ان دیکھے معنوں کے از خود ملنے والے جوابوں اور حلوں نے ہمارے ذہنی افلاس میں اس بڑے پیمانے پر اضافہ کیا ہے کہ ہم انسان اور جانور کے درمیان صدیوں سے موجود بنیادی تفریق کو بھی فراموش کر چکے ہیں۔ اخبار کی سرخی، ریڈیو اور ٹیلیویژن کی مصنوعی خبر، کمپیوٹر کا طے شدہ معلوماتی نظام ہم پر اس قدر حاوی ہے کہ ہم نے اسے حتمی مان کر اپنے آپ کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے اذہان معلومات کی دلدلوں میں ڈھال دیے گئے ہیں۔ انفعالیت (Passivity) ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ انفعالی ذہن سست اور آرام پسند ہوتا ہے۔ اس پر خارجی نقوش از خود مرتسم ہوتے رہتے ہیں۔ یوں وہ بسا اوقات خیالات کا فلتھ ڈپو ہو جاتا ہے۔ نئی سوسائٹی کے انسان کا عمومی المیہ یہی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ آج کے بیشتر دانشور اور شاعر بھی تجزیہ کرنے، سوچنے اور سوال کرنے کے صداقت خیز عمل سے نابلد ہیں۔ ذہنی طور پر چوکس اور معاملہ فہم شاعر اردو ادب میں زیادہ تعداد میں موجود نہیں ہیں۔ ایسے شاعروں کے اذہان میں خیالات مستقل اور جدل اور تجارب کی حالت میں رہتے ہیں۔ وہ واقعات، ماحول اور افکار کا داخلی تنقیدی نظر سے جائزہ لیتے ہیں اور اپنے نتائج کو مناسب الفاظ کے لبادے میں قارئین تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس عمل کے دوران ان کا زرخیز تخیل اور تخلیقی جذبہ بھی ان کا ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اردو میں اظہار صداقت کی شاعری کو اظہار ضمیر کی شاعری کا بھی نام دیا گیا ہے۔ فیض احمد فیض، حبیب جالب اور ان کی قبیل کے متعدد شعراء نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہمارے دور کے انسان اور سماج کے تجربات و واردات کو اپنی شاعری میں خوش اسلوبی سے سمیٹا ہے۔ ان کے معاصر کئی ترقی پسند شعراء بھی صداقت کے جوہر سے متصف اپنے عہد کے ضمیر کا رزمیہ لکھتے رہے۔ لندن میں مقیم پاکستانی شاعر بخش لائل پوری کے شعری مجموعوں

"لہو کا خراج"، "زندانِ شہر"، "بادِ شمال" اور "ابھی موسم نہیں بدلا" کا مطالعہ قاری کو یہ آگہی عطا کرتا ہے کہ ان میں رقم ہونے والے تجربات کا انفعالی شعور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بخش لائلپوری کی شاعری کو نہ تو رومانی شاعری کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی کمرشیل۔ اس شاعری کو شاعری برائے شاعری کا نام بھی نہیں دیا جاسکتا۔ شاعر اپنے زندہ شعور کا اظہار کرنے کے لئے غزل اور نظم کے موثر سانچوں کو اپنائے ہوئے ہے۔ بخش لائلپوری کی شعری لفظیات کا مطالعہ اس امر کا غماز ہے کہ انہوں نے ترقی پسند اور جدید شاعری میں استعمال ہونے والی علامتوں، استعاروں اور تلمیحوں سے خصوصی ربط رکھا ہے۔ ان کے خیالات کا نچوڑ "بادِ شمال" کی ایک نظم دعاء میں دستیاب ہے۔ اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ یہ دور بے حسی کا ہے۔ لوگ سچائی کے اظہار سے گریزاں ہیں۔ صبر اور خموشی ان کا مقدر ہے۔ ہر انسان کی سوچ بنجر ہو چکی ہے۔ یاسیت کا پودا جڑیں پھیلا چکا ہے۔ امید اور بشارت کے سلسلے ختم ہیں۔ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات خاک و خون کی کہانی سنا رہے ہیں۔ امن اور خیر کے پیامبر ظلم کی چکیوں میں پس رہے ہیں۔ باشعور دانشور یا نقاد بے ضمیر ہو چکے ہیں۔ علم و آگہی کے چراغ بجھا دیئے گئے ہیں۔ دنیا میں ہر طرف بے روزگاری اور بھوک کا دیو دندنا رہا ہے۔ افتادگانِ خاک کی زندگی خراب ہے۔ حرص اور ظلم کے تیروں نے روحوں کو زخمی کر رکھا ہے۔ دروغ گوئی اور وحشت خیزی کا دور دورہ ہے۔ عقل و ہوش کے راہی خیر اور نیکی کا راستہ چھوڑ چکے ہیں۔ عالم و فاضل کہلانے والے جہالت کے خار زاروں میں بھٹک رہے ہیں۔ انسانی مساکن محفوظ نہیں ہیں۔ ہر طرف موت اور خزاں کا پہرہ ہے۔ وطن پرست لوگ قفس بدوش ہیں۔ عالمانِ جنگ کے فسادی نعروں نے شہر کی سہاگنوں کو بیوگی کا درد بخشا ہے۔ لوگوں سے زمینیں اور مکان چھن چکے ہیں۔ نفرت کا دیو منہ کھولے کھڑا ہے۔ ایسی بستیوں سے لوگ ہجرت کر رہے ہیں۔ سامراجی سامریت نے اپنی بدنہادی اور بدخصالی کو ظاہر کیا ہے۔ چاندی اور سونے کا کاروبار کرنے والے تجار ایٹمی تجربوں سے دنیا کو دہلا رہے ہیں۔ اہل اقتدار کے مہیب سایوں نے ہر طرف دہشت پھیلا رکھی ہے۔ شاعر خدائے خشک و تر کے آگے خشوع و خضوع سے جھکا ہوا دعاء مانگتا ہے کہ یہ دور کٹھن کا ہے اور اسے رحمت کی نظر چاہئے۔ اسے تازہ ہوا، بت شکن صدا، خوش کلام پیامبر اور معتبر رہنما کی ضرورت ہے۔ یہ صدا خامشی کے گنبد میں گونج کر اصل کائنات اور معنئ حیات کے راز کھولنے والی ہوگی۔ شاعر خدا سے انصاف کا طالب ہے۔ جولائی ۱۹۸۸ء کی لکھی ہوئی اس نظم میں جب بے بسی، بے بضاعتی اور کسمپرسی کی صورت حال کا اظہار ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مادی انقلاب اور سماجی تبدیلی کے دنیاوی راستے شاید اب انسان کی دسترس میں نہیں رہے۔ اسے خارجی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ نظم جہاں "ویٹنگ فارم گوڈو" میں ظاہر ہونے والے انتظار کے کوائف کی غماز ہے وہاں مابعد الطبیعاتی کائنات کے مسائل و معاملات کی نقیب بھی بنی ہے۔ بخش لائلپوری کی ترقی پسندی کا راستہ دہریت کی منزل سے آگے کا راستہ

ہے۔ یہ راستہ صاحب اعتقاد اور صاحب ایقاں لوگوں کا ہے۔ بخش لائلپوری کی نظم "میرا رشتہ" ایک اور حوالے سے میرے مذکورہ معروضات کی گواہی ہے۔ "یہود کی نذر" میں قبلۂ اول بیت المقدس کی بازیابی کا تذکرہ کر کے شاعر نے اپنے اعتبار اور ایمان کی بھی بھرپور نشاندہی کی ہے۔

بخش لائلپوری نے "زنداں شہر" کی نظموں اور قطعوں میں اپنے نظریات کو ربط و تسلسل سے یوں پیش کیا ہے کہ ان میں ایک گونہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ وطن کے حوالے سے "چودہ اگست" "اسلام آباد" "کارواں کو چھوڑ کر جب قائداعظم گیا" "ملاحی کی بستی" "پاکستان کا مطلب کیا" "قاتلوں کے تن بدن پر وردیاں موجود ہیں" "عوام دشمن سپاہ" "مارشل لا" "جرنیل" جیسی نظمیں جہاں پاکستان کے تاریخی، سیاسی اور سماجی احوال کی عکاس ہیں وہاں "اشتراکیت" "یاد یوم مئی" "منصوبہ بندی" "ملا" "نذر ساحر لدھیانوی" "سیہ فام" "ارض فلسطین" اور "قحط اتھوپیا" وغیرہ جیسی نظمیں ان کے بین الاقوامی اور قومی سیاسی اور سماجی شعور کی ترجمان ہیں۔ "زنداں شہر" کی نظموں کا انتساب بخش لائلپوری کے دل میں موجود جذبات کے آتش کدے کی نشاندہی کرتا ہے۔

اس انتساب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے آزادی پسند، دیانت دار، سخی، منصف مزاج اور انسان دوست حکمرانوں کی تمنا کرتے ہیں جو اپنی محنتوں اور تعمیری سوچوں کی مدد سے وطن کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکیں۔ بخش لائلپوری وطن عزیز کو جنت کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ ایسے باوردی افسروں کا خواب تکتے ہیں جو قوت ممیزہ کے حامل اور صاحب بصیرت ہوں۔ انہیں ایسے خوش نہاد عالموں اور دردمند مذہبی شخصیتوں کی تلاش ہے جو علم و فضل کے سرمائے سے معمور ہوں اور مکافات عمل کا تصور رکھتے ہوں۔ راشی، غدار، انسان دشمن نوکر شاہی کے خلاف بخش لائلپوری کا رد عمل بھی حقیقت پسندانہ ہے۔ "زندانِ شہر" کا شاعر "ایسے قومی راہنماؤں کے بھی خلاف ہے جو "ذاتی جاہ و حشم کی خاطر ہر کوچۂ سیاست میں محض ننگِ سیاست ہیں اور جو ہوس اقتدار اور جاہ طلبی کے لئے ایک برہنہ طوائف کی طرح رقص کناں ہیں۔" ان کے خیال میں ایسے راہنماؤں کے اذہان سرطان زدہ ہوتے ہیں اور ضمیر مردہ۔ اس شعبے میں اصول پرستی اور انسانی اقدار کا فروغ بھی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس کتاب کے انتساب کا آخری حصہ "مقدس الفاظ کی آبرو بیچنے والے" ادیبوں کے نام ہے۔ یہ انتساب نہیں ہے بخش لائلپوری کا فکری منشور ہے۔ اس کی روشنی میں ان کی مذکورہ بالا نظموں کا مطالعہ ہو سکتا ہے۔ بخش لائلپوری کی شاعری میں جس قسم کی طنزیہ تلخی ہے وہ کسی نظریہ پرست و انسان دوست شاعر ہی کا حصہ ہے۔ موضوعاتی نظموں کا وہ سلسلہ جو نظیر اکبر آبادی سے چلا تھا بخش لائلپوری جیسے شاعروں کے کلام میں آج بھی عکس فگن ہے۔ فرق یہ ہے کہ اب موضوعات کا دائرہ وسیع ہو چکا ہے اور زبان کا لب و لہجہ جدیدیت کی آنچ لئے ہوئے ہے۔ "زندان

شہر" کی نظموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے وطن پر ایمانِ کامل رکھتا ہے اور اس کے تناظر میں زندگی، انسان اور ذات کے معاملات کو پرکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ستم کی رات ڈھل جائے۔ وہ بربریت پر مشتمل نظاموں کے شکنجے توڑنے کا عہد کرتا ہے اور اشتراکی نقطۂ نظر سے عوامی حاکمیت کا بول بالا چاہتا ہے۔ عظمت انسان کا پرچم بلند ہو۔ ہر طرف محبت اور پیار کے پنچھی چہکنے لگیں۔ بخش لائلپوری کے اشتراکی نظریے میں وطن دوستی کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے

مرا دل اشتراکی ہے، عوامی ہے مری فطرت
میں ہرگز پاسبانِ تختِ شاہی بن نہیں سکتا
مگر جو اتحادِ ملک و ملت کی مخالف ہو
میں ایسی اشتراکیت کا داعی بن نہیں سکتا

اپنے نظریے کے حوالے سے بخش لائلپوری ہر طرف عدل و مساوات اور حق و صداقت کا دور دورہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اچھا انسان وہی ہے جو انسانی حرمت پر یقین رکھے، ذوقِ طلب کا حامل ہو، جو اپنی خودی کو بلند رکھے، آمریت شکنی کو اپنا مشن بنائے۔ بصیرت اور بصارت کے اوصاف سے مالا مال ہو۔ امن و امان کا محافظ ہو۔ ایسا انسان ان کے خیال میں سرخ پرچم اٹھا کر چلنے والا ہوتا ہے۔ سرخ پرچم یا اشتراکی نظریہ بخش لائلپوری کے بقول ترقی کا زینہ بنتا ہے۔ مظلوموں کے ہاتھوں کا ہتھیار اور محکوموں کی تقدیر ٹھہرتا ہے۔ یہ نظریہ مزدوروں اور دہقانوں کا سر بلند کرتا ہے، محنت کشوں کا نگہبان بنتا ہے۔ نظامِ کہن مٹانے کے درپے ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے بغاوت کی چنگاریوں کو فروغ ملتا ہے اونچ نیچ کی دیواریں گرتی ہیں۔ غربت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہ نظریہ فسطائی فتنے اور فسق و فجور کا خاتم ہے۔ تاجِ تکبر گراتا ہے اور تختِ غرور ہواؤں میں اچھالتا ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کے دم سے ہی دنیا کی رونقیں قائم ہیں۔ محنت کشوں کے ذریعے مشینیں چلتی ہیں، عشرت کدے آباد ہیں۔ دہقان گندم کے خوشے اور سرسوں کے پھول اگاتے ہیں۔ ان کی بدولت زمینیں سونا اگلتی ہیں۔ بخش لائلپوری اپنے نظریہ کے تناظر میں کہتے ہیں انہیں یہ حقیقت جان لینی چاہئے کہ وہ دنیا میں معیشت کے جہانوں کے مالک ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں عنانِ معیشت ہے۔ اس لئے وہ ہی اصل حکمران ہیں۔ آج جبکہ سامراجی طاقتوں نے اشتراکی نظام کی نام نہاد شکست کا اعلان کیا ہے بخش لائلپوری کی شاعری میں موجود اشتراکی خیالات قارئین کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں اور جیسے اقبال نے کہا تھا کہ مسلمان کسی ایک علاقے کے مٹ جانے سے ختم نہیں ہو جائیں گے ویسے ہی اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ روس کے بکھر جانے سے اشتراکیت کو شکست نہیں ہوئی۔ وہ تو اب بھی کئی ملکوں اور لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔ اس لئے کہ بقول اقبال

نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے!

زندانِ شہر میں آزاد نظمیں بھی ہیں اور پابند نظمیں بھی۔ بخش لائلپوری نے نظم کی ہر دو قسم کی ہیئتوں کو مقدور بھر مہارت سے استعمال کیا ہے۔ ایسا لگتا

ہے کہ انہوں نے اپنے فن میں ڈوب کر حسنِ افکار کی نشاندہی کی ہے۔ وہ تلخ اور کھردرے تو ضرور ہیں لیکن امید اور روشنی کے سلاسل سے عاری نہیں ہیں۔ منیر نیازی نے بخش لائلپوری کی شاعری کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''بخش لائلپوری کی فکر اجتماعی شعور کی آئینہ دار ہے اور ان کی شاعری میں گزشتہ سے پیوستگی اور کچھ آئندہ کا نیا پن آپس میں دو زبانوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

''ایک اندار زندگی سے گہری وابستگی اور اس کے ساتھ تخلیقی تحرک. تخلیقی فن کی پاسداری، اجداد سے وفاداری اور اس کی میراث کو اور زیادہ خوبصورت لب و لہجہ میں بیاں کرنے کی شعوری پختگی اور تمنا۔ یہ چاروں صفات بخش لائلپوری کے کلام کی اصل ہیں اور اس کے اظہار کا خاصہ ہیں''

بخش لائلپوری کے لب و لہجے کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید، رئیس امروہوی، ڈاکٹر عقیل رضوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر سجاد حارث نے ''زندان شہر'' کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بخش کی شاعری انقلابی حرارت سے معمور ہے۔

بخش لائلپوری کے فن کے بارے میں ''دکا مزاج''''باد شمال'' اور ''ابھی موسم نہیں بدلا'' میں موجود ڈاکٹر قمر رئیس، عابد حسین منٹو، پروفیسر سجاد حارث، ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر جمیل ملک، فیض احمد فیض، امین مُغل، ڈاکٹر صلاح الدین حیدر، فارغ بخاری اور مسعود منور کی آرا سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ہر مکتب کے نقادوں اور دانشوروں کی سندِ قبولیت حاصل ہے۔ انہوں نے شاعری کے عوامی پیرائے، مثبت سوچ، برہنہ گفتاری، سادگی، بے باکی، صداقت، بے ساختگی، عالمگیر احتجاج، شعری تمازت، جدتِ فکر، اظہار اقدار، روشن فکری، زندہ ضمیری، ماحول فہمی، تغزل، تازگیٔ فکر، انقلاب دوستی، انسان شناسی اور تخلیقی آنچ کی بھرپور تعریف کی ہے۔ مذکورہ نقاد خود بھی مستند ہیں اور ان کے خیالات بھی صداقت کے حامل ہیں۔ ان اسناد کی موجودگی میں بخش لائلپوری کے لئے کوئی نئی بات لکھنا کارِ محال ہے۔

جہاں تک بخش لائلپوری کے مجموعوں میں موجود غزلوں کا تعلق ہے ہم انہیں فکری غزلوں کا نام دے سکتے ہیں۔ شاعر نے زندگی، انسان اور کائنات کے باہمی روابط و تضادات کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے اسے مناسب استعاروں، تلمیحوں، علامتوں اور ترکیبوں میں بیان کردیا ہے۔ شاعر کے افکار بھی واضح ہیں اور اشعار بھی۔ بخش لائلپوری کے مجموعوں میں موجود شاعری کا غالب حصہ غزلیہ ہے۔ ان کی غزلیں سیاسی اور سماجی جائزے کی غزلیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم ان غزلیات کو اولاً حالی، اکبر، اقبال، حسرت کی شعری روایات کی روشنی میں پرکھ سکتے ہیں اور ثانیاً ترقی پسند شعراء فیض، ساحر، مجاز، کیفی، قاسمی، ظہیر کاشمیری، حبیب جالب وغیرہ کے ساختہ غزل کے مزاج کے حوالے سے دیکھ سکتے ہیں۔

بخش لائلپوری کی غزلوں میں قفس،

طوق گلو، ستمگر، ظلمت، فقیہہِ شہر، باغبان، غنچہ، مقتل، فصیل شب، حصار شب، رسن، چمن بدر، کرمکِ شب تاب، بھنور وغیرہ کی علامتیں اپنے عہد کی داستان سناتی ہیں۔ وہ فکر جدید سے مربوط ہو کر زندگی اور انسان کو اس کی اصل پہچان دینے کا عہد کرتے نظر آتے ہیں اور قارئین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ بے حسی کی دیوار گرا کر بے زبان حرفوں کی زبان سمجھنے کی کوشش کریں گے اور محاذِ فکر پر ڈٹ کر زندگی گزاریں گے۔ بخش اپنی غزلوں میں صنعتی فرعونوں کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ طبقاتی نظام نے انسان کو جتنا بے وقعت کیا ہے بخش کی شاعری اس کی کہانی بھی بیان کرتی ہے۔ لہو کا خراج، بادِ شمال اور ابھی موسم نہیں بدلا میں موجود غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر جذبے اور خیال کی ناؤ میں بہتا چلا جارہا ہے۔ اس کے اس سفر میں لفظ رکاوٹ بنتے نظر نہیں آتے۔

بخش کی شاعری میں ترقی پسند روایت کا بڑا عمل دخل ہے وہ بہت سے شاعروں کی طرح بات کو حالت اخفا میں رکھنا نہیں چاہتے۔ اردو کے جدید اور نئے شاعروں نے بھی عصری حقیقتوں اور مسائل و معاملات پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن انہوں نے اپنی علامتوں کو اتنا ہمہ جہت بنایا ہے کہ اکہرے معانی اور یک سطحی خیال کے دربند ہوتے نظر آتے ہیں۔ بخش لائلپوری کی غزلیں الجھاؤ، ابہام اور فکری پیچیدگی سے دور ہیں۔ انہوں نے عام فہم اور سیدھی سادی علامتوں میں اپنے دل کا مدعا کہا ہے۔ ترقی پسندوں نے جن علامتوں کو کثرت سے استعمال کیا ہے بخش نے ان سے خصوصی کام لیا ہے لیکن کسی جگہ ان کا لہجہ روایتی یا تقلیدی نہیں ہوا

جو پی رہا ہے سدا خون بے گناہوں کا
وہ شخص تو ہے نمائندہ کج کلاہوں کا

کتابوں میں جس کا ملا تذکرہ
نصابوں میں اس کا نشاں بھی نہیں

اگ رہے ہیں لالہ و نرگس ببولوں کی طرح
چومتے ہیں لوگ اب کانٹوں کو پھولوں کی طرح

ہم رک گئے تو گردشِ دوراں بھی تھم گئی
ہم چل پڑے تو وقت کی رفتار بن گئے

ملک میرا آزاد ہے لیکن
قوم مری آزاد نہیں ہے

ہر اک ہاتھ میں ہتھکڑیاں ہیں ہر پاؤں میں زنجیریں
آج کا انساں زندانی ہے زندانوں کی بات کرو

خطیبِ شہر کا لہجہ عجیب ہے
برہنہ لفظ ہیں اور حکمتِ بیاں بھی نہیں

سڑکوں پہ خونِ گرم کی اک ایک بوند میں
جلتے ہوئے سماج کا چہرہ دکھائی دے

باد شمال کی غزلوں اور قطعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے عابد حسن منٹو نے لکھا ہے کہ بخش لائلپوری کی شعری روایت ''تیسری دنیا کے مظلوم عوام کی آزادی، بہتر زندگی اور حسین مستقبل کی تمنا اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد سے عبارت ہے''

''بخش لائلپوری تیسری دنیا کے مسائل کے بارے میں مجرد خیالات کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ اپنے وطن کے حوالے سے ان مسائل کا ادراک کرتے ہیں۔ آمریت، بنیاد پرستی، طبقاتی استحصال اور انسانی قدروں کی پامالی کی ساری تصویر پاکستان کے حوالے سے ان کے اشعار میں موجود ہے۔ اپنے وطن سے گہری محبت کا جذبہ ان کی مزاحمتی شاعری کو شدت طرز حیات سے مزین کرتا ہے، بے ساختگی اور راست بیانی بخش کی خصوصیت ہے''

اس حوالے سے بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیرون ملک رہتے ہوئے بخش نے معروضی ادراک کی جن حدود کا احاطہ کیا ہے اسی وجہ سے وہ جذباتیت کی دلدلوں میں گرنے سے بچ گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی اور اپنے سماج اور وطن کی حیثیت اور صورت حال کو بین الاقوامی تناظر میں سمجھا ہے۔ عصر حاضر میں انسان کو جس بحران کا سامنا ہے بخش لائلپوری نے اس کو پورے طور پر سمجھا ہے۔ وہ جانتے ہیں نئے صنعتی اور تکنیکی نظام نے حرص و ہوس کے جن شعلوں کو ہوا دی ہے ان میں انسانی جسم و جاں جل رہے ہیں۔ آج کا انسان خودکشی کو زندگی سمجھ رہا ہے۔ اس کی رفتار تیز ہے لیکن سفر آہستہ ہے۔ بھوک، افلاس اور ناداری کی دہشت ناک چمگادڑیں اس کے سر پر منڈلا رہی ہیں۔ بے حسی اور کم مائیگی نے اس کی انسانی تمثال کو مسخ کیا ہے۔ نئے عہد کے معماروں، رہبروں اور راہنماؤں نے عوام کو دھوکہ دیا ہے، بخش لائل پوری کی شاعری تجزیے کی کٹھالی میں پگھلتے خیالوں کی شاعری ہے۔ وہ اپنے معاصر شعراء سے بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی طرح ہی حرفوں کی توقیر کو قائم رکھیں گے۔

بخش لائلپوری نے ترقی پسندانہ آئیڈیالوجی کے سہارے اپنا جذبات، خیالات اور تجربات کی لفظی عکاسی کا کام خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ نئے عہد اور اپنے وطن کی مخصوص صورتِ حال میں جس قسم کے ترقی پسند تصورات و افکار کی ضرورت ہے بخش ان سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ ابلاغ اور ترسیل کے عوامی وتیروں سے کام لینے سے گریزاں نظر نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات راہ راست کی حدیں چھوتے دکھائی دیتے ہیں۔ تخیل اور رمزیت کی وہ گیرائی اور گہرائی جس سے شعر غور وفکر کا مطالبہ کرے بخش کے تصورِ شعر میں زیادہ اہم نہیں ہے۔ وہ اپنی تجزیاتی فکر کو اس انداز سے سپرد قلم کرتے ہیں کہ شعر کی تفہیم میں مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

''ابھی موسم نہیں بدلا'' کی ایک نعتیہ نظم ''دربار رسالت میں'' جہاں بخش لائلپوری کی حضورؐ کی عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے وہاں اس میں ''واحد متکلم'' کے حوالے سے اپنے عہد کے انسان کی صورتِ حال کا بھی کھلا ذکر ہوا ہے۔ وہ آج کے انسان کے کذب، فریب، ریاکاری اور چالاکی کا پردہ چاک کرتے ہیں اور لکھتے ہیں

- میں سیم وزر کے ٹکڑوں پر
میں دینار ودرم کے ترنوالوں پر
ہلا کر دم مثالِ سگ جھپٹتا ہوں
مرے نغمے سراسر آمریت
کے قصائد ہیں
خدا شاہد مرے قلب و نظر میں
سینکڑوں شیطان پلتے ہیں
قلم میرا ہے ملکیت سیاسی قحبہ خانوں کی
زباں میری، بیاں میرا، سخن میرا
بکاؤ مال ہے میرا

شاعر اور ادیب زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ بخش لائلپوری نے "واحد متکلم" کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنے عہد کے شعر و ادب میں موجود رویوں کی بھرپور تصویریں کھینچی ہیں اور دعا مانگی ہے باطل پرست شاعروں اور ادیبوں کو حق پرستی عطا ہو۔ غلط گو دانشوروں کو تحفۂ صداقت ملے، مردہ ضمیر اہلِ قلم روشن ضمیری سے مالا مال ہوں، بے بصر آنکھیں بصارت کی نعمت سے آشنا ہوں۔ بخش لائلپوری نے اس نعتیہ نظم میں درست لکھا ہے کہ آج کے ادیب اور شاعر حرص کی نیلام گاہوں میں بک رہے ہیں۔ وہ قلم کی آبرو بیچ رہے ہیں۔ وہ بونوں کو قد آور کہہ رہے ہیں۔ انہیں اپنے عہد کی سچائی کی خبر نہیں ہے۔ منافقت اور دورنگی کا زہر ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ مصلحت پسندی اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا ہمارے عہد کے ادیبوں اور شاعروں کا شیوہ بن چکا ہے۔ وہ ادھر چلتے ہیں جدھر کی ہوا ہوتی ہے۔

"ابھی موسم نہیں بدلا" کی غزلوں میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان اشعار کا لب لباب یہ ہے کہ حق پرست روز سولی پر چڑھتے ہیں۔ اس دور میں انسان کا چہرہ مسخ ہو چکا ہے۔ دنیا جنگ و جدل کے نقصان دہ کام میں جٹی ہے۔ غیر ملکوں میں رہتے ہوئے انسان کو اجنبیت و بیگانگی کا سامنا ہے۔ شاعر چاہتا ہے کہ حرمتِ حرف پر کسی قسم کا الزام نہ لگے۔ ظلم چند روزہ ہے، آخر ختم ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں بزم شاہی، ظلمت شب، سرِ باطل، قاتل، اہل ستم، سنگ باز، شہر ظلمت، عہدِ غفلت، دشتِ غربت، مقتل شہر، ناخدائے وقت، کربلا، جلاد، اطاقِ شب اور اسی قسم کی دوسری ترکیبیں اور علامتیں جہاں انسان کے ہاتھوں انسان پر ہونے والے ظلم کی عکاسی کر رہی ہیں وہاں انسان کی بے زبانی، بے حسی، مجبوری، بے کسی، بے بسی کا اظہار بھی ہیں — اس مجموعے میں بھی بخش لائلپوری کا تلخ اور ناراض لہجہ بدستور موجود ہے۔ منافقانہ روش، مجاورانِ جہالت، طوائف لوح و قلم، بوم، کلاغ، زاغ، چور اچکے، راہزن، شمرِ ادب کے مسخرے جیسے الفاظ شاعر کے دل میں موجود تلخ اور درشت جذبوں کے حوالے ہی سے اس مجموعے میں موجود ہیں۔ اس مجموعے میں موجود نظمیں بخش لائلپوری کے قومی اور بین الاقوامی تجزیوں اور جائزوں کی موثر ترسیل پر مشتمل ہیں۔ "زوال روس" "کاش کہ ہم بھی" "وہ دن بھی آنے والا ہے" "پاکستان اسیروں کی نذر" "کرب تخلیق" "ملا عورت اور گواہی" بابری مسجد کی شہادت پر"

"ریموٹ کنٹرول" "سال گزشتہ" "ابھی موسم نہیں بدلا" "گینگ ریپ" "ایٹم بم" "ریڈیو" "یاد فیض" "کشمیر" "آئین" "حکومت" "پولس" "آزادی" "زندگی" "امریکہ" "جمہوریت" "صحافت" اور ملا (مختصر نظمیں) بخش کے ویژن کی وسعت اور افکار کے پھیلاؤ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان کی نظم "ابھی موسم نہیں بدلا" میں اس امر کا واضح اعلان ہے کہ پاکستان میں آئے دن جو نظام بدلنے کی نوید سنائی جاتی ہے وہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہوتی ہے۔ معاملات جوں کے توں ہی رہتے ہیں۔ اسلئے کہ قوم و عوام کو جاگیرداروں اور چوہدریوں نے گھیر رکھا ہے اور وہ انسانی فلاح کا کوئی کام نہیں ہونے دیتے۔ وہ لکھتے ہیں

حکومت شب کا پہرا اٹھا گیا
[illegible]
[illegible] منظر سے کا
[illegible]
[illegible] کی تمہید
مگر تمہید [illegible] یہ ٹھہرا [illegible] بھی کوئی
پیش منظر حوادث کا
[illegible]
[illegible] سائے میں
شبستان ملامت کے مکیں ہیں
منہمک ہے سازشوں میں
تمام اس کریہہ کے مختصر
وقفے میں اے ہمدم!

کسی نادیدہ خوش فہمی میں مت رہنا
مشیرانِ تشدد کا فسوں اب تک
نہیں ٹوٹا
ابھی فکر و نظر کا زاویہ ہرگز نہیں بدلا
ہوائے وقت ناہنجار کا
سرگم نہیں بدلا
دعائیں مانگتے رہنا
ابھی موسم نہیں بدلا

اور یہ موسم بدل بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ ملکی آئین ٹائلٹ پیپر ہے، حکومت آمریت ہے، قومی لٹیرے محفوظ ہیں۔ گینگ ریپ ہو رہے ہیں۔ ڈاکہ زنی کا دور دورہ ہے۔ سمگلنگ ہو رہی ہے۔ عوامی خزانہ لوٹا جا رہا ہے۔ عالمی غنڈے تیسری دنیا کو گھیرے ہوئے ہیں، تاریخ کے پہیئے اُلٹے گھوم رہے ہیں۔ جھوٹ کا علم بلند ہے۔ بخش لائلپوری چاہتے ہیں کہ ان کے پیارے وطن اور تیسری دنیا کے دیگر ممالک میں امن قائم ہو۔ عوام کو انصاف ملے۔ طبقاتی معاشرت سے نجات حاصل ہو، سامراجی نظام کو جڑ سے اکھاڑا جائے۔ نئی طرز کی معاشی غلامی سے ملکوں کو چھٹکارا ملے۔ مذہب اور سیاست کے نام پر ہونے والے ظلم کا خاتمہ ہو۔ بخش لائلپوری کی شاعری کی نمو ٹھوس انسانی صورتِ حال سے ہوتی ہے۔ انہوں نے خیر و شر اور ظالم و مظلوم میں تفریق کی ہے۔ انہوں نے اپنے ضمیر کے اظہار میں کوتاہی نہیں کی۔ ان کا ادراک غلام نہیں ہے۔ ان کی

شاعری کو ہم ان کے ضمیر کا رزمیہ قرار دیتے ہوئے یہ بات بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ وہ مصلحت اور مصالحت کے نشتروں سے کبھی گھائل نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے جسے سچ سمجھا اس کا برملا اظہار کیا۔ وہ چاہتے تو اپنی ذات کی نفسیاتی الجھنوں کے حوالے سے شاعری کرتے اور اپنے عہد کے انسان کے دکھوں اور تکلیفوں سے آنکھیں چرا لیتے لیکن ایسا کرنا ان کے ضمیر کے تقاضوں کے خلاف تھا کیونکہ وہ تماش بینی اور غیر سنجیدہ فکر کو شاعری کے لئے سم قاتل سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ان دنوں برطانیہ کو اردو زبان کا تیسرا مرکز کہا جاتا ہے جہاں اردو زبان کے سینکڑوں شعراء کرام اپنے تخلیقی جوہر دکھا رہے ہیں۔ لیکن جو تخلیقی شعلہ نوائی، شعری بوقلمونی، فکری توانائی، ہمہ جہتی، آفاق گیری سوچ اور بلند پروازی بخش صاحب کے کلام میں جاری و ساری ہے دوسرے شعراء کے کلام میں بہت کم نظر آتی ہے بخش لائل پوری بلا شبہ برِ صغیر کے اردو دان حلقوں کے تسلیم شدہ شاعر ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں بخش صاحب کے پہلے مجموعہ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف نقاد ڈاکٹر انور سدید نے بخش صاحب کو علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، حبیب جالب، ظہیر کاشمیری اور احمد فراز جیسے معروف شعراء کے ہم پلہ قرار دیا تھا اور ۱۹۸۷ء میں ممتاز شاعر محسن نقوی مرحوم نے اپنے ایک انٹرویو میں بخش لائلپوری کو جدید غزل اور نظم کے حوالے سے ہراول دستے کا شاعر کہا تھا۔ میرے خیال میں یہ دونوں آراء کچھ غلط بھی نہیں اب میں چند اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے درج ذیل کرتا ہوں۔

اُسی کے ظلم سے میں حالتِ تباہ میں تھا
ہر اک نفس مرا جس شخص کی پناہ میں تھا

مرے حریف مجھے روند کر نکل نہ سکے
فصیلِ سنگ کی صورت کھڑا میں راہ میں تھا

رگیں کٹیں تو بہا خون روشنی کی طرح
ہمیں تو موت بھی آئی بڑے وقار کے ساتھ

بڑے خلوص سے اپنا لیا ہے گھر کی طرح
میں تاحیات نظر بند جس قفس میں رہا

یہ کون مسندِ اہلِ سخن پہ بیٹھا ہے
زباں بھی گنگ ہوئی حرفِ معتبر بھی گیا

کہا یہ کان میں کیا سرپھری ہواؤں نے
ہمارے ذہن سے اہلِ ستم کا ڈر بھی گیا

عطا کیا ہے اگر منصبِ سخن مجھ کو
قلم کے ساتھ مجھے حرفِ لازوال بھی دے

لاکھ کرو تم دار کو اونچا
دار سے اونچے سر نکلیں گے

یہ کس نے شہر کے پست قدوں کو
بلندی پہ اٹھا کر رکھ دیا ہے

شور تا حشر ہوگا ستم گر کے خلاف
ہم نہ ہونگے تو کوئی اور دہائی دے گا

اڑے جو ہم تو قفس کو بھی ساتھ لے کے اڑے
یہ معجزے بھی ہمارے ہی بال و پر کے تھے

ہم قفس سے ہوگئے مانوس اس طرح
طوقِ گلو بھی جسم کا حصہ دکھائی دے

خوش پوشیوں کا جس کی ہے شہرہ گلی گلی
وہ شخص مجھ کو شہر میں ننگا دکھائی دے

شہرِ دہشت میں ہجومِ قاتلاں کے درمیاں
ہم اگر زندہ ہیں تو یہ معجزے سے کم نہیں

ہمارے خواب پوری ہوگئے ہیں
مگر راتوں کو نیند آتی نہیں ہے

گھر کے دریچے میں اک عجیب منظر ہے
شور گھر کے باہر ہے چور گھر کے اندر ہے

کو یہ کو تخیل ہے دل پذیر مصرعے ہیں
بخش شعر گوئی کا آخری پیمبر ہے

بخش صاحب کا کلام اس نوع کے تفکر آمیز اشعار سے معمور ہے جس سے چند نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ ان کے تمام مجموعے دیکھنے سے نہیں پڑھنے سے تعلق رکھتے۔ بخش صاحب نے ایک شعر میں شعر گوئی کے آخری پیمبر کا جو دعویٰ کیا ہے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بخش لائلپوری ترقی پسندوں اور روشن خیالوں کی موجودہ پیڑھی کا بڑا توانا اور فکری اجتہاد کا نمائندہ شاعر ضرور ہے۔

عصرِ حاضر جس انقلابی کشمکش اور انقلابی تصادم کا شکار ہے شعر کے پیرائے میں اس کی ترجمانی بخش لائلپوری نے گہری دلسوزی اور دردمندی سے کی ہے۔ کسی تامل اور تذبذب کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ بخش ممتاز اور منفرد اسلوب کا حامل شاعر ہے۔ اس کا کلام نئی سوچ کا آئینہ دار ہے اور اس کے مخصوص استعارات اور کنایات، انقلاب، عصرِ نو، کشمکش و تصادم، شبِ تار اور صبحِ تازہ ہیں۔ اس کی فکری تازہ کاری کہنگی اور روایتی اسالیبِ بیان سے پاک ہے۔

رئیس امروہوی

پاکستان کی محبت میں چھوڑ لندن میں فیصل آباد کا بخش لائلپوری

محمود ہاشمی

لندن میں مقیم شاعر بخش لائلپوری کی اس وقت تک چار کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ''لہو کا خراج''، ''باد شمال''، ''زندانِ شہر'' اور ''ابھی موسم نہیں بدلا''۔ ان کی پہلی کتاب لہو کا خراج ۱۹۸۵ء میں چھپی تھی۔ اس میں مصنف کی اپنے بارے میں تحریر ''ذات کی بات'' کے علاوہ فیض احمد فیض اور فارغ بخاری کے لکھے ہوئے دیباچے اور پروفیسر امین مغل کا لکھا ہوا فلیپ تھا۔ دوسری کتاب زندانِ شہر (مطبوعہ ۱۹۸۷ء) میں پروفیسر محمد حسن کا دیباچہ اور پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر سجاد حارث، ڈاکٹر انور سدید، رئیس امروہوی ڈاکٹر عقیل رضوی اور منیر نیازی کے لکھے ہوئے فلیپ تھے۔ تیسرا مجموعہ ''باد شمال'' ۱۹۸۹ء میں چھپا تھا۔ اس میں جاوید حکیم قریشی کا دیباچہ اور فلیپ پر پروفیسر جمیل ملک، ڈاکٹر قمر رئیس، عابد حسن منٹو اور پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن کی تحریریں ہیں۔ چوتھا اور اب تک ان کا آخری مجموعہ ''ابھی موسم نہیں بدلا'' ۱۹۹۳ء میں چھپا ہے۔ اس کے آخر میں مسعود منور کی تعارفی تحریر ہے۔ جس کا تعلق ان کے تیسرے مجموعہ ''باد شمال'' سے ہے۔ لیکن کسی وجہ سے یہ وہاں نہ چھپ سکی۔ لہٰذا اسے اب اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ورنہ اب خود اعتمادی کا یہ عالم ہے کہ نہ کوئی دیباچہ ہے اور نہ فلیپ۔ کاغذ بھی پہلے کی طرح دبیز آرٹ پیپر نہیں بلکہ عام کتابی کاغذ ہے۔ یہ اس امر کا اظہار ہے کہ شاعر کو اب کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے
اس مجموعہ کی ایک ابتدائی غزل کا مطلع ہے:

مرے ہر لفظ کی توقیر رہنے کے لئے ہے
میں زندہ ہوں مری تحریر رہنے کے لئے ہے

دوسرا شعر ہے:

ستم گر نے جو پہنائی مرے دست طلب میں
یہ مت سمجھو کہ وہ زنجیر رہنے کے لئے ہے

ساری غزل اسی طرح رواں دواں ہے۔

گزر جائیں گے ہم دار فنا سے بخش لیکن
ہمارے شعر کی تاثیر رہنے کے لئے ہے

ان کے پہلے مجموعہ میں فارغ بخاری نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ بخش لائلپوری ذہنی اعتبار سے اور پیدائشی طور پر ترقی پسند نظریات کا حامل ہے۔

ان کے دوسرے دیباچہ نگاروں میں سے بیشتر نے ان کا رشتہ ترقی پسندی سے ہی جوڑا ہے۔ بادی النظر میں یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن بخش لائلپوری کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ انہیں محض ترقی پسند کہہ دینا شاید زیادتی ہو۔

ترقی پسند تحریک کے اولین علم برداروں کا لہجہ نرم اور مزاج رومانوی تھا۔ یہ لوگ عموماً یو۔ پی۔ کے چھوٹے بڑے زمینداروں کے نازو نعم میں پلے ہوئے شاعر بیٹے تھے۔ جو ایک بڑے باپ کے ولایت پلٹ بیرسٹری پاس بیٹے سجاد ظہیر کی من موہنی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہوکر ترقی پسند بن گئے تھے۔ یہ لوگ روایتی غزل کے بجائے غریبوں اور مزدوروں کی حمایت اور ان کا استحصال کرنے والوں کی مخالفت میں شعر لکھتے ہیں۔ اور اپنی شاعری کی حد تک غریبوں کے غم میں بے حال رہتے تھے۔ اسرار الحق مجاز کی مشہور نظم ''آوارہ'' اسی کیفیت کی مظہر ہے

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اردو ادب میں ''ترقی پسند تحریک'' کا کارنامہ یہ ہے کہ اس زمانے کے تمام شاعر اور ادیب خواہ ان کا تعلق اس تحریک سے براہ راست تھا یا نہیں ایک خاص روش پر چل پڑے، اور ایک نئی طرز فکر اردو ادب پر اثر انداز ہوئی۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا۔ اور قریب قریب اسی زمانے میں پنجاب کے ایک گاؤں میں بخش لائلپوری پیدا ہوئے۔ انہوں نے اسرارالحق مجاز کے مندرجہ بالا اشعار اپنے عنفوان شباب میں ضرور پڑھے ہونگے۔ ان کے دھیمے دھیمے، میٹھے میٹھے طنز کو بھی محسوس کیا ہوگا۔ ان کی نوخیز جوانی ''غم دل'' اور ''وحشت دل'' کے تجربوں سے بھی گزری ہوگی۔ لیکن جس ماحول میں بخش لائلپوری کا خمیر اٹھا تھا۔ وہ یو۔ پی کے ماحول سے مختلف تھا۔ یہ اتنا نرم اور گداز نہ تھا۔ اس میں ''یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک'' کی سی بے باکی تھی۔ پنجاب میں پلنے والے ''گبھرو'' کی گرج اور توانائی تھی۔

بخش لائلپوری کا مزاج دہلی، لکھنؤ اور الہ آباد والے ترقی پسندوں سے مختلف ہے۔ اس کا لہجہ اور اٹھان بھی مختلف ہے۔ جب بخش لائلپوری کی شاعری آنکھیں کھول رہی تھی تو گل و بلبل کے قصے، شب ہجراں کی اختر شماری اور محبوب کی زلف کی طرح سیاہ اور طویل راتیں ترقی پسندی کے ریلے میں مدھم پڑ چکی تھیں۔ اب ایک نئی سحر کی نوید تھی۔ اور سر مدو منصور اور دار و رسن کی باتیں تھیں۔ باتیں ہماری پرانی غزل میں بھی تھیں۔ غالب کے ہاں بھی تھیں۔ لیکن ترقی پسند فیض نے اسے جس انداز میں اپنایا اور دہرایا وہ ہماری شاعری میں بالکل نئی چیز تھی۔

بخش لائلپوری کی ابتدائی شاعری میں بھی یہ سب کچھ ہے۔ ترقی پسندی کے اثرات بھی ہیں۔ لیکن وہ نوید سحر، دار و رسن اور جنون و وحشت کے چکر سے بہت جلد باہر نکل آئے۔ جیسے جیسے ان کی شاعری آگے بڑھی ہے ترقی پسندوں کی مخصوص تراکیب کا استعمال ان کے ہاں کم ہوتا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ان کے بغیر بھی انہیں اپنی بات کہنے کا ڈھنگ آ گیا ہے

ہے جنوں کی لو سے روشن ہر چراغِ آگہی
تم نشانِ سرحدِ ادراک سے آگے چلو
یہ جہاں تو ہے اسیر گردشِ چرخِ کہن
ہمدمو! تم گردشِ افلاک سے آگے چلو

بے جلد سی کتاب ہے گویا حیاتِ دہر
جھونکا چلا ہوا کا تو ورقے الٹ گئے

در بغل بانگِ درا در دست ہے ضربِ کلیم
اور سدا لب پر حدیثِ شکوۂ اقبال ہے
فکر و کردار و عمل سے ہیں تہی داماں تمام
عاشقانِ حضرتِ اقبال کا یہ حال ہے

بخش لائلپوری اپنے مزاج کے لحاظ سے بعض اوقات جوش ملیح آبادی کے قریب نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ قربت آنی جانی ہے۔ اور جوش کی ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' جیسی دو چار نظموں تک محدود ہے۔ جوش شاعر انقلاب کہلاتے تھے۔ لیکن ان کا اصل سرمایہ ان کا ذخیرۂ الفاظ اور اس کا برجستہ اور بے ساختہ استعمال ہے۔ وہ موضوع سے زیادہ زور بیاں اور حسن بیاں کے شاعر ہیں۔

بخش لائلپوری کے ہاں بھی حسنِ بیاں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن جوش کے برعکس وہ موضوع کو حسنِ بیاں پر مقدم رکھتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر بخش لائلپوری کا تعلق شاعری کے کسی قبیلہ سے جوڑنا ضروری ہے تو وہ اس کارواں کے رہرو ہیں جس کے سالار ظفر علی خان تھے۔ اور جس کا نمائندہ شورش کاشمیری تھا۔ بخش لائلپوری کے جذبہ میں جو تیزی و تندی ہے، حرکت اور حرارت ہے اور اظہار میں جو قوت، شدت اور بے باکی ہے وہ ان سے قبل صرف ظفر علی خان اور ان کے پیروکار ہی میں نظر آتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ظفر علی خان کا دور اور تھا۔ اور بخش لائلپوری ایک اور زمانے میں رہ رہے ہیں۔ دونوں کے ہاں مسائل موضوعات اور ترجیحات مختلف ہیں۔ ورنہ دونوں کا ردعمل اور اس کا اظہار ایک جیسا ہے۔ ظفر علی خان وطن عزیز کی آزادی کے سپاہی تھے۔ وہ حکمراں انگریز اور اس کی ہر اس چیز سے برسر پیکار تھے جو انہیں غلامی کی زنجیر نظر آتی تھی۔ بخش لائلپوری آزادی حاصل ہو جانے کے بعد کے نئے سیاست دانوں کی سیاست گری، جاگیرداروں کی فرعونیت، برخود غلط علماء اور خود ساختہ پیروں کے ہاتھوں علم کی بے حرمتی اور خستہ سامانی سے خفا ہیں۔

اپنے غم و غصے کے اظہار میں وہ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ مصلحت کو وہ منافقت سمجھتے ہیں۔ اور یہی ظفر علی خان کا طریق قلندری تھا۔ ظفر علی خان کے ہاں ''ہت تیرے نخرے میں ڈالا گرم مسالہ اور ''ہت تیری گیدی کی دم میں نمدا'' کا سا ''ڈنڈا مارا'' انداز کسی مصلحت کا روادار نہیں۔ ظفر علی خان کا ایک مشہور شعر ہے

تہذیب نو کے منہ پہ وہ تھپڑ رسید کر
جو اس حرامزادی کا حلیہ بگاڑ دے

بات کہنے کا یہ انداز بخش لائلپوری کے ہاں بھی عام ہے۔ جب حساس اور بیدار ذہن کو یہ احساس ہونے لگے کہ ''کوئی ملتا نہیں محرم جہاں میں۔ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' تو بے چارگی جس طرح کے غیظ و غضب کو جنم دیتی ہے اور رد عمل جو صورت اختیار کرتا ہے اس کی ایک مثال بخش لائلپوری کی نظم ''گینگ ریپ'' ہے۔ اس کا پہلا مصرعہ ہے۔

آزادی کے ناگ بلے

نظم کے چند اور اشعار ہیں

فرزنداں اہل شہوت
فاسق، زانی، لچ، بہادر
عیش حرامی، غنڈے لوفر
آوارہ خنزیر کے نطفے
حق نیابت کے مشٹنڈے
جاگیروں کے راج دلارے
شہر کے ہر مجرا منڈل میں
اپنی شہوت کے سانپوں کے
پھن لہرائے گھیرا ڈالے

اس طرح کی نظمیں اب بخش لائلپوری کی پہچان بن چکی ہیں۔ ''نماز حق'' ان کی ایک تازہ نظم ہے:

گناہوں کے تعفن خیز دامن پر
چھڑک کر عطر کے قطرے
لگا کر سرمۂ توحید
حرص آلود آنکھوں کے جھروکوں میں
سجا کر سر کو دستار جہالت سے
ہمارے مولوی صاحب
خدا رکھے نمازِ حق ادا کرنے چلے ہیں
خداوندِ دو عالم سے دغا کرنے چلے ہیں

یہ انداز اور لہجہ ان کا خاص امتیاز ہے اور یہ ترقی پسندوں سے زیادہ ظفر علی خاں کی سی جرأت اظہار کا مظہر ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ظفر علی خاں سے بھی بخش دو قدم آگے نظر آتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔

اور پھر ایک اور بات بھی ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ بخش لائلپوری کا رشتہ کسی شعری قبیلے سے جوڑا جائے۔ اور انہیں کسی دبستاں سے وابستہ کیا جائے؟

سچی بات یہ ہے کہ بخش لائلپوری اپنی ذات میں خود ایک دبستاں ہیں۔ وہ ان شاعروں میں سے ہیں جو اپنی راہ خود بناتے ہیں۔ اور اس راہ پر سب سے پہلے خود اپنے نقوش پا ثبت کرتے ہیں۔

ان کا پہلا مجموعہ کلام ''لہو کا خراج'' تمام تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا قریب قریب ہر شعر سرمایہ داری، جاگیرداری اور غریبوں کے استحصال کے خلاف ایک پرزور احتجاج ہے۔ یہ احتجاج جب شعر کی صورت اختیار کرتا ہے تو مقتل، سولی، ظلمت، صلیبِ شہر، فصیلِ شہر، شہرِ ستم، شہرِ جنوں، فقیہِ شہر، فصیلِ شب، دیوارِ شب، شجر، زنجیر، طرہ و دستار، فراز دار، اذان، جگنو، نمو جیسے استعارے اس میں رنگ بھرتے ہیں۔

ان میں سولی، دار و رسن، زنجیر وغیرہ ایسے استعارے ہیں۔ جو بخش کو شعری ورثہ میں ملے ہیں۔ پتھر، شہر شجر وغیرہ جدید شعراء کے ہاں بھی عام ہیں۔ لیکن اذان، شہر ستم، فراز دار بخش لائلپوری کے اپنے تراشیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے قبل اگر یہ کبھی استعمال ہوئے بھی ہیں تو اتنے نمایاں نہ تھے۔ ''نمو'' کو بھی جس طرح بخش نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ اور اپنے کہے کو واضح کرنے کے لئے جس انداز میں اس کو استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد یہ استعارہ بھی انہیں کا ہو گیا ہے:

اس غنچۂ خیال کا ذوقِ نمو تو دیکھ
جس کو خزاں کی گود میں کھلنے کی آس ہے

ذوقِ نمو کی آگ سے پتھر پگھل گئے
پائے سفر کے سامنے رستہ نیا کھلا

چمن بدر تو کیا ہے کلی کلی کو مگر
چمن بدر کبھی ذوقِ نمو نہیں ہوگا

''لہو کا خراج'' کی غزلوں کے کچھ اور شعر جنہیں نظر انداز کرنا ناممکن ہے:

نہیں جو تابِ گویائی تو کوئی چیخ ہی نکلے
کہ سناٹے میں خاموشی ہماری بزدلی ہوگی

نہ پھول ہے، نہ کہیں رنگ ہے نہ رعنائی
اگے ہیں بخش گلستاں میں اب شجر کیسے

کبھی نہ جانا کہ زندوں پہ کیا گزرتی ہے
فقیہِ شہر سجاتے رہے مزار بہت

ان کی خواہش ہے کہ چپکے سے مٹا دیں ہم کو
اور یہاں ضد ہے کہ منصور بنایا جائے

کہاں پہ مر گئے غسّالِ عصرِ حاضر کے
ہر ایک لاش یہاں بے کفن پڑی ہے ابھی

اکھاڑ پھینکے جو بڑھ کے صلیب و زنداں کو
ستم زدوں میں کوئی ایسا باہمہ نہ ملا

تیرہ شبی کے راج کی دھوم مچی ہے کو بکو
صبح کے اے مو، نوا بانگ سحر کو کیا ہوا

بخش لائلپوری کی دوسری کتاب ''زندان شہر'' قطعوں، نظموں، گیتوں اور رباعیوں کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی غزل نہیں۔ لیکن جو احتجاج ان کی پہلی کتاب کی غزلوں میں تھا، یہاں بھی ہے۔ اور خاصا شدید ہے۔ نظموں میں صرف تین ہمیں (سیہ فام، ارض فلسطین اور قحط ایتھوپیا) ایسی ہیں جہاں ان کی نظر پاکستان سے دور اٹھی ہے۔ ورنہ ان کی نگاہ میں اب بھی پاکستان اور وہاں کے غریبوں کا استحصال کرنے والے مختلف گروہ ہیں۔ ساری کتاب وطن عزیز کو زبوں حال بنانے والوں کے وجود کے خلاف ایک صد بانگ شعری مظاہرہ ہے۔ ایک نظم ''نذر ساحر لدھیانوی'' ہے۔ جو ساحر لدھیانوی کی ایک مشہور نظم کے ٹیپ کے مصرع ''یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے'' کی ایک طرح سے تضمین ہے۔ معلوم ہوتا ہے بخش لائلپوری کی شاعری ایک ایسے دور سے بھی گزری ہے جب ان پر ساحر لدھیانوی چھائے رہے۔ ان کی ایک اور نظم ''کارواں کو چھوڑ کر جب قائد اعظم گیا'' پر ساحر لدھیانوی کی نظم ''دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا'' کا پرتو ہے۔ بخش صاحب نے بات اچھی کہی ہے۔ لیکن انداز بیاں میں ساحر لدھیانوی کی جھلک ہے۔ اس طرح ان کی نظم ''ملا'' کو پڑھتے ہوئے بھی ساحر کی نظم ''ثنا خوان تقدیسِ مشرق کہاں ہیں'' یاد آنے لگتی ہے۔

کتاب کی نظموں میں ایک نظم کا عنوان ہے ''اشتراکیت'' اس کا آخری بند ہے:

مرا دل اشتراکی ہے، عوامی ہے مری فطرت
میں ہرگز پاسبانِ تختِ شاہی بن نہیں سکتا
مگر جو اتحادِ ملک و ملت کی مخالف ہو
میں ایسی اشتراکیت کا داعی بن نہیں سکتا

وطن سے محبت کا جذبہ بخش کی شاعری میں کچھ اس طرح رواں دواں ہے جیسے رگوں میں لہو۔

کتاب کا آغاز دو قطعوں سے ہوتا ہے۔ ان میں سے پہلے قطعہ کا دوسرا شعر ہے

وطن کے دشمنوں سے دوستی ہم کر نہیں سکتے
ہمارا ارضِ پاکستان پر ایمان کامل ہے

ان دو قطعوں کے بعد کتاب کی پہلی نظم ''دلوں میں وطن کی محبت جواں ہے'' عنوان سے ہے۔ اس کا آخری شعر ہے۔

میرے پیارے بچو یہ اپنی لگن ہے
ہمیں جان و دل سے بھی پیارا وطن ہے

پیار ابروزن ہمارا سے قطع نظر، کیا یہ نظم
بچوں کے لئے ہے؟ میں سمجھتا ہوں یہ ان نظموں میں سے
ہے جنہیں بچے، جوان، بوڑھے سب یکساں دلچسپی سے
پڑھ سکتے ہیں، گا سکتے ہیں، گنگنا سکتے ہیں اور بخش لائلپوری
کے ساتھ مل کر وطن عزیز کی یاد تازہ کر سکتے ہیں۔

اس ایک طرح کے ''قومی ترانہ'' کے
بعد نظم کی مختلف اصناف کے روپ میں بخش لائلپوری
کے اس تخلیقی سفر کی مسلسل جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جس کا
آغاز ان کی پہلی کتاب میں صرف غزل کی صورت میں
ہوا تھا۔ وطن کی یاد میں ہیں۔ لیکن ان یادوں کے ساتھ
تلخیاں بھی ہیں۔ جہاں پھول ہیں اس کے ارد گرد کانٹے
بھی ہیں۔ جن کی وجہ سے وطن کے چمن میں ایک عام
آدمی کا جینا اذیت ناک ہو رہا ہے۔

کچھ نظموں کے کچھ حصے ملاحظہ فرمائیں

اہلِ پاکستان کا حال زبوں تو دیکھئے
اک اندھیری کوٹھری میں سب کی جانیں بند ہیں

مسند خاطر باہم جھگڑے
ارضِ وطن کے ٹکڑے ٹکڑے
چور اچکے غاصب رہزن
قوم کی امیدوں کا مدفن
گاندھی اور نہرو کے سپنے
سچ کئے ہیں جرنیلوں نے

●

حالی کے مسدس کو دہرا
اقبال کے بھی اشعار سنا
بھر بھر کے خودی کے جام پلا
لوگوں کو گراں خوابی سے جگا
خود عیش کے بستر پہ سو جا
(تو لیڈر ہے دنیا کو بتا)

●

پائے سفر میں حلقۂ زنجیر دیکھ کر
ایسی لگی ہے چوٹ کہ دل لخت لخت ہے
اپنے ہی گھر میں قید رہو گے کہاں تلک
نکلو سڑک پہ دوستو چودہ اگست ہے
(چودہ اگست)

●

یہ پنہ گاہِ ستم تعزیر سے آزاد ہے
وحدتِ ملت کا ہر قاتل یہاں آباد ہے
اس قدر برہم ہے تیرے سنگ مرمر کا مزاج
جسمِ پاکستان سے دن رات مانگے یہ خراج
(اسلام آباد)

●

رہبروں کے بھیس میں آئے کئی عیار بھی
آمریت کے ثناخواں حاشیہ بردار بھی
چاہِ رسوائی میں ڈوبے قوم کے غدّار بھی
مسندِ ملت پہ ہر مکارِ دوراں جم گیا
(کارواں کو چھوڑ کر جب قائداعظم گیا)

●

مسجد میں درس فقیری کا
حجرے میں عیش پرستی کا
ہر دین مبیں کی مسند پر
ہے دیوؤں کی خرمستی ہے
یہ ملا جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
صدیوں کے پرانے معبد پر
اک دنیا نئی آباد کرو
(ملا جی کی بستی)

مانگتے ہو تم مکاں یوں سر چھپانے کے لئے
سر چھپانے کے لیے جب ٹوپیاں موجود ہیں
(وردیاں موجود ہیں)

پیلر ہیں جلادی کے
ماہر ہیں استادی کے
صامن ہیں بربادی کے
قاتل ہیں آزادی کے
مفتی واعظ اور ملا
پاکستان کا مطلب کیا
مارشل ما پہ مارشل لا
(پاکستان کا مطلب کیا)

یہی عالم قطعات، رباعیات اور گیتوں کا ہے۔ بخش صاحب کی زد میں قوم کے رہبر قوم کے جرنیل واعظ اور ملا سبھی آگئے ہیں۔ انہوں نے کسی کو نہیں بخشا۔ ایک قطعہ ہے:

جناب شیخ نے مسجد بنا کر اہل سنت کی
بصد شانِ فضیلت اپنے خطبے میں یہ فرمایا
میں اس کو کاٹ کر اپنے عمامے میں چھپا لوں گا
بنا ''سنت'' کوئی نزدیک مسجد کے اگر آیا

ایک گیت کے بول ہیں

سندر خوشہ ڈالی کا
کھا گیا کنبہ مالی کا

اس گیت کو چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی غزل بھی کہا جاسکتا تھا۔ لیکن جناب بخش نے اسے گیت کا عنوان دیا ہے۔ ممکن ہے۔ اسے گیت کہنے کی وجہ یہ ہو کہ اس کتاب میں غزلیں نہیں ہیں۔ اگر وہ اسے غزل کہتے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے نامحرموں کے درمیان خواہ مخواہ کوئی ''پردہ نشین'' نقاب سرکا کر آبیٹھی ہو لیکن شاید اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار جھومتے گاتے اور ناچتے تھرکتے ہوئے گیتوں میں آسانی سے گھل مل جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اللہ ہی اب حافظ ہے
لالہ رخوں کی لالی کا
اسلامی اخباروں میں
چرچا ہے دجالی کا

بک گیا کھوٹی دمڑی میں
رانجھن ہیر سیالی کا
کھل گیا حال فقیروں کا
صورت مونچھوں والی کا
منصف بن کر بیٹھ گیا
ہر اک بینگن تھالی کا
شہر میں سکہ چلتا ہے
جرنیلوں کی سالی کا

بخش لائلپوری کے تیسرے مجموعہ ''باد شمال'' میں کوئی ایسی پابندی نہیں کہ صرف غزلیں ہوں یا دوسری اصناف سخن ہوں۔ لیکن غزلیں نہ ہوں۔ تاہم وطن کے پھول اور کانٹوں کا ذکر یہاں بھی اپنے پورے زور و شور سے ہے۔ کتاب کی ابتدا ''دعا'' سے ہوتی ہے جس کا عنوان ہے۔ ''یارب ''۔ اس کا ایک شعر ہے۔

جو بیالیس برس سے ہے پڑا بانجھ کی مثل
میرے مولا کبھی اس پیڑ کو بھی پھل دینا

اس دعا کے نیچے تاریخ بھی تحریر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت مانگی گئی تھی جب پاکستان کی عمر بیالیس سال تھی۔

کتاب کی ابتدا ہی میں ''دعا'' کے عنوان سے ایک اور دعا بھی ہے۔ جو خاصی طویل ہے۔ اور اس کا ہر لفظ اور ہر مصرع پڑھنے والے کے دل پر کچھ اس طرح اثرانداز ہوتا ہے کہ وہ لکھنے والے کا پورے طور پر شریک حال ہو جاتا ہے۔ درد اور اثر میں ڈوبی ہوئی یہ دعا کتاب کے نو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ آٹھویں صفحہ پر یہ دعا اس طرح ہے:

اے خدائے خشک و تر
تیری بارگاہ میں جھک رہی ہے ہر نظر
سر بہ خم ہے اک جہاں
سجدۂ خلوص میں
اٹھ رہے ہیں اپنے ہاتھ
اب دعا کے واسطے
اس کٹھن کے دور میں
رحمتوں کی اک نظر
زندگی کے دشت پر
بھیج دے تو اس طرف
اک ہوائے تازہ تر
اک رسولِ خوش کلام
اک مسیحِ معتبر

آخری دو مصرے پڑھتے ہوئے دھچکا سا لگا۔ کیا خدا سے یہ دعا مانگنا کہ وہ اک رسول خوش کلام بھیج دے خدا کے آخری رسولؐ کے مرتبہ پر چوٹ نہیں؟ اسی طرح خدا سے ''اک مسیح معتبر'' کی فرمائش سے بھی یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شاید شاعر اس مسیح کو معتبر نہیں سمجھتا جس کی پیدائش کو عنقریب دو ہزار سال ہونے والے ہیں۔

بڑے بڑے شاعروں نے حتیٰ کے اقبال اور غالبؔ نے بھی اللہ سے چہل بازی کی ہے۔ یہ بھی تو ایک شاعر ہی کا کہنا ہے کہ "باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار"

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعا لکھتے ہوئے شاعر کے ذہن میں جذبات کچھ اس طرح متلاطم تھے۔ اور خیالات کچھ ایسی روانی سے الفاظ کی صورت میں ڈھل رہے تھے کہ شاعر کا "گفتار کے اسلوب" پر قابو نہ رہا۔ اور اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اپنی "گل افشانیٔ گفتار" میں اس کی زباں قلم سے کوئی ایسی بات بھی نکل گئی ہے جو بہتوں کے دل پر گراں گزرے گی۔ اور جو یقیناً شاعر کا مقصد نہ تھا امید ہے بخش لائلپوری کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس طرف توجہ دیں گے۔ اور شریر الفاظ پر نظر ثانی کریں گے۔ ؎

ان کے یہ تھے اور اب تک کے آخری مجموعے کا نام ہے "ابھی موسم نہیں بدلا" تیسرے مجموعے نظر ان میں کچھ غزلیں، نظمیں، قطعات اور رباعیات ہیں۔ ایک نظم "ابھی موسم نہیں بدلا" سے نام لیا گیا ہے۔ نظم کے کچھ مصرعے پیش کر رہا ہوں

ہمارے گھر کے ہر ایک بام و در میں
عداوتی پھر رہی ہے فوج چوہوں کی،
یہ چوہے جو وزیروں شاہی کت کے

اماموں کی غلامانہ سیاست کے
ریاکارانہ حربوں میں یگانہ
اور یکتا ہیں
کہ جن کی گردنوں میں تمغۂ لعنت
لٹکتا ہے بدیسی حکمرانوں کی
اطاعت کا
کہ یہ تمغہ فقط جاگیر دارانہ وراثت کا
عطیہ ہے جو نسلاً منتقل ہوتا رہا
ان کو فرنگی بادشاہوں کے وظیفہ خوار آبا سے

اور اس خاصی طویل قریب سات صفحوں پر پھیلی ہوئی نظم کے آخری مصرعے ہیں۔

کسی نادیدہ خوش فہمی میں مت رہنا
مشیرانِ تشدد کا فسوں اب تک
نہیں ٹوٹا
ابھی فکر و نظر کا زاویہ
ہرگز نہیں بدلا
ہوائے وقتِ ناہنجار کا
سرگم نہیں بدلا
دعائیں مانگتے رہنا
ابھی موسم نہیں بدلا

مجموعہ کی ایک غزل کا ایک شعر بھی کتاب کے نام کی وضاحت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے:

مصنف کا یہ [illegible] اور [illegible] کے [illegible] معنی میں استعمال کیا ہے [illegible] اصطلاحی معنی میں۔

ابھی بدلے نہیں موسم کے تیور
ہوا میں بوئے دلداری نہیں ہے

ہمارے شاعر کے تیور بھی نہیں بدلے۔ ان کے انداز بیان میں وہی طنطنہ ہے جو روز اول سے ان کی خصوصیت رہا ہے۔ ان کی تیسری کتاب کی ایک غزل کا شعر ہے:

وہ مد و جزر بپا ہیں ہماری آنکھوں میں
ہم اک نظر سے سمندر اچھال دیتے ہیں

یہ شعر بخش لائل پوری کے لہجے، انداز اور ذہنی رویہ کی پوری ترجمانی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

پاکستان سے برطانیہ میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ آئے ہوئے ہیں۔ جو یہاں کی شہریت اختیار کر کے اب یہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان سب کا وطن کی مٹی سے رشتہ اب بھی بہت مضبوط ہے۔ بیشتر وطن کو یاد کرتے ہیں۔ وطن کے حالات سے اپنے آپ کو باخبر رکھتے ہیں۔ وہاں سے کوئی خوشی کی خبر آئے تو خوش ہوتے ہیں۔ اداسی کی خبر آئے تو اداس ہو جاتے ہیں۔ ان آئے ہوؤں میں شاعر بھی ہیں۔ جو کسی نہ کسی طور پر اپنی کسی نظم یا کسی شعر میں وطن کو بھی یاد کر لیتے ہیں۔ لیکن ان میں ایک بھی نہیں جس نے بخش لائلپوری کی طرح اپنی پوری شاعری وطن کے لئے وقف کر دی ہو۔ بخش لائلپوری کے چار مجموعے چھپ چکے ہیں۔ اور ان میں صرف گنتی کی چند نظمیں (ایتھوپیا، فلسطین) اور گنے چنے اشعار ہی ہوں گے جن میں پاکستان کے علاوہ کوئی اور بات ہو۔ بخش لائلپوری کا قریب قریب سارا کلام وطن کی یاد میں ایک نوحہ ہے۔ ایک فریاد ہے۔ جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ان کی تمام کتابوں میں بکھری ہوئی ہے۔ پھیلی ہوئی ہے۔

بخش لائلپوری بلاشبہ ہمارے محنت کش طبقے کے ترجمان ہیں، لندن میں قیام پذیر ہیں اور روزگار کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن بھی کرتے ہیں۔ بخش نے دستکاری بھی اپنی کوشش اور طلب سے سیکھی، شاعری بھی اپنے مطالعے اور لگن سے۔ اس نے اب اپنی حدیثِ دل بہت ہی موزوں عنوان سے ترتیب دی ہے۔ مجھے اس مجموعے کے مطالعے سے بہت مسرت بھی حاصل ہوئی ہے اور لطف اندوز بھی ہوا ہوں۔ اس لئے کہ یہ ایک حساس دل کی سچی آواز ہے۔ جس کا نوا سنج نہ صرف عصری تقاضوں سے بہرہ ور ہے بلکہ اپنی پر خلوص فکر اور جذبہ کے اظہار کو بھی مقدم سمجھتا ہے۔ بخش نے اردو شاعری کی مروّجہ ادبی زبان استعمال کی ہے اور ان کے کلام کا مزاج عوامی شاعری کا ہے۔ سادگی، بے باکی، صداقت اور بے ساختگی جو اس نوع کی شاعری کا خاصہ ہے بخش کے کلام میں آپ کو ملے گی اور لطف دے گی۔

"فریاد کی کوئی لے نہیں ہے"

فیض احمد فیض

لہو کے خراج کا شاعر

فارغ بخاری

یوں تو شاعر کا کام کبھی آسان نہیں تھا، لیکن اب کچھ زیادہ ہی گراں ہو گیا ہے۔ خصوصاً غزل جو صدیوں تک فارسی میں کہی جاتی رہی اور اب تین سو برس سے اردو شعراء نے اس کے تمام تر امکانات کی مسافت میں فکر و نظر کے گھوڑے دوڑا دوڑا کر کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جسے اپنے اشہبِ تخیل کی جولانیوں سے محروم رکھا ہو۔ اس طویل عرصے میں صرف اردو کے اساتذہ شعراء نے اتنی غزل کہی کہ اگر آئندہ تین صدیوں تک غزل نہ کہی جائے تو شاید کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن اسے غزل کا معجزہ کہیے یا شعراء حضرات کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعجاز سمجھیے کہ اس کے باوجود آج بھی غزل اسی ذوق و شوق سے کہی جا رہی ہے بلکہ موجودہ دور کے شعراء نے تو جدید حسیت اور ندرتِ فکر سے اس کے امکانات کو مزید وسعتوں اور نئی جہتوں سے متعارف کر کے ایک دفعہ پھر اس کی کشور کشائی کے پرچم لہرا دیے اور اس کی شہرت اور ہردلعزیزی کے ڈنکے بجا دیے ہیں۔

تاہم اب پہلے کی نسبت غزل کا کام خاصہ مشکل ہو گیا ہے۔ خصوصاً ان شعراء کے لئے جو مضمون آفرینی میں بھی اور رنگِ اظہار میں بھی اپنی انفرادیت کا جادو جگانے پر یقین رکھتے ہیں اور تقلیدی مخلوق کے جمِ غفیر میں اپنی شناخت کرانے کا جنون لے کر اس کٹھن کے سفر پر نکلے ہیں۔

آج ہم غزل کے جس نئے مجموعے پر تبصرہ کرنے چلے ہیں اس کا نام "لہو کا خراج" ہے اور اس کا خالق آپ کا جانا پہچانا معروف شاعر بخش لائل پوری ہے۔ بخش گزشتہ تین دہائیوں سے لندن میں ہے۔ پہلے ملازمت اور بعد ازاں کاروبار کے سلسلے میں مقیم ہے۔ وہ کہنہ مشق ہونے کے ساتھ ساتھ فنِ شعر کا شعور بھی رکھتا ہے، اور زبان و بیان کے ہنر سے بھی بہرہ ور ہے۔ نیز وسیع تر ذوقِ مطالعہ نے بھی اسے غزل کا مزاج داں بنا دیا ہے۔ یہ ایسی خوبیاں ہیں جو غزل کے لئے ناگزیر ہیں۔ اور اس کے شوقِ فراواں نے ان کے حصول میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا۔ یہ اس حقیقت کا فیض ہے کہ وہ یہاں کے سربرآوردہ شعراء میں نمایاں مقام پر فائز نظر آتا ہے۔

بخش لائل پوری ذہنی اعتبار سے اور پیدائشی طور پر ترقی پسند نظریات کا حامل ہے۔ شاید اس لئے کہ اس نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی اور رنگ و نسل کے امتیاز اور طبقاتی تفریق کو اسے نہایت قریب سے دیکھنے اور اس سے متاثر ہونے کا موقع ملا۔

اپنے آغاز شعور ہی سے وہ پروگریسو ادبی تحریک سے وابستہ رہا۔ اس نے ہوش سنبھالا تو برصغیر میں انگریز حکمرانوں کے خلاف تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ حریت پسندوں پر ملک کے ہر حصے میں گولیاں چل رہی تھیں۔ تمام عوامی رہنما جیلوں میں بند تھے اور غلامی کی لعنت سے نجات پانے کے لئے مظاہرین کے جلسے جلوسوں پر ظالمانہ فائرنگ کرنا آئے دن کا معمول بن چکا تھا۔ بخش نے اس ماحول میں پل کر جو کچھ سیکھا آگے چل کر قیام پاکستان کے بعد اس زہر میں جو دور غلامی کے واقعات و حادثات سے اس کے خون میں سرایت کر گیا تھا اپنے فیوڈل حکمرانوں کے سفاک رویوں نے اس میں مزید اضافہ کیا اور پہلی دفعہ یہ فلسفہ اس کی سمجھ میں آیا کہ ملک کے عوام کی تباہی اور ان کی تمام تر مشکلات و مصائب کا باعث سرمایہ دارانہ نظام ہے اور جب تک اس آہنی دیوار کو مسمار نہیں کیا جائے گا حالات کا کوئی روشن پہلو کبھی نظر نہیں آئے گا۔ وہ شروع ہی سے عوامی تحریک سے وابستہ رہا اور طبقاتی تفریق، اندھے عقائد، جہالت اور غربت کے خلاف قلمی جہاد کرتا رہا ہے۔

بخش نے غزل کے میڈیا کو اس لئے اظہار کا ذریعہ بنایا کہ وہ اس کے نزدیک ایک عوامی صنف سخن ہے۔ ویسے اس نے نظمیں، قطعات، رباعیات، یعنی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل سے اسے طبعی مناسبت رہی اور اس نے غزل میں اپنے لئے ایک منفرد انداز اپنانے میں بھی اس حد تک کامیابی حاصل کی ہے کہ کم از کم برطانیہ جسے اب اردو زبان کے تیسرے مرکز کی حیثیت حاصل ہے، کے پر ہجوم شعراء میں وہ اپنی الگ پہچان ضرور رکھتا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

عجب طرح کا یہ دور ستم اسیری ہے
میں پوجتا ہوں جسے وہ مرا خدا بھی نہیں

سرکشیدہ دوستو تازہ لہو درکار ہے
ہر گھڑی بجھتے چراغوں کی ضیا کے واسطے

وہ خطاہر ایک دل کا مدعا بن جائے گی
ہم رسن بستہ کھڑے ہیں جس خطا کے واسطے

ستم کے مارے نہ جانے پکارتے ہیں کسے
کہ اس زمیں پہ تو اے بخش آسماں بھی نہیں

بیسویں صدی کے ربع اول میں اردو شاعری کے پرانے ڈھانچے کو بدلنے کا عمل شروع ہوا۔ مغرب میں اس تحریک کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا، انگریزی عملداری کے ساتھ برصغیر میں مغربی ہوائیں آنے لگیں اور یہاں انگریزی زبان کا چلن ہوا تو مغربی لٹریچر سے بھی یہاں کے لکھنے والوں کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ عظمت اللہ خاں نے اردو شاعری میں مغربی جدت طرازی کو رواج دینے کی طرح ڈالی، لیکن اس کی یہ تحریک نظم کی حمایت اور غزل کے حق میں ایک مخالفانہ نعرہ بن گئی۔ علاوہ ازیں اس نے اس تبدیلی کو بھی صرف ہئیتی تجربوں تک محدود

رکھا، اور عملی طور پر اپنی جدید شاعری کے ثبوت میں کوئی قابل ذکر تخلیق پیش نہ کر سکا۔

۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر اور اس کے ساتھیوں نے لندن میں ترقی پسند مصنفین کا سنگ بنیاد رکھا جو اردو ادب کی تاریخ میں ایک انقلابی قدم تھا اور اگلے سال ۱۹۳۶ء میں برصغیر میں انجمن کی تشکیل کی۔ یہ اردو شاعری ہی کا نہیں بلکہ برصغیر کی تمام زبانوں کے ادب کی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس لئے متحدہ ہندوستان میں جب لکھنؤ میں اردو کے اولین نامور افسانہ نگار پریم چند کی صدارت میں اس انجمن کی داغ بیل ڈالنے کے لئے اجلاس ہوا تو اس میں اردو کے تمام سرکردہ مشاہیر اہل قلم نے شمولیت کی اور سب نے اتفاق رائے سے پوری طرح اس کے اغراض و مقاصد کو سراہا اور انہیں آگے بڑھانے کی بھرپور جدوجہد کی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے آغاز کے بعد شعراء میں سائنٹیفک نکتۂ نظر نے رواج پایا۔ اس تحریک نے نئی شاعری کی بنیاد حقیقت پسند نظریات پر رکھی اور اردو غزل کو زلف و رخ کے تنگ و تاریک ماحول سے نجات دلائی اور اسے عقائد و توہمات کی دلدل سے نکالا اور ہمہ گیری و آفاقیت سے روشناس کرایا۔ اسے نئی روشنی کا سامنا کرنے کا حوصلہ دیا۔ اس میں تازہ ہوا میں سانس لینے کی جرأت پیدا کی۔ اسے طلسم ہوش ربا سے آزاد کرا کے عوامی خواہش کا حامل بنایا۔

برصغیر میں ترقی پسند تحریک نے ہمہ جہت ترقی کی۔ کیوں کہ خلاق جیسے قلم کاروں کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور تھی۔ اس لئے سارے ملک میں عرصۂ دراز تک افسانہ، ناول، ڈرامہ، شاعری حتیٰ کہ ریڈیو، فلم اور صحافت پر بھی ترقی پسند ادیب ہی چھائے رہے۔ اس طرح تقسیم ملک کے بعد بھی۔ پاکستان اور بھارت میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی قیادت اب تک چلی آتی ہے، اور اس تحریک کے اثرات ادب پر برابر مرتب ہو رہے ہیں۔

بخش لائل پوری اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ ادبی دنیا میں آتے ہی ترقی پسند ماحول میسر آیا اور اس ماحول میں اس کی شاعری کا آغاز ہوا۔ لیکن لندن آنے کے بعد اسے ترقی پسند لٹریچر تو پڑھنے کو ملتا رہا البتہ ترقی پسند ماحول نصیب نہ ہوا (کیوں کہ اس وقت آج کی طرح یورپ کی طرف ہمارے لوگوں کے آنے کا اتنا چلن نہیں تھا) یہ اس کے جبلی جوہر اور ذاتی ترقی پسند سوچ کا فیض ہے کہ اس نے اپنی شاعری کے آغاز ہی سے ایسے رنگ کو اپنایا جس میں اس نے نہ صرف اپنے تخلیقی جوہر دکھائے بلکہ یہاں کے اکثر نوجوان شعراء کو بھی متاثر کیا اور ان کی رہنمائی بھی کی۔

یہاں اس وقت برطانیہ میں گنتی کے چند شاعر تھے جو گل اور بلبل اور زلف و رخ کے دائرے سے آگے سوچ ہی نہیں سکتے تھے اس وقت جب بخش نے غزل کے یہ اشعار کہے ہوں گے۔

لالہ و گل پہ دل و جان لٹانے والو
خشک پتوں کو بھی سینے سے لگایا جائے

وحشت کے ڈرامے جب دیکھیں تو یہ لگتا ہے
انساں کا درندوں نے آئین لکھا ہوگا

باندھی ہے جب بھی نیتِ منزل کبھی تو بخشؔ
رہبر ہماری راہ میں دیوار بن گئے

آستیں میں ہیں چھپائے ہوئے خنجر جس نے
کیوں کر اس شخص سے اب ہاتھ ملایا جائے

توان قدامت پرست شعراء کو کتنا اچنبھا ہوا ہوگا کہ یااللہ یہ کیسی شاعری ہے۔ کیوں کہ جو قدریں انسانی ذہن میں راسخ ہو جائیں تو پھر ان سے روگردانی ایک اچھا خاصا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس زندہ، متحرک اور حقیقت پسندانہ شاعری سے ان کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ مگر یہ عمل یا پروسس (PROCESS) غیر محسوس طور پر ہوا بقول مجروح سلطانپوری ۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

آج کا وہ کاروانِ فکر و نظر دیکھا جا سکتا ہے جو پورے برطانیہ میں پروان چڑھ رہا ہے۔ بخشؔ لائلپوری کا لہجہ کھردرا ضرور ہے کیوں کہ وہ عوامی شاعر ہے۔ وہ عوامی دکھ درد، آسوں اور پیاسوں کا شاعر ہے۔ وہ اپنے ماحول اور ملکی حالات سے چشم پوشی کبھی نہیں کر سکتا۔ وہاں جو بے انصافیاں ہو رہی ہیں جمہوری ادارے ختم کر کے آمریت کی جو بدترین روایت قائم کی جا رہی ہے اظہار صداقت کے لئے زبان کھولنے والوں کی زباں بندی، گرفتاریاں، کوڑے اور پھانسیوں کی سفاکانہ سزائیں دیکھ کر خاموش رہنا کسی حساس انسان کے لئے ممکن نہیں اور بخشؔ لائلپوری تو ایک انقلابی شاعر ہے اور اس ادبی تحریک کا ہم نوا ہے جس کا منشور ہی حقیقت پسندی ہے۔ وہ اپنی قوم کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کو ماحول کی اذیتوں میں مبتلا دیکھ کر پکار اٹھتا ہے۔

ہر ایک قدر کو رسوائیاں ملیں ان سے
عجیب سا رہا کردار دیں پناہوں کا

ہم ازل سے سن رہے ہیں آہنی قدموں کی چاپ
گھر کا دروازہ ہمیں زنداں کا دروازہ لگے

وہ خطا ہر ایک دل کا مدعا بن جائے گی
ہم رسن بستہ کھڑے ہیں جس خطا کے واسطے

سب لوگ گھروں میں ہیں محصور اسی ڈر سے
دہلیز پہ بارودی آسیب کھڑا ہوگا

تنگ اس پر اور بھی انصاف کا دامن ہوا
جب بھی فریادی نے اپنے ہاتھ پھیلائے بہت

سجاؤ بخشؔ سبیلیں ہوائے تازہ کی
فضائے شہر وفا میں گھٹن بڑی ہے ابھی

گھر میں بھی اک خوف کا عالم ہے جنگل کی طرح
سہم کر لپٹے ہوئے ہیں لوگ دروازوں کے ساتھ

اندر سے زخم زخم ہیں باہر کی چوٹ سے
وہ لوگ جن کے جسم پر کوئی نشاں نہیں

یہ مت سمجھ کہ سیاہی کا قلعہ ٹوٹ گیا
سحر کے سامنے دیوار شب کھڑی ہے ابھی

پھر وہ برطانوی جمہوریت کے آزادانہ ماحول میں رہ کر جب اپنے وطنِ عزیز کی تباہی و بربادی کا اس سے موازنہ کرتا ہے تو کس قدر دکھ سے کہتا ہے

ابھی دنیا کے ہر آباد گھر کو دیکھ کر
بخش اپنے گھر کی بربادی کا اندازہ لگے

اور کس حسرت سے کہتا ہے۔

آشیانوں کو پلٹ جائیں پرندوں کی طرح
اپنے گلشن سے اگر موت کا سایہ جائے

بخش لائل پوری انقلابی شاعر ہے، اسے فن شاعری سے بھی عشق ہے۔ لیکن اپنے وطن کی آزادی اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ جہالت، غربت، اندھے عقائد، طبقاتی تفریق اور نسل و رنگ کی درجہ بندیوں کے خلاف صف آرا ہے۔ وہ ایک ایسا سوشل نظام چاہتا ہے جس میں عدل و انصاف اور مساوات ہو، سچی جمہوریت ہو، اور دنیا کے تمام انسان ہوا، پانی اور روشنی کی طرح بہتر زندگی کے تمام تر ذرائع سے فیضیاب ہو سکیں، ایسے سوشل نظام کی وہ پیش گوئی بھی کر سکتا ہے۔

پئیں گے ہم بھی اسی دستِ ناز سے اب کے
شریکِ جشنِ طرب تو ہی تو نہیں ہوگا

چمن بدر تو کیا ہے کلی کلی کو مگر
چمن بدر کبھی ذوقِ نمو نہیں ہوگا

بخش لائلپوری نئی شاعری کی بنیادیں ترقی پسند تحریک کے منشور کے مطابق مادی حقیقت پسندی کے نظریات پر استوار کرنے کا قائل ہے اور اسی لئے اس نے اپنی شاعری کے لئے اس منشور انسانی کو مشعل راہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

جہاں میں ذکر سدا خنجر عدو کا بھی ہو
رسن کے ساتھ بیاں حادثہ گلو کا بھی ہو

کرن حیات کی بجھتی نہیں قضا سے کبھی
اگر شعور میں روشن دیا نمو کا بھی ہو

رُتیں بدلتی نہیں ماتم خزاں سے کبھی
لبوں پہ ذکر ذرا بخش رنگ و بو کا بھی ہو

بخش کے ہاں جوش کی طرح گھن گرج تو نہیں تاہم وہ خود کلامی کا بھی قائل نہیں، بلند اور موثر لہجے کا شاعر ہے اس کے نظریات کی طرح اس کی غزل میں معنوی لحاظ سے بھی اور فنی اعتبار سے بھی کوئی جھول نہیں۔ وہ صاف اور کھرا انسان ہے اور منافقت نہیں جانتا، اور اسی طرح اس کی غزل بھی اس کے صاف ستھرے خیالات کی بے باکی ترجمان ہوتی ہے۔

ہم ظلمتِ جہاں میں بھی صبحِ غزل ہوئے
آنکھوں میں انقلاب کے روشن کنول ہوئے

لہو دے کر نہالانِ چمن کو
لباسِ رنگ و بو پہنا گیا ہوں

وہ ہر ترقی پسند سوچ رکھنے والے فن کار کی طرح حالات سے مایوس نہیں بلکہ روشن مستقبل کا اسے پورا یقین ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عوام کی فتح ہو کر رہے گی، گو وقتی طور پر استحصالی اور طاغوتی طاقتیں کامیاب نظر آتی ہیں جو کہ اپنی اندھی طاقت کے بل بوتے پر سچائی کے پرچم کو سرنگوں کرنے پر اترا رہی ہیں لیکن قانونِ فطرت کے مطابق دھوکا، فریب اور جھوٹ زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ ظلم و جبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور جب کوئی آمر مطلق بزعم خود اپنی وقتی فتوحات پر بھول کر خدائی کا دعویٰ کرنے کی احمقانہ حرکتوں پر اتر آئے تو پھر اس کا انجام بھی نمرود اور فرعون کی طرح ایسا عبرتناک ہوتا ہے جس سے ایک زمانہ پناہ مانگتا ہے کیوں کہ گردشِ وقت کبھی کسی ظالم کو معاف نہیں کرتی۔ بخش ان حقائق کا پورا پورا عرفان و ادراک رکھتا ہے۔ اس لئے وہ درخشندہ مستقبل کی نوید سنا کر عوام کے شکست خوردہ حوصلوں کو بلند کرنے کی سعی کرتے ہوئے کہتا ہے

رُت بھی بدلے گی گلستاں میں صبا بھی آئے گی
بند کلیوں کو تبسم کی ادا بھی آئے گی
ذہن کے در بند رکھو گے تو گھٹ جائے گا دم
کھڑکیاں کھولو گے جب، تازہ ہوا بھی آئے گی

نہیں جو تابِ گویائی تو کوئی چیخ ہی نکلے
کہ سناٹے میں خاموشی ہماری بُزدلی ہوگی

بخش ذہین اور باشعور انسان ہے۔ اس کے ذہن اور اس کی سوچ میں کوئی الجھاؤ نہیں، وہ ایک واضح سمت کی طرف عزم و ثبات کی طمانیت کے ساتھ رواں ہے، اس کی نظر زندگی کی وسعتوں، پہنائیوں اور اتار چڑھاؤ کا پورا ادراک رکھتی ہے، اس کی نگاہیں اپنے گرد و پیش کا کلی طور پر احاطہ بھی کرتی ہیں اور عالمی حالات سے بھی غافل نہیں۔ وہ سائنسی عروج کو بنی نوع

انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کا معجزہ سمجھتا ہے اور چاند تاروں، سیاروں اور خلا کی تسخیر کو انسانی سوچ کا اعجاز گردانتا ہے، وہ اس دور کو سائنسی اور ٹکنالوجی کے معراج کا دور خیال کرتا ہے جس پر اس کے نزدیک نسل انسانی جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ لیکن بڑی طاقتوں میں مسابقت کی دوڑ سے اسلحہ کی فراوانی اور NUCLEAR WAR یعنی ایٹمی جنگ کے آسیب کا خطرہ جو ساری دنیا پر منڈلا رہا ہے اس کے نزدیک سائنسی ترقی کا یہ تاریک پہلو آج پوری دنیا کا نہایت سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس تاریخی المیہ کو بخش لائلپوری نے بڑے ہی فن کارانہ انداز میں غزل کے اشعار میں پیش کیا ہے۔

اس غنچۂ خیال کا ذوقِ نمو تو دیکھ
جس کو خزاں کی گود میں کھلنے کی آس ہے
لرزیدہ کھڑکیاں بھی ہیں دیوار و در کے ساتھ
آتش فشاں پہ اب مرے گھر کی اساس ہے
مجھ کو سکونِ قلب کی اس گھر میں ہے تلاش
جس گھر کی اینٹ اینٹ پہ خوف و ہراس ہے

ہر دکاں پر بک رہے ہیں بم کھلونوں کی طرح
اور کھلونوں کے لئے بالک ترستے ہی رہے

روئے زمیں پہ ایٹمی قوت کا ہر نشاں
انسان کے عروج کا نقشِ زوال ہے

صبح کا پیغام جب بھی شب پرستوں نے دیا
اپنی آنکھوں میں بھیانک خواب لہرائے بہت

جسے ٹٹولا وہ یخ بستہ اک سمندر تھا
نمو کی آگ کا کوئی کہیں شرر نہ ملا

جو دن دہاڑے نگل جائے ہے مکینوں کو
کسی عدو کو بھی اے دوست ایسا گھر نہ ملے

شاعر پیغمبر نہیں، لیکن الہام اسے بھی ہوتا ہے اور مستقبل میں رونما ہونے والے خدشات و خطرات کا اس کی بصیرت کو القا ہو جاتا ہے۔ یہ تو ایک روشن حقیقت ہے کہ آج ایٹمی طاقتوں کی احمقانہ روش نے سارے عالم کو آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھا دیا ہے۔ کیا معلوم کب اور کس لمحے کوئی جنگی جنون میں بٹن دبا دے اور ساری دنیا بھک سے اڑ جائے۔

سب سے بڑا مسئلہ آج امن عالم کا مسئلہ ہے جس کی ضمانت کوئی بھی دینے کو تیار نہیں۔ ہر ایک یہی کہتا ہے کہ وہ پہل نہیں کرے گا، لیکن ادھر سے ابتدا ہوئی تو وہ سب کچھ کر گزرے گا، جہاں عالمی تباہی کے فیصلے اس قدر حساس موڑ پر پہنچ جائیں ظاہر ہے کہ وہاں کسی معمولی سی غلط فہمی سے بھی کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس خوف و دہشت کی فضا سے دنیا کس قدر سہمی ہوئی ہے۔ بخش نے اپنے دو شعروں میں اس خوف و دہشت کی فضا کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

چہروں کے خدّ و خال پہ رنگِ سکوت ہے
دل مضطرب ہیں قطرۂ سیماب کی طرح
پتے ہلے تو خوف سے چیخیں نکل گئیں
یہ زندگی ہے درد بھرے خواب کی طرح

ترقی پسند شاعر کی سب سے بڑی خوبی اور صفت خود تنقیدی ہے یعنی نہایت غیر جانبدارانہ طور پر اپنے فن کا جائزہ لیتے رہنا۔ اور اس پر تھرڈ پرسن کی طرح بے رحمی سے تنقید کرنا۔ بخش نے خود تنقیدی کا حق ادا کرنے میں جسارت سے کام لیا ہے۔

دریا رواں جہاں سے ہیں فکرِ جدید کے
ٹھہرے ہوئے ہیں ہم وہیں تالاب کی طرح

بخش لائلپوری نے اس شعر میں اپنے ملکی ماحول اور معاشرت کے ساتھ ساتھ فکری انحطاط کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ اور اگر اس نے اپنی ذات کے حوالے سے یہ بات کہی ہے تو پھر اس نے اپنے متعلق کچھ زیادہ ہی انکسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اسے فکرِ جدید کا نمائندہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس کے ہاں قدامت پرستی کے گلے سڑے نقوش بھی نہیں ملتے۔ کیونکہ وہ ہمارے بعد کی پود سے تعلق رکھتا ہے جس کا سکہ ابھی چل رہا ہے اور دربار بھی لگا ہوا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نئی نسل کا کارواں ان کے سر پر آ پہنچا ہے اور انہیں اپنی بساط سمیٹنے کے لئے کہہ رہا ہے۔ تاہم اس رسہ کشی میں ابھی خاصہ وقت لگے گا۔

اگرچہ شاعروں کو ادوار کے اعتبار سے تو نئے اور پرانے کی صفوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں نہ تو جبری ریٹائرمنٹ کا چکر چل سکتا ہے اور نہ ہی کوئی قانونی اور اخلاقی بندش ہے کہ فلاں عمر تک شاعری کی جائے اور اس کے بعد شاعر صاحب کوئی اور دھندہ اختیار کریں تاکہ آنے والی نئی پود کے شاعروں کو چانس دیا جاسکے۔ کیونکہ شاعری فی زمانہ کوئی سرکار دربار کی نوکری نہیں جس پر کوئی قید لگائی جاسکے۔ بلکہ سرکار دربار کی وابستگی کے دور میں بھی شعراء پر یہ قدغن نہیں عائد کی گئی، کیونکہ پختہ شاعری تو پچھلی عمر میں ہی ہوا کرتی ہے۔ آغازِ جوانی کا دور تو جذباتی ہوا کرتا ہے جس میں شاعر سے کسی قسم کی بڑی شاعری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ تمام بڑے شعراء میر تقی میرؔ۔ غالبؔ۔ اقبالؔ۔ جوشؔ اور فیضؔ نے اپنی وہ شاعری عمر ڈھلنے کے بعد ہی کی تھی جس نے میرؔ کو میرؔ، غالبؔ کو غالبؔ۔ جوشؔ کو جوشؔ، اقبالؔ کو اقبالؔ، اور فیضؔ کو فیضؔ بنایا۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہ بھی محض الفاظ سے کھیلنے کا نام نہیں، نہ ہی یہ ہوا میں پھول کھلانے کی جادوگری کا نام ہے۔ یہ تو—

ا۔ ظلمات میں روشنی کی کرن اگاتا ہے
ب۔ خوشیوں کے باغ سے قہقہے چراتا ہے۔
ج۔ شعر کا ڈھانچہ بنا کر اس میں ایسی روح پھونکنے کے عمل کا نام ہے جو اسے جاوداں بنادے۔

بعض شعراء حضرات محض لفظوں کی

شعبدہ بازی سے وقتی طور پر شہرت پاکر اترانے لگتے ہیں۔ یہ عارضی سپنے اکثر شعراء دیکھتے رہے ہیں جو حالات بدلتے ہی پانی کے بلبلے کی طرح ختم ہو جاتے ہیں۔ اصل چیز تو موضوع اور نظریہ ہے۔ لفظوں کا استعمال اور طریق اظہار بھی بہت اہم ہیں۔ شعر کو شعر یہی بناتے ہیں۔ ان کا عمل ثر بیت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن محض لفاظی شعر میں جان نہیں ڈال سکتی، زبان اور محاورے ہی کو طرۂ امتیاز سمجھ کر مشاعرے تو لوٹے جاسکتے ہیں لیکن ان کا تاثر دائمی نہیں ہوتا۔ اقبالؔ اور فیضؔ نے کبھی زبان دانی کا دعوی نہیں کیا، بلکہ ان پر اعتراضات ہی زبان کے سلسلے میں کئے جاتے رہے ہیں۔ انہوں نے پیام اور نظریات کو ہمیشہ اولیت دی اور زبان کو دوسرا درجہ دیا ہے، آخر یہ ہوا کہ معترض ختم ہو گئے لیکن اقبالؔ و فیضؔ زندہ و جاوید ہو گئے۔ اب تو اہل زبان کا جادو ٹوٹ چکا ہے۔ اردو اب کسی خطے کی زبان نہیں رہی، پورا برصغیر اس کی راجدھانی ہے۔ لکھنؤ، دہلی اور حیدرآباد کے لسانی مرکز کب کے اجڑ چکے ہیں اگر چہ بھارت میں اردو اپاہج ہو تے پر اب بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔ تاہم اس کے علاوہ اب تو اردو پاکستان کی بھی قومی زبان ہے۔ "پنجاب میں اردو"۔ "سندھ میں اردو" اور "سرحد میں اردو" کے عنوانات سے تقسیم ملک سے بہت پہلے پنجاب، سندھ اور سرحد والے بھی اردو کی جنم بھومی ہونے کے دعوے کر چکے ہیں۔ پاکستان کے چوتھے صوبے بلوچستان نے دعوی نہیں کیا، لیکن وہاں جاکر اردو کا چلن دیکھو تو کم از کم کوئٹہ تو چھوٹا سا دہلی لگتا ہے۔ مختصر یہ کہ زبان محض ذریعۂ اظہار ہے۔ مقامی زبانوں، پنجابی، سندھی، پشتو، اور بلوچی نے اتنے عظیم شاعر پیدا کئے ہیں کہ اب تک ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر ہے۔ یعنی زبان ہی سب کچھ نہیں۔ بڑی شاعری ہمیشہ سوچ، فکر، جذبہ اسلوب سے تخلیق پاتی ہے اور دلوں کو مسخر کرتی ہے۔

بخش لائلپوری کو زبان دانی کا کوئی دعوئ نہیں۔ زبان کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں بڑے بڑے تمام شعراء سے بھی سرزد ہوتی رہی ہیں۔ اس کے ہاں بھی ایسی فرد گزاشتوں کا احتمال ہو سکتا ہے۔ جنھیں میں ذاتی طور پر کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کی شاعری میں تازگئ فکر ہے یا نہیں۔ لہجے میں نیا رنگ اور آہنگ ہے یا نہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس میں جان ہے یا نہیں۔ اس نے کیا کہا ہے اور کہنے کا مقصد کیا ہے۔ شاعری برائے شاعری ہے یا شاعری برائے زندگی ہے۔ برائے مقصدیت ہے برائے فلاحِ انسانیت ہے۔ میرے خیال میں "لہو کا خراج" کے مطالعہ سے ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔

کار فرما جس پہ ہو جاگیردارانہ نظام
وہ زمیں فاقے اگلتی ہے کسانوں کے لئے

صورتِ منصور وہ سولی پہ لٹکائے گئے
جو رہے ہر دور میں زندہ اصولوں کی طرح

کوچۂ مومناں میں بندش ہے
کلمۂ حق زباں پہ لانے کی

ہر کوچہ رزم گاہ ہے دہشت پسند کی
اس شہرِ بے پناہ میں جائے اماں نہیں

جس سے ملایا ہاتھ تو محسوس یہ ہوا
اک بھیڑیئے کے جسم میں انساں کی کھال ہے

فاقوں کے کالے ناگ ہیں خرمن کے ڈھیر پر
جاگیر ہے زمیں ابھی جاگیردار کی

ان اشعار میں ایک ایسے نظام حیات کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے جسے صدیوں سے مٹھی بھر وڈیروں نے سوادِ اعظم یعنی غریب عوام پر مسلط کر رکھا ہے جو نسل در نسل زندگی کی تمام مراعات پر قابض چلے آرہے ہیں، جو محنت کشوں کی ساری کمائی ہتھیا لیتے ہیں اور انھیں زندہ رہنے کے لئے سوکھی روٹی تک نہیں دیتے۔

کہاں پہ مر گئے غسال عصرِ حاضر کے
ہر ایک لاش یہاں بے کفن پڑی ہے ابھی

دیارِ شام میں جو اہلِ حق پہ گزری تھی
دل و نظر میں وہی حشر کی گھڑی ہے ابھی

یہ موضوع بخش کی شاعری کے منشور کے طور پر اس کا نہایت مرغوب موضوع ہے۔ ہم کائنات کی بات کریں گے تو انسان کا ذکر ضرور آئے گا، کیونکہ انسان کائنات کی سب سے زیادہ قیمتی اور باشعور مخلوق ہے اور جب اس برتر مخلوق کا ایک طبقہ اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک روا رکھتا ہو تو اس نسلی تفریق (Classification) سے اہم موضوع شاعری کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔ دراصل لکھنے والوں اور خصوصاً شعراء کے لئے سب سے اہم اور سب سے بڑے ''موضوعات سخن'' دو ہی رہے ہیں۔

۱۔ کائنات

۲۔ انسان

دنیا کی بڑی شاعری اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ہیر پھیر کر بات وہیں پہنچے گی۔ کوئی خیال بھی ان موضوعات سے باہر نہیں ملے گا۔ داخلی شاعری ہو کہ خارجی شاعری ہو۔ بزمیہ ہو کہ رزمیہ ہو مجلسی ہو کہ انقلابی ہو۔

بات پہنچی تری جوانی تک
والی بات ہی سامنے آئے گی۔

بڑی شاعری کے لئے ظاہر ہے کہ موضوع بھی بڑا ہونا چاہئے۔ اور بڑے موضوع جیسا کہ بیان کر چکا ہوں دو ہی ہیں۔ سو بخش نے ایک تو یہ دانائی کی کہ اپنی شاعری کے لئے بڑا موضوع چنا۔ دوسرا یہ کہ

پسے ہوئے، پچے ہوئے، پس ماندہ اور بد حال طبقے کی ترجمانی کی۔ اس طرح بہت سا ADVANTAGE تو اس نے یوں حاصل کر لیا۔ جہاں تک اس کی شاعری کا تعلق ہے۔ اس پر ہم اپنے نقطۂ نظر سے اظہار خیال کر ہی چکے ہیں۔ ہم اسے فیض یا ندیم کی صف میں شمار نہیں کرتے، تاہم اس میں وہ شعلہ محسوس کیا جا سکتا ہے جس کے متعلق فارسی کے کسی استاد شاعر نے کہا تھا

از شعلہ تراشیدہ ام حرف

اس شعلے سے حرف تراشنے کے جنون سے بھی وہ عاری نہیں ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اپنے فن کے اس کٹھن سفر میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ "ہو کا خراج" اس کے سفر کے پہلے پڑاؤ کا پہلا نقش ہے۔ جس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اگر وہ اس لگن اور ریاضت سے اپنا سفر جاری رکھ سکا تو وہ دن دور نہیں جب برصغیر ہند و پاک کے مشاہیر شعراء کی صف میں شمولیت کا فخر حاصل کرے گا۔

یہ بات میں کسی خوش فہمی کی بنا پر نہیں کہہ رہا بلکہ اس کی شاعری کے تیور، فکر کی تازگی اور اس کی اٹھان اس امر کی گواہی دے رہی ہے کہ وہ امکانات کی حد تک پھیلنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ کسے خبر ہے کہ اس کے بہ س خانۂ دل میں کیا چھپا ہوا ہے۔

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ بخش لائلپوری کی شاعری ایک بڑے ہی گہرے تفکر، مشاہدے، مثبت انداز فکر اور ایک متاثر کن لہجے کی شاعری ہے۔ اس میں رنگِ تغزل بھی اور انقلابی فکر بھی ہے۔ علائم اور تلازموں کا ایک خوبصورت نظام بھی ہے شاعر کی غزل میں ایک شعر بھی دل کو چھونے والا مل جائے تو اس غزل کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے لیکن میں یہ کہوں گا کہ بخش صاحب کی اکثر غزلوں میں دل کو چھونے والا ایک شعر تو کیا پوری کی پوری غزلیں تیکھے پن اور تازگیٔ فکر سے عبارت ہیں جن کی تہہ میں کئی مفاہیم اور کئی مطالب پوشیدہ ہیں۔ ان کی آواز شعری امکانات کی ایک پر تجسس، گہری سوچ کی حامل اور محترم آواز متصور کی جائے گی۔ ان کا اپنا اسلوب بیان ہے اپنا انداز ہے اور ان کے کلام پر کسی کی چھاپ نہیں۔ جو شخص اس تہہ دار شاعری کو ایک پرت کی شاعری کہتا ہے اس نے یقیناً بخش لائلپوری کے کلام کو نہیں پڑھا۔ مجھے خوشی ہے کہ بخش صاحب نے شاعری کی ہے وقت ضائع نہیں کیا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ایک کرمکِ شب تاب، بخش لائلپوری

پروفیسر جمیل ملک

بخش لائلپوری اپنی ارض وطن پاکستان کے رہنے والوں کے لئے تو شاید ایسا نام نہیں جو بار بار نظروں کے سامنے آتا ہے اور از بر ہو جاتا ہے۔ مگر وہ اس لحاظ سے ضرور منفرد و ممتاز ہے کہ برسوں سے وطن کی دوری کا عذاب سہنے کے باوجود چمن زار وطن کی ہر روش پر تازہ گلاب کھلانے کا آرزومند ہے۔ اُس کی یہ آرزومندی اُس کے فکر و فن کا سب سے بڑا محرک بھی ہے اور فصیل شہر سے دور ہونے کے باوجود اُسے ہر دم وطن کی بے پناہ محبت سے سرشار رکھتی ہے۔ مگر یہ ایسی سرشاری ہے جو دِلفگاری کے راستے سے ہو کر گزرتی ہے۔ اُسے کھلتی ہوئی شفقِ صبح کے منظر منظر میں قتل گاہوں میں بہتے ہوئے لہو کی سرخی اتنی نمایاں اور جاں سوز نظر آتی ہے کہ اس سیلِ شفق کے لہو میں ڈوب کر ابھرنے کا انداز ہی اس کے لئے گُل افروزی اور جہاں تابی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ جن قتل گاہوں میں بخش لائلپوری کے پیش رووں کے علم گرانے کے تمام اسباب پیدا کر دیئے گئے تھے انہی شہادت گاہوں میں بخش لائلپوری جیسے جاں نثاروں اور فنکاروں نے بڑے والہانہ انداز سے آگے بڑھ کر یہ علم سنبھال لئے ہیں اور اب ایک مدت سے ان پرچموں پر نقش شہیدوں کے منور چہروں کے خد و خال نوک قلم پر اتار کر اپنی محبوبۂ غزل کی مانگ کو اس کھلتی ہوئی شفقِ فردا کے لہو لہو سیندور سے سنوار اور نکھار رہے ہیں۔ بخش لائلپوری اپنے نظریۂ فن اور منصب فن کے سلسلے میں اس قدر واضح نقطۂ نظر کا حامل فنکار ہے کہ اس نے بغیر کسی فکری الجھاؤ کے اپنی غزل کی اساس خود ہی استوار کر دی ہے۔

بھیگا ہوا لہو میں ہے دامن خیال کا
خوں باریٔ غزل برے فن کی اساس ہے

یہ حقیقت کسی بحث کی محتاج نہیں کہ فکر و فن کی جن بنیادوں کو اپنے خون اور اپنے جسم و جان کے چونے گارے کی آمیزش سے استوار و ہموار کیا جائے وہ کس قدر لازوال اور لافانی ہوتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو بخش لائلپوری کی شاعری میں ایک نقطۂ مستیز کی طرح ابھر کر طلوعِ فردا کی صورت میں ڈھلتا چلا جارہا ہے۔ اس نکتے کا خمیر اس کے ہاں وطن کی مٹی ہی سے تیار ہوا ہے اور اُس کی پہلی اڑان بھی وطن ہی کی فضاؤں کی رہینِ منت ہے مگر وہ اب ایک طویل مدت سے اپنے وطن کے خوابوں، خیالوں، آرزوؤں اور جستجوؤں کی یہ روشنی

وطن کی سرحدوں سے دور رہ کر بھی چہار دانگ عالم میں پھیلا دینا چاہتا ہے کہ اس کے فکر و فن میں ڈھلتے ہوئے آفتاب فردا کی روشنی صداقت و حرمت اور حسن و خیر کا وہ استعارہ ہے جس پر اُس کے اپنے وطن کے جمہور ہی کا نہیں بلکہ تمام دنیا کے جمہور کا بھی حق ہے۔ غالبؔ نے جس گلشن نا آفریدہ کا خواب دیکھا تھا، اقبالؔ نے جس سلطانیٔ جمہور کے زمانے کا افق روشن کیا تھا اور اس روشن افق سے اُبھرنے والے آفتاب کی کرنوں کو جس طرح مسلسل زنجیر کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور ان گراں بار زنجیروں سے رہائی حاصل کرنے کے لئے فیضؔ اور اُس کے ہم قدم فنکاروں اور شاعروں نے متاعِ لوح و قلم چھن جانے کے باوجود جس طرح ہر حلقۂ زنجیر میں اپنی زبان رکھ دی ہے وہی زبان ایک تابناک ورثے کی روشنیوں اور رنگوں کو سمیٹتی ہوئی ایک کلمۂ حق لے ساتھ آنے والی نسلوں کی شاعری میں گونج بن کر پھیل رہی ہے۔ بخش لائلپوری کی غزل اس گونج کو اور زیادہ دل گیر بنانے والی ایک صدا ہی نہیں بلکہ ایک صدائے بازگشت بھی ہے جو اُس کے دل کے گنبد سے بلند ہوتی ہوئی اور اُس کی اپنی سرزمین وطن کی فصیلِ شہر سے ٹکراتی ہوئی جب پلٹتی ہے تو ایک آفاق گیر احتجاج میں ڈھل کر اُس کی غزل کو لہولہان کرتی ہوئی رودادِ شہر کے ساتھ ساتھ اُس کی رودادِ حیات کا اشاریہ بھی بن جاتی ہے۔

فصیلِ شہر پہ رودادِ شہر کندہ تھی
حدودِ شہر میں اے دوست میں گیا ہی نہیں

حدودِ شہر سے دور رہ کر بھی سرزمینِ وطن کی ایک ایک دھڑکن اور ایک ایک زخم کا حساب رکھنے کا یہ تخلیقی عمل ایسا دل پذیر اور جاں گداز ہے کہ ہمیں بخش لائلپوری کی بہت دور سے اُبھرتی ہوئی یہ آواز بھی بہت قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس ردیف سے شاعر کی اپنے نظریۂ فکر و فن ہی سے نہیں بلکہ اپنے وطن سے شدید وابستگی کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مگر یہ وابستگی صرف وطن سے اظہارِ محبت کر دینے پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ اظہارِ محبت تو اس کی شاعری میں اس وابستگی کا نقطۂ آغاز ہے۔ ارضِ وطن اور جمہورِ وطن سے گہری اور حقیقی وابستگی کا اصل پیمانہ تو وہ تمام دار و رسن کی آزمائشیں ہیں جن کے ایک ایک جاں گسل مرحلے سے شاعر کو ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ آزمائشِ دار و رسن کے ان سارے مراحل سے گزرتے ہوئے اگرچہ اسے بار بار تلخیٔ کام و دہن کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جس سے اس کی غزل کا لب و لہجہ بھی متاثر ہوتا ہے مگر چونکہ اس کی یہ ساری جد و جہد اُس کے بے پناہ خلوص پر مبنی ہے اسی لئے وہ جب آزمائشِ دار و رسن سے گزرنے کے عمل کو تلخیٔ کام و دہن سے ہم آمیز و ہم رنگ کرتا ہے تو اُس کی آواز کا تخلیقی زہر سقراط کے پیالے میں گھل مل کر ایثار و صداقت کے ایک ایسے امرت کی صورت اختیار کرلیتا ہے جو اُس کی غزل کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتا ہوا صداقت شعاروں کی زبانوں پر تو رس گھول دیتا ہے مگر حسن، خیر اور سچائی کے قاتلوں کے رگ و ریشے میں زہر بن کر اُتر جاتا ہے۔

بخش لائلپوری کی غزل کا کٹیلا مگر سجیلا رویہ اور لب ولہجہ جہاں اُس کی نظریاتی انفرادیت کے لئے ایک ڈھال کا کام دیتا ہے وہاں اس کے نظریاتی حریفوں کے لئے ایک شمشیر برہنہ تن کا درجہ بھی رکھتا ہے۔

انا کے تاج محل کا وہ پاسباں ٹھہرا
ضمیر جس نے سجا کے دکاں پہ رکھا ہے

ہم باغبانِ وقت کا کردار دیکھ کر
آئینِ خانہ زاد کے تیور بدل گئے

زکاتِ رزق پہ قائم حیات ہے جس کی
انا کے کیف سے وہ شخص آشنا ہی نہیں

فرازِ دار پہ لائے تو ہیں رفیق مجھے
مرے نصیب میں یارب کفن لہو کا بھی ہو

آنکھیں یزیدیت کی بھی پُر نم نہ ہو سکیں
ہر کربلا کا سانحہ مجھ پر گزر گیا

جس گلی میں پتھروں کا ڈھیر ہے
اُس گلی میں ہم برہنہ سر چلے

ہمیں تھے وہ جو لہو کے دیئے جلا کے چلے
ہمارے سر پہ تھا جوشِ جنوں سوار بہت

سگانِ شہر کو پابستۂ رسن کردو
غریبِ شہر کا ناحق لہو بہانہ کرے

کنج قفس سے ہوگئے مانوس اس طرح
طوقِ گلو بھی اب ہمیں گہنا دکھائی دے

میرے بدن پہ گو نہیں اک تار بھی مگر
ہر جسمِ زر نگار پہ میرا لباس ہے

بخش لائلپوری کی غزل کا یہ انداز تخاطب ایک گہری، گمبھیر رات میں بشارتوں کی گواہی دینے والے اُن اہلِ فکر و نظر پر ایک کاٹ دار طنز ہی کے مترادف نہیں جو نئی نسلوں کو خواب گراں سے جگا کر خود گہری نیند سو رہے ہیں۔ بلکہ حال کے اس آزمائشی لمحے میں ستم کی دار پر اذان دینے، سوئے ہوئے اذہان کو جگانے، ایک نئے قافلۂ شہر کو ترتیب دینے اور اسے منزلِ سحر کی طرف آمادۂ سفر کرنے کا اعلامیہ بھی ہے جس کی آواز پر سرگرم سفر ہوئے بغیر نہ تو آئینِ خانہ زاد کے تیور بدلے جاسکتے ہیں اور نہ ہی خلقِ خدا کو چہار سمت زنداں کی مسلسل ابھرتی ہوئی دیواروں سے رہائی دلائی جاسکتی ہے۔ جس کے اندر برسوں سے جمہور کو نرغمال کی صورت نظر بند کردیا گیا ہے۔ بخش لائلپوری کی غزل میں یہ ایک ایسے معاشرے کے خد و خال بنتے اور بکھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جو باہر سے سجا سجایا ہوا معاشرہ ہے مگر اندر سے ایک ایسے زنداں کی صورت

اختیار کر چکا ہے جس میں حبسِ دوام کا عالم طاری ہے جہاں بادِ صبا کا انتظار کرتے کرتے جوشِ جنوں سے سرفراز دیوانوں کی بصارتیں بھی اجڑ گئی ہیں۔ جہاں ایک طرف صنعت گروں نے اپنی اپنی دکانوں کے آئینہ خانوں میں بکاؤ مال کی طرح اپنے ضمیر بھی سجا رکھے ہیں تو دوسری طرف موسیٰ صفت لوگ فرعونِ زمانہ کو غرقاب کرنے کی دھن میں آج بھی قلزمِ خوں سے گزر جانے کے لئے اُسی طرح جاں کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور اُسی طرح رواں دواں ہیں۔ جو آج بھی اس ایمان و یقیں کی دولت سے سرشار ہیں کہ آہن پوش لوگ لاکھ وقت کے سورج کو اندھا کرتے رہیں یہ عقل کے اندھے، یہ بصارتوں کو اجاڑنے والے کبھی بصیرتوں کے افق سے ابھرنے والے آفتابِ فردا کی شعاعوں کا راستہ روکنے والوں کو سورج خود اندھا کر دیا کرتا ہے۔

کاٹ کر وہ روشنی کا سر چلے
وقت کے سورج کو اندھا کر چلے

ہم اُس گلی میں ازل سے مقیم ہیں یارو
گدا بھی جس میں کبھی جرأت صدا نہ کرے

سورج کی تیز دھوپ میں چہرہ اتر گیا
حوش فہمیٔ حیات کا سپنا بکھر گیا

ہمارے باب میں کیا کیا لکھا مورخ نے
کسی کتاب کو ہم نے کبھی پڑھا ہی نہیں

خوں سے ہے تر بتر میرے افکار کا لباس
دارالقفس میں دل کا پرندہ دکھائی دے

مجھ کو صلیبِ سنگ میں گاڑا ہوا بدن
خوں رنگ انقلاب کا جھنڈا دکھائی دے

تعریف ہو رہی ہے وہ جس کے لباس کی
وہ شخص مجھ کو شہر میں ننگا دکھائی دے

نیازمندِ ستم کو ستم شعار بہت
جھکا ہے سر تو اٹھے ہیں صلیب و دار بہت

زبان سمجھو کبھی بے زبان حرفوں کی
فصیلِ شہر پہ چسپاں ہیں اشتہار بہت

بڑے سعید ہیں خنجر جو دل کے پار ہوئے
بہا جو خون تو آیا ہمیں قرار بہت

بخش لائلپوری کی غزل بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بھی اُس ترقی پسند غزل کی یاد تازہ کر رہی ہے جس کا آغاز ترقی پسند تحریک کے جلو میں ۱۹۳۶ء کے گرد و پیش ہوا تھا۔ اسی دور میں اقبال کی

مفکرانہ غزل کے لب و لہجے سے مَس ہو کر ترقی پسند غزل نے زمانے بھر کے جدید اور مستقبل کی سمت بڑھتے ہوئے تمام زندہ و جاندار روّیوں کو اپنے قالب میں جذب کر کے ثابت کر دیا تھا کہ وہ جدید اور ترقی پسند نظم کے ہم کاب بھی اُسی شانِ دلآویزی سے چل سکتی ہے بلکہ اپنا ایک منفرد تشخص پیدا کر کے اور اُسے مستحکم بنیادوں پر کھڑا کر کے آنے والی نسلوں کے حوالے بھی کر سکتی ہے۔ ایک ہی ترقی پسند ملکی اور بین الاقوامی تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود فیضؔ اور ندیمؔ کے غزلیہ لہجوں کے ہم کاب اور بھی متعدد شعراء کے منفرد اسالیب بیان منصۂ شہود پر آئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے غزل کی سر زمینوں سے سر بلند ہو کر غزل کے آسمانوں پر بے شمار روشن ستارے بیک وقت جگمگا اٹھے ہوں۔ غزل کی انہی آوازوں میں ایک آواز ظہیر کاشمیری کی بھی تھی۔ گہری، گمبھیر، واضح اور پاٹ دار غزل کے اس لب و لہجے سے آگے چل کر فارغ بخاری کی غزل کا چراغ روشن تر ہوتا گیا۔ اور اب غزل کے اس مخصوص رجحان اور اسلوب کی چھوٹ انگلستان میں بخش لائلپوری اور پاکستان میں تنویر سپرا کی غزل پر پڑتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی ہے۔ یہ مخصوص لب و لہجہ ایسے شاعروں ہی کو ورثے میں منتقل ہو سکتا ہے جو ایک واضح اور دو ٹوک نظریاتی اور عملی نقطۂ نظر پر ایمان بھی رکھتے ہوں اور اس سے اپنی شاعری میں کام بھی لینا چاہتے ہوں۔ غزل موجودہ دور تک آتے آتے بڑی منزلیں طے کر چکی ہے۔ اس سارے عرصے میں غزل فکر و فن کے تجربات کی نہ صرف آماجگاہ بنی رہی ہے۔ بلکہ اس آماجگاہ سے نکل کر کئی ستارے آفتابِ فردا سے ہم کلام بھی ہوتے رہے ہیں۔ مگر آفتابِ فردا سے براہِ راست بات کرنے والوں کی تعداد مسلسل کم ہوتی رہی ہے کہ براہِ راست بات کرنے والوں کا اندازِ سخن غزل کی تہہ داری، مصوری، پیکر تراشی اور ایمائیت کے اوصاف سے دور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ غزل کے تمام تر اوصاف گہرائیاں اور سچائیاں اپنی جگہ تجربات کی ہماہمی بھی مبارک مگر اس حقیقت سے بھی کون انحراف کرے گا کہ حق بات کہنے کا بھی اپنا ایک کھرا، دو ٹوک اور منجھا ہوا انداز ہوتا ہے جس کی دھار صداقت کے جذبے سے تیز ہو کر زبان سے نکلتی ہے اور دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ یہ آواز کسی مصلحت یا مصالحت کی پابند نہیں ہوتی۔ اس کا رشتہ براہِ راست اپنے نظریۂ فن کے حوالے سے اپنے عوام سے ہوتا ہے۔ اس زاویئے سے دیکھیں تو بخش لائلپوری کی شاعری عوامی ادب ہی کا ایک ناگزیر حصہ ہے اور نظیر اکبر آبادی سے لے کر بخش لائلپوری تک ایسی تمام شاعری جس کا ناطہ عوام سے ہو شاعری کے دوسرے اوصاف کے ساتھ ساتھ خطابیہ لب و لہجے کی ایک لہر بھی اپنے اندر ضرور موجزن رکھتی ہے کہ اسی لہر کا نام زندگی ہے جو فن کے سمندر میں جست لگا کر اُسے کروٹ پر کروٹ دیتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بخش لائلپوری کے غزلیہ محبوب کے سراپا پر بھی اپنی تمام تج دھج کے باوجود اُس کے چاہنے والے عوام کے عشق ہی کی چھوٹ پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

مری حیات کا ہر پل تری امانت ہے
بچھڑ کے تجھ سے میں زندہ رہوں خدا نہ کرے

فضا میں ٹوٹ کے میرا بدن بکھر جائے
وہ ٹوٹ ٹوٹ کے مجھ سے اگر ملا نہ کرے

نہ پوچھ مجھ سے صدا کی حقیقت پنہاں
وہ ایک بت ہے جسے آسماں پہ رکھا ہے

بخش لائلپوری کی غزل میں نمو کا جو چراغ روشن ہے اس کی دشاعر کی شاخ گلو سے اُبھر اُبھر کر لمبی بسیط رات کی دیواروں میں اپنی بلند آہنگی کی ضو سے درازیں ڈال رہی ہیں۔ اگر وہ اس اندھیری رات میں اپنے آپ کو کرمک شب تاب کہتا ہے تو وہ اس لئے کہ اس بے ات رات میں اس کی طرح کے چند سرپھرے مگر ایسے دکاروں کی روشنی اُن شب تاب کرموں ہی کے مماثل ہے جو بڑی بے خوفی اور بے جگری سے اپنا یہ مختصر اثاثۂ جاں لے کر اندھیرے کی بساط الٹنے کی جد و جہد میں ہمہ تن سرگرم عمل ہیں۔

تم روشنی میں رات کے اسباب کی طرح
ہم تیرگی میں کرمک شب تاب کی طرح

جوں جوں بخش لائلپوری کی غزل میں لو دیتا ہوا یہ کرمک شب تاب مسلسل روشنی بکھیرتے رہنے کی ریاضت سے گزرتا ہوا اور اپنے اندر کی آگ سے پگھلتا ہوا سراپا شعور کے ساتھ ساتھ سراپا گداز بن جائے گا اُس کے منجھے ہوئے شعور کے ہر کاب اُس کا جذبہ بھی اور صیقل اور صیقل ہوتا چلا جائے گا۔ تب اس کا شعور حیات اُس کے اسلوب حیات کو بھی نو بنو نسخہ ہائے وفا سے آشنا کرے گا۔ پھر یہ رسم و راہ آشنائی اتنی بڑھے گی کہ اُس کی غزل میں لو دیتا ہوا دماغ اُس کے دل کے چراغ اور اس کے دل کا چراغ اس کے روشن دماغ سے اس طرح کسبِ نور کرے گا کہ دل و دماغ کے باہمی فاصلے مسلسل کم ہوتے جائیں گے اور اُس کی ترقی پسند غزل اپنی لو دیتی ہوئی اولین پہچان کو سنبھالے ہوئے غزل کے نو ترقی پسند اور جدید ترین ذائقوں سے بھی آملے گی۔ اس رویئے سے اُس کی غزل میں جامعیت کے ساتھ ساتھ وسعت بھی پیدا ہو گی۔ یہاں تک کہ وہ اُس مقام کو حاصل کرنے میں بھی سرخرو اور کامران ٹھہرے گا جس کی پیش گوئی وہ پہلے ہی کر چکا ہے۔

کرن حیات کی بجھتی نہیں قضا سے کبھی
اگر شعور میں روشن دیا نمو کا بھی ہو

بخش کا لہجہ دو ٹوک ہے.......

ڈاکٹر صلاح الدین حیدر

بخش لائل پوری کی غزلوں کا مجموعہ لہو کا خراج، حوصلہ مندی اور جرأت کی ایک منفرد دستاویز ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے ایک دلاسہ، سہارا اور محبت کی تصویروں کا البم ہے جو آزادی، امن انصاف اور سماجی مساوات کے لئے جدوجہد کے عمل میں اپنے لہو کا خراج دیتے ہیں۔ جو ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں دار کی خشک ٹہنی پر وارے جاتے ہیں اور جو غربت، افلاس، تشدد، سازش، سفاکی کے استعماری حملوں کے چلنے کے باوجود ایک لہلہاتے درخت کی طرح زمین سے اپنی جڑوں کو پیوست رکھتے ہیں۔ بخش لائلپوری کی شاعری نے اس داخلی ناآسودگی اور ردعمل کی صورت میں جنم لیا ہے جو برطانیہ کے صنعتی ماحول میں پروان چڑھی ہے۔ وہ اس ملک میں روزگار کے سلسلے میں مقیم ہے۔ لیکن وہ براہ راست نوآبادیاتی نظام کے جبر کی یادوں کو اپنے حافظے میں آباد رکھتا ہے اور ہم عصر زندگی کے آشوب کی بنیادوں کو تاریخی مادیت کے قوانین کے حوالے سے پرکھنے اور سمجھنے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن اس عمل میں اس نے شاعری کو نعرہ نہیں بننے دیا بلکہ عوام کی نارسائی اور تاریخ کے آشوب کو اس نے غزل کے کلاسیکل ذخیرۂ الفاظ سے پیوست کر کے ایک نیا آہنگ اور لہجہ مہیا کیا ہے۔ مستقبل کی امید کا پیغام دیا ہے۔ عالمی سطح پر جنگ نفرت، جبر، سرمایہ داری، اسلحہ سازی کے ہولناک منظر نامے کے باوجود اسے یقین ہے کہ آخر کار نیا دور طلوع ہوگا۔ آزادی اور حریت کا باب طلوع ہوگا۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے لہو کا خراج ناگزیر ہے اور فیض کے لفظوں میں ''جو راہ ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے''

بخش کی شاعری کی جڑیں اس کی زندگی کے اوّلین دور کے سماجی تجربات سے بہت پیوست ہیں۔ اس نے دریائے بیاس کے کنارے مشرقی پنجاب کے اس ماحول میں آنکھ کھولی جہاں گاؤں کے پٹواری کو ہی سب سے بلند مرتبہ انسان سمجھا جاتا تھا۔ نوآبادیاتی عہد کی اس پسماندگی کے پس منظر میں اس نے پیروں فقیروں کے مزاروں پر قوالی جیسی داخلی تقریبات سے داخلی تجربات کے آہنگ کو کریدا۔ پاکستان بنا تو وہ اپنے کنبے کے ساتھ ہجرت کر آیا فکر معاش کے چکر میں کراچی پہنچا جہاں شعر و سخن کی محفلوں میں شریک ہونے کا موقع بھی ملا لیکن اس کے جذبات کی دنیا نے تاریخی شعور کی قوتوں کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا۔ ترقی پسند اقدار کو اپنایا پھر اسی دوران وہ انگلستان چلا آیا۔ یہاں آکر انسان کے

اندر کے کھوکھلے پن کے تجربے نے اسے آزادی کے لئے نئی تڑپ عطا کی۔ اسے محسوس ہوا کہ سامراجی معاشرہ، اجارہ داریوں کا معاشرہ، جبر اور خاموشی کی ثقافت تخلیق کرتا ہے۔ اور اپنے اصل کارناموں اور عزائم پر مختلف الوع رنگین پردے بھی ڈال دیتا ہے۔ لندن اور اپنے معاشرے کی اس حالت میں اسے اس حوالے سے کوئی فرق نظر نہیں آیا۔

بخش اس دورِ ستم میں چیختا کوئی نہیں
وہ پسِ دیوارِ زنداں ہم سمندر پار چپ

بخش کی غزلوں میں یوں تو غزل کے محبوب سے معاملات کی جھلک بھی مل جاتی ہے۔ لیکن اس کے اصل موضوعات سماجی کشمکش، جبر کے خلاف مزاحمت، ردعمل، آزادی کے لئے والہانہ تڑپ، اس کی خواہش وغیرہ سے مربوط ہیں۔ ایک سطح پر اس نے رومانیت، غنائیت کو بائی پاس کیا ہے۔ جس طرح تیسری دنیا کی انقلابی تحریکیں، سرمایہ دارانہ ترقی کے راستے، بائی پاس کرتی نظر آتی ہیں۔ بخش نے جبر، استعماریت کی آنکھوں کے رہبر کو سات سمندر پار سے بھی اپنی دھرتی کی رگوں میں اترتا محسوس کیا ہے۔

اس نے انسان کے روپ میں ''بھیڑیئے'' کو بھی شدت سے محسوس کیا ہے کچھ اس طرح جمہوری قبا میں دیو استبداد کو ''نیلم پری'' کے روپ میں اقبالؒ نے پہچان لیا تھا۔ وہ کہتا ہے

ہم نے ملایا ہاتھ تو محسوس یہ ہوا
اک بھیڑیئے کے جسم پر انساں کی کھال ہے

صنعت گروں کے شہر میں وہ حبس ہے کہ بخش
جو سانس لے رہا ہے وہ اہلِ کمال ہے

میرا خیال ہے کہ صنعتی معاشرہ کو قریب سے دیکھنے کے نتیجے میں بخش کا لہجہ دوٹوک ہے۔ اور اس میں رگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے والی وہ آہستہ خرامی اور ناز کی مربوط نہیں ہے جو جاگیرداری عہد کی قدروں میں حیاتی تجربوں کے حوالے سے نمایاں نظر آتی ہے۔ صنعتی معاشرے کو قریب سے دیکھنے ہی کے تجربے نے اقبالؒ کو شاعری کے لئے افق اور نئے استعارے اور استعاروں میں معانی کے لئے نئے افق مہیا کئے تھے اور اس اعتبار سے بخش کی شاعری اقبال کے موضوعات کے قریب سے گزرتی ہے۔ لیکن بخش عہدِ نو کے مسائل کا حل ماضی میں تلاش نہیں کرتا۔ بلکہ انسان کے جہدِ مسلسل اور ہم عصر زندگی کے شعور اور سماجی انقلابات کے عمل میں اسے نئے امکانات نظر آتے ہیں۔ بخش نے غزل کے اسلوب اور اس کے لفظی قرینے سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور اسے اپنے عہد کے تجربات سے مربوط کر کے یہ بتایا ہے کہ غزل کا اسلوب صرف کلاسیکل معاشروں ہی کی یادگار نہیں بلکہ صنعتی معاشرے میں بھی یہ نمو پاسکتا ہے۔

بخش کی شاعری میں خنجرِ عدو، حادثۂ گلو،

فرازدار، شہیدانِ کربلا، فقیہِ دین، بادہ و سبو، تکمیل آرزو، ماتم خزاں مقتل لہو لہو، حرم کی رہ، دیارِ شوق، منصور، سرمد، شہیدانِ صداقت، جیسے تلمیحات، تشبیہات کے قرینے غزل کا آہنگ تو پیدا کردیتے ہیں لیکن اس آہنگ میں بخش اپنے عہد کی پکار سنتے ہیں فیض کے لفظوں میں ''بخش نے اردو شاعری کی مروجہ ادبی زبان استعمال کی ہے اور ان کے کلام کا مزاج عوامی شاعری کا ہے۔ لیکن اس مروجہ ادبی عہد کے انسان کا لامحدود رزم نامہ بکھرا نظر آتا ہے۔ یہاں ہمیں تیسری دنیا کے سامراجی جبر کی چکی میں پسنے والے محکوم لوگوں کی مزاحمت کا رویہ ملتا ہے۔ صنعتی معاشرے کی بے حسی، بیگانگی اور محنت کی قوت کے استحصال کا ردعمل بھی نظر آتا ہے۔ ایٹمی جنگ کے خطرے کا آسیب اور سامراجی ملکوں کی جنگ باز پالیسیوں کا واضح ردعمل نظر آتا ہے۔ اس صورت حال کے باوجود بخش کے لہجے سے عالمی انقلابی تحریک پر اعتماد اور محنت کشوں کے سیاسی قوت بننے کی امنگ اور تاریخی عمل میں شرکت کے جذبوں کی جھلک ملتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی ذات کے حوالے سے حیات انسانی میں سرمایہ دارانہ معاشرت کی پیدا کردہ توڑ پھوڑ اور تحقیر کے تجربے کو بیان کرتا ہے۔

احساسات کی یہ دنیا اجنبی یا نئی نہیں، نہ ہی کسی حیرت انگیز اسلوب کے تجربے سے بخش نے چونکایا ہے۔ بخش کی ہنرمندی ہی یہ ہے کہ اس نے صنعتی عہد اور سامراجی عہد کے تضادات کو غزل کے لطیف پیرائے میں سمویا ہے۔ اس نے مولانا حسرت موہانی کے طرز کی معاملہ بندی کی گھاتوں کی بجائے صورتحال کی تلخی کو اپنے رگ و پے میں اتار کر بات کی ہے اور اس عمل میں فن کے لوازمات کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ دراصل بخش کی شاعری میں ملکیتی قدروں کے ردعمل میں دائمی تغزل کی ناآسودگی نہیں بلکہ زندگی میں حرکت، تغیر، انقلاب کی امنگ اسے تاریخ کے منظرنامے سے انسپائر کرتی ہے۔ وہ تاریخ کے مادی رشتوں میں تبدیلی کی امنگ کو اپنی داخلی زندگی کے اضطراب، احساس سے مربوط کرتا ہے اور یوں بخش لائلپوری کی شاعری میں ابتدا ہی فرازدار پر نڈر لوگوں کے تذکرے سے ہوتی ہے اور یہ آہنگ آخر تک برقرار رہتا ہے۔ بخش کی بے چین روح اپنے عہد کے رزمیہ منظرنامے کی تلخی کو شدت سے محسوس کرتی ہے اور وہ مجبور ہوجاتا ہے کہ حقائق سے جمالیاتی تجربوں کا غازہ اتار کر کلام کرے۔

مرے لہو کی چمک تھی نگار خانوں میں
تجوریوں کے جو اندر تھا مال میرا تھا

دوسری اہم بات یہ ہے کہ تین دہائیوں سے لندن میں مقیم ہونے کے باوجود اپنے وطن اور اس کے ساتھ غیر ملکی استبداد کے خلاف آزادی کی تحریک کے ارادوں اور جذبوں کو بخش کسی طرح بھلا نہیں سکا۔ جن کی ایک جھلک فارغ بخاری صاحب نے بھی اپنے مضمون میں اجاگر کی ہے۔ ان تین دہائیوں میں لندن کے

کسی قسم کے رنگ بخش کو متاثر نہیں کر سکے یا پھر وہ ان رنگوں کے لبادوں کو اتارتا ہے تو اسے ایک ایسا سفاک منظر نظر آتا ہے جس میں وہ اپنے لہو کا رنگ اظہار کے علامتی قرینے کے طور پر پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کی غزلوں میں لہو کا استعارہ بار بار شعلہ بار ہو جاتا ہے۔

ہر ایک منظر خوں رنگ تھا نگاہوں میں
زباں کھلی تھی مگر ہم بیاں دے نہ سکے

تازہ لہو کے داغ ہیں جس کے لباس پر
اس شخص کی ہے مورتی دارالاماں میں

اس حوالے سے ''لہو کا خراج'' ہم عصر زندگی کی شناخت کا ایک اہم وسیلہ ہے۔

عہدِ حاضر کے تضادات کی بنیادی آویزشوں اور ان سے پیدا ہونے والی تلخیوں، محرومیوں اور اداسیوں کا گہرا مشاہدہ کئے بغیر فکری ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ بخش لائلپوری نے ان تضادات کا نہ صرف گہرا مشاہدہ کیا ہے بلکہ انہیں سمجھا بھی ہے اور پھر اپنے طرفہ انداز میں فنی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ شعری پیکر بھی عطا کیا ہے۔ بخش صاحب کی شناخت اداس نسلوں کے ساتھ جذباتی اور فکری ہم آہنگی ہے جس کا تخلیقی مظہر ان کی غزلیں ہی نہیں نظمیں بھی ہیں—

''بادِ شمال'' کی تہہ دار شاعری اپنے مخصوص آہنگ میں یقیناً خنکی اور انجماد کی شاعری نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کی تمازت اور تحرک کی شاعری ہے جس کی خوشبو اہل فکر و نظر کو اپنی جانب کھینچتی ہے—

ڈاکٹر قمر رئیس، دہلی

اردو شاعری میں احتجاج کی روایت

ڈاکٹر طارق عزیز

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے موقع پر جو اعلان نامہ جاری کیا گیا اس کا آخری پیرا یوں ہے

"ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔

"یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں، تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔"

اس اعلان نامے نے جہاں ادیبوں اور شاعروں کے منصب کار کا تعین کیا، وہاں انہیں "اپنی روایات کا وارث" قرار دے کر دہری مشکل میں ڈال دیا۔ ادیبوں کے ایک بڑے طبقے نے طے شدہ لائحہ عمل کے تابع ہو کر لکھنا شروع کیا اور یوں بعض نقادوں کے بقول "ادب کو نعرہ اور پراپیگنڈہ بنا دیا۔" اس نوعیت کے الزامات کو کلی طور پر درست مانا جاسکتا ہے نہ حتمی طور پر نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ "ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے" یا "جلادو اسے پھونک ڈالو یہ دنیا" وغیرہ جیسے مصرعے پوسٹروں اور بینروں پر لکھے جانے لگے۔ لیکن جہاں اپنی روایات کی پاسداری کا شعور برقرار رہا وہاں محض statements جاری کرنے والے نقادوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ یوں تخلیقِ فن اور تحسینِ فن کا عمل جاری رہا جس نے ادب کو نفسیاتی شعور، جنسیاتی رمزیت، انقلابی رجائیت، معاشرتی طنزیت اور تفریحی ظرافت دی۔

ترقی پسند ادب نعرہ تھا یا پراپیگنڈہ یہ زندگی کی حقیقی اقدار کا ترجمان تھا یا نہیں؟ ان مباحث سے قطع نظر اہم سوال یہ ہے کہ ترقی پسند ادب نے بعد کے ادب اور عوامی شعور کو کیا دیا؟ یہ کس حد تک اور کس نوعیت کی تبدیلی کا باعث بنا؟ اس سوال کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اس نے اردو ادب اور شاعری کو احتجاج

آمیز طرز احساس دیا۔ یہ وہ طرز احساس ہے جو ظلم پسند حکومتوں کو الٹنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ طرز احساس دانشور طبقے سے لے کر عوامی شعور تک منتقل ہوا ہے۔

آج شاعری میں احتجاج کا حوالہ بخش لائلپوری کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ ''لہو کا خراج'' اس بات کی گواہی پر مشتمل وہ دستاویز ہے جس کی ایک ایک سطر احتجاج قرار دی جاسکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ احتجاج کس کے خلاف ہے؟ بخش لائلپوری کی شعری عمر کا زیادہ حصہ برطانیہ میں گزرا ہے۔ لیکن ''لہو کا خراج'' میں ان کا ذہنی وطن واضح طور پر پاکستان ہے۔ ان کی شاعری کو پاکستان میں سماجی ناانصافی، سیاسی بربریت، اقتصادی عدم مساوات اور ان سب کے مجموعی ثمرات کے حوالے سے سمجھنا سہولت کا باعث بنتا ہے۔ یہاں میں بطور حوالہ ان کے اشعار درج کرنے سے اراداً گریز کررہا ہوں کہ اس تناظر میں ان کا ہر شعر انتخاب ہے۔

''لہو کا خراج'' کی شعری زبان مخصوص موضوعاتی ماحول کے مطابق مخصوص الفاظ اور علامتوں سے مزین ہے۔ اس زباں نے انہیں حقیقی معنوں میں ایک صاحبِ طرز شاعر بنا دیا ہے۔ مختلف شعراء کے درمیان فکری ہم آہنگی کے امکان سے کسے مفر ہے، تاہم تجربے کا یکتاپن اور لب و لہجے کی تازگی کسی شاعر کی الگ پہچان قائم کرتی ہے۔ بخش لائلپوری اس اعتبار سے خوش بخت ہیں کہ وہ محض ایک کتاب ہی کے ذریعے اپنی الگ پہچان قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

آخر میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اردو شاعری سے شاعر کی ذات کے اخراج نے بعض ایسے مغالطوں کو جنم دیا جس سے شاعر کا مرتبہ ہی مشکوک ٹھہرا۔ بعض لوگوں کے ہاں ترقی پسندی ذاتی ترقی کا لبادہ بن گئی۔ اس سارے ماحول میں بخش لائلپوری کے لب و لہجے کی تیزی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک ایسا معصوم شاعر ہے جو وہی لکھتا ہے جو محسوس کرتا ہے اور جو محسوس کرتا ہے صرف وہی لکھتا ہے۔

بخش لائلپوری جذبے کی حسرت میں سلگنے والے شاعر ہیں لیکن واضح رہے کہ ان کے جذبے کا الاؤ حسنِ خوش نظر کو دیکھ کر نہیں سلگتا۔ وہ انسان کے ساتھ وابستگی کے شاعر ہیں اور جہاں بھی ان کو انسانیت پابجولاں نظر آتی ہے وہ جذباتی شعریت سے مغلوب ہوجاتے ہیں اور اس کا تجزیہ شاعری میں کرتے ہیں۔ بخش لائلپوری غزل کے پیکر میں آتشِ سیال کو ترقی پسندانہ اندازِ فکر میں سمونے والا شاعر ہے اور ہم اسے آسانی سے کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، حبیب جالب، احمد فراز، محسن بھوپالی اور ظہیر کاشمیری کی صف میں کھڑا کرسکتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور

”اس غنچۂ خیال کا ذوقِ نمو تو دیکھ“

نصر ملک۔ ڈنمارک

مکتوب بنام بخش لائلپوری

۱۷/ مئی ۱۹۸۷ء

برادرِ محترم بخش لائلپوری صاحب
آداب و تسلیمات

میرے نصیب کہ آپ نے مجھے اپنا مجموعۂ کلام "لہو کا خراج" بھجوایا۔ "لہو کا حراج" ملنے پر حو مسرت مجھے حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس ادبی قحط الرجالی کے ماحول میں کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ جس روز آپ کا محموعۂ کلام ملا اسی روز اسے اوّل سے آخر تك پڑھ ڈالا اور پھر رات بھر اس کے مطالعہ میں دوسری بار کھویا رہا۔ بعض شعروں کو تو دو دو تیں تیں بار پڑھا اور کئی غزلوں اور شعروں کاآپ ہی کی دوسری غزلوں اور نظموں سے موازنہ کرتا رہا کیوں کہ کئی اشعار کو دوسرے اشعار سے اور بعض غزلوں کو دوسری غزلوں سے ار حد مطابقت تھی اور یوں معلوم ہورہا تھا کہ گویا آپ پر ان اشعار کا نزول ایك ہی ساعت میں ہوا ہوگا۔ یہ الگ بات ہوگی کہ آپ نے انہیں غزلوں کی صورت الگ الگ کر دیا ہوگا۔

برادرِ محترم میں ادبی نقاد نہیں اور نہ ہی دانشور۔ "لہو کا خراج" پر نہ تو تنقیدی اور نہ ہی دانشورانہ رائے کا حق رکھتا ہوں البتہ اردو ادب کا ایك ادنیٰ سا طالب علم ہونے کے ناطے کچھ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ کل رات "لہو کا خراج" کے مطالعے میں‌کھوئے رہنے کے بعد اس بات کا اب کوئی شك نہیں رہا کہ جس بخش بھائی کو میں غائبانہ طور پر گزشتہ پندرہ برس سے جانتا ہوں اور جن کا کلام لندن کے اردو رسالوں میں گاہے بگاہے پڑھتا رہتا ہوں ان کے بارے میں غائبانہ طور پر جو سن رکھا تھا پڑھ رکھا تھا—"لہو کا خراج" کے مطالعے کے بعد اس پر اور بخش لائلپوری کی ذات پر میری پختگی، ایماں و یقین میں اور مضبوطی آگئی ہے۔ "لہو کا خراج" پر بزرگوارم ساقی فاروقی کی رائے، آپ کی اپنی "ذات کی بات" اور اس پر بررگوارم فارغ بخاری صاحب کا تحریہ، دراصل "لہو کا خراج" کے بارے میں دوسروں کے لئے کچھ کہنے کا موقع باقی نہیں چھوڑتے اور پھر آخر میں ہمارے سبھی کے پیارے فیض احمد فیض

صاحب کا آپ کے "لہو کا خراج" کو خراج اتنا عظیم ہے کہ اس پر کسی کو کچھ کہنے کی جرأت ہی نہیں ہوسکتی۔

"لہو کا خراج" کی اشاعت کا بندوبست کر کے آپ نے ثابت کردیا ہے کہ اپنی مادرِ وطن سے دوری اپنی زمین سے جدائی اور اپنے ماحول کے فاصلے، تخلیق کاروں کے لئے کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ احساسات زندہ ہوں تو فنکار صحرا میں بھی تشنہ لب نہیں ہوتا اور لندن تو اچھا بھلا، ہنگامۂ زندگی سے اٹا شہر ہے۔

"لہو کا خراج" میں شعروں کے انمول موتی، آپ نے نجانے کتنی راتیں تنہا جاگ کر پروئے ہوں گے۔ تبھی تو شعروں کی ان مالاؤں میں اتنی حسن ہے، جان ہے، طراوت ہے، شرارے ہیں عیش کے سائے اور کرب حالت ہیں۔ ان میں "ہونے کی تلقین ہے تو جان ملت انسانیت کی آہیں اور سسکیاں بھی ہیں۔ امید مردا ہے تو احساس زیاں ماضی ہے۔ استعارے شوخیاں کرتے آگ لگاتے جاتے ہیں۔ مظلومیت کی آہیں ظالم و جابر آمروں کو سرِ بازار ننگا کرتی چلی جاتی ہیں۔ نا امیدی کا ڈر ہے تو امید کا بھی یقین ہے۔ میں ناقد نہیں ٹھہرا کہ نقد کہہ دوں۔ ناقدانہ سوچ مفقود سہی لیکن پھر بھی "منہ میں زبان دھن میں سوچ اور ہاتھ میں قلم رکھتا ہوں" کے مصداق یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ اتنی اچھی غزل گوئی پر بخش تمہارا یہ پرستار تمہیں سلام کرتا ہے۔"

یوں تو "لہو کا خراج" کی ساری غزلیں ایک سے ایک بڑھ کر ہیں لیکن میں جن سے سب سے زیادہ متاثر ہوا اور جو میرے شعور کو جھنجھوڑنے میں کامیاب ہوئیں ان میں یہ غزلیں شامل تھیں جنھیں میں نے بار بار پڑھا:

دوستو! ہر کڑی منزل سے گزرنا ہوگا
گھر میں بیٹھے تو خدائی نہیں دیتا کوئی

اور پھر آپ کا یہ شعر کتنے دلوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ کاش کوئی غریب الدیاروں سے پوچھ کر دیکھے:

رہا نہ حق ہمیں جس گھر میں اب سکونت کا
ہمارے نام کی تختی وہاں جڑی ہے ابھی

اور یقین و اعتماد کا یہ اظہار تو خوب تریں ہے:

شور تا حشر بپا ہوگا ستم گر کے خلاف
ہم نہ ہوں گے تو کوئی اور دہائی دے گا

واقعی حقیقت نگاری کی انتہا کر

دی آپ نے:

کار فرما جس پہ ہو جاگیر دارانہ نظام
وہ زمیں ماقے اگلتی ہے کسانوں کے لئے

آپ کی شرح و فکر کے جو بنیادی اصول ہیں ان سے انسانیت، امن و آشتی اور اخوت کے لئے، اپنے حق کے لئے اٹھ بیٹھنے اور چل پڑھنے اور متحرك ہوجانے کے عزم کا جو اظہار ہوتا ہے وہ جدوجہد کی پہلی منزل ہی نہیں بلکه ایك ختم نه ہونے والی جنگ جاری کرنے کی نوید ہے۔ یه جنگ تب تك لڑنی ہوگی جب تك استعماریت کی خاردار جھاڑیاں صفحۂ زمیں سے صاف کرکے زمین پر زمین دار کا حق بحال نہیں کردیا جائے گا۔ اور اس کے لئے یه پھر کھنا ہی پڑتا ہے:

ہم اس مقام پہ اب آگئے ہیں بخش جہاں
سز اکا خوف نہیں، حسرتِ جزا بھی نہیں

کیا خوبصورت لہجہ ہے تلقین کا:

رسن کی قید میں بھی لب سے احتجاج کرو
سوائے درد تو منت کشِ رباب نہیں

جس کاسۂ سر میں شعور ہو، ذہن میں جرأت اظہار ہو اور ہاتھ میں قلم ہو اور قلم پر قدرت ہو اسے دعا سے کیا غرض ہوگی اور جب یه ساری خوبیاں بخش کو بخشنے والے نے عطا کردی ہوں تو واقعی بخش ایسا ہی کہیں گے که:

ہمیں تو ناز ہے اس شانِ بے نیازی پر
ہمارا ہاتھ دعا کے لئے اٹھا ہی نہیں

دور اندیش کے لئے ضروری نہیں که آگ کو چھو کر، ہاتھ جلا کر اس کی شدت کا اندازہ کرے وہ تو آگ دیکھتے ہی کھه دے گا:

فصیلِ شہر پہ رودادِ شہر کندہ تھی
حدودِ شہر میں لے دوست میں گیا ہی نہیں

آپ کی غزل "ہر جسم برف پوش میں لاوا دکھائی دے" ایك خوبصورت پرُ مفہوم غزل ہے خاص کر یہ شعر:

سوچوں کی گھری چھاپ ہے حس کی نگاہ پر
وہ شخص انجمن میں بھی تنہا دکھائی دے

اور پھر

انجانی کربلائوں سے سہمے ہوئے ہیں لوگ
ہر ایك دل پہ خوف کا پھرا دکھائی دے

اس بحر میں میری اپنی غزل کا ایک
شعر کچھ یوں ہے۔

اس شخص میں ضرور کوئی خاص بات ہے
جو شخص ہر مقام پہ تنہا دکھائی دے

بخش بھائی کیا حقیقت نگاری ہے۔
خوش پوشیوں کا جس کی ہے شہرہ گلی گلی
وہ شخص مجھ کو شہر میں ننگا دکھائی دے

واہ، واہ کیا مشورہ ہے حالات سے
نبرد آزمائی کے لئے

مرے رفیق حوادث کی آندھیوں سے نہ ڈر
دیا لہو کا جلا کر چٹان پر رکھ دے

حقیقت و صداقت کے اظہار میں آپ
کا لہجہ کس قدر جامع اور حقیقی ہے

وہی لائے مجھے دارورسن تک
میں جن لوگوں کا پیغمبر رہا ہوں

ایک ازلی صداقت بیاں کی ہے آپ
نے۔ سبھی پیغمبروں کے ساتھ ان کے ماننے والی
امتوں کا یہی طریقہ رہا ہے اور پھر آپ نے اس
شعر میں جو صورت بیان کی ہے وہ صرف چشمِ
بینا ہی دیکھ سکتی ہے اور نشاندہی بھی کر
سکتی ہے۔

اندر سے زخم زخم ہیں باہر کی چوٹ سے
وہ لوگ جن کے جسم پہ کوئی نشاں نہیں

آپ نے "لہو کا خراج" میں جس طرح
تخلیق اور لاشعور کو شعور کے ذریعے ظہور میں
لانے کے جوہر دکھائے ہیں وہ عالمانہ اور ادبی
زبان میں ہمارے روز مرہ کے معمولات اور ہماری
زندگی کے شب و روز میں رونما ہونے والے
واقعات کی مشاہدانہ صورتِ حال کا اظہار اور
عوامی مظلومیت کے حق میں جبر و تشدد اور
استبداد کے خلاف ایک موثر و کارگر احتجاج ہی
نہیں بلکہ اس احتجاج میں جہاں ظالم و جابر
آمروں کے لئے تنبیہہ اور وارننگ ہے وہاں
مظلومیت کے شکار، سماجی ناانصافیوں کے مارے
ہوئے اور شاہراہِ حیات پر زخم خوردہ، آبلوں
سے پُر پاؤں کے ساتھ رینگنے کی کوشش میں
مصروف افراد کو اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کا
حوصلہ بھی ہے۔ ان کے لئے آگے بڑھنے اور اپنا
حق چھین لینے کا مشورہ بھی ہے اور ایک عوامی
فنکار یا ادیب و مصنف اور شاعر کے لئے ضروری
ہے کہ وہ سماج کے ناسوروں کی نشاندھی نہیں

بلکه ان کا علاج بھی تجویز کرے۔ آپ اس دوطرفه فریصه میں کامیاب و کامراں ھیں، سرخرو ھیں:

اس غنچۂ خیال کا ذوقِ نمو تو دیکھا!
جس کو خزاں کی گود میں کھلنے کی آس ھے

آپ کی غزل "گھر بھی چپ ھے در بھی چپ ھے روزنِ دیوار بھی چپ" ایك شاهکار غزل ھے لیکن نجانے مجھے آپ کے اس شعر:

بخش اس دورِ ستم میں چیختا کوئی نهیں
وه پسِ دیوارِ رنداں، هم سمندر پار چپ

اس شعر میں آپ نے غالباً شعراء کی روائتی کسرِ نفسی سے کام لیا ھے. کیا آپ کا اپنا مجموعه کلام "لھو کا خراج" چپ کے اس سمندر میں حس طرف آپ نے اشاره کیا ھے، ایك پتھر نهیں!۔ "لهو کا خراج" کے اس احتجاجی پتھر نے نه جانے کتنے چپ کے سمندروں میں ارتعاش پیدا کردیا هوگا اور کرتا رھے گا۔ آخر ایسی بھی کسرِ نفسی کیا؟ جانتا هوں که یه آپ کا مدعا نهیں هوگا بلکه محض اندازِ بیان میں رنگینی، شرارت هوگی۔ لیکن یه بعضوں کے لئے شائد واویلے کا جواز مهیا کرے گا۔ آپ کی یه نشاندھی اور حقیقت کا کھوج خوب رها:

کرن حیات کی بجھتی نهیں قضا سے کبھی
اگر شعور میں روشن دیا نمو کا بھی هو

اور پھر ایسی دعاء پر کون ھے جو قربان نه هوگا اور اپنے لئے شرف نه سمجھے گا:

فرازِ دار په لائے تو هیں رفیق مجھے
مرے نصیب میں یارب! کفن لهو کا بھی هو

آپ کا یه شعر:

بُنتا ھے پیرهن جو زمانے کے واسطے
اس شخص کے بدن په تو اِك تار بھی نهیں

اس شعر سے مجھے علامه اقبال کا ایك شعر یاد پڑتا ھے جو غالباً کچھ یوں ھے:

سرما کی هواؤں میں عریاں ھے بدن اس کا
دیتا ھے هنر جس کا امیروں کو دوشاله

آپ کا لب و لهجه اپنی جگه موجود اور محفوظ ھے اور اقبال تو اقبال ٹھهرے۔ هم اُن کی اقبالیت کے تسلیم کرنے والے کیوں نه هوں گے۔ آپ کے اس شعر میں کیا واضح اشاره ھے۔ مجھ کو راز افشاں کرنے کی ضرورت نهیں خوشبو مقید هو هی نهیں سکتی:

دیوار و در میں اهل سیاست نے چن دیا
وہ حسم حس سے فکر کا شعلہ بلند تھا

یوں تو آپ کا سارا ہی کلام، سراپا احتجاج، حساس اور مستقبل سے وابستگی اور امید پر مبنی ہے جبکہ کہیں کہیں آپ کی عالمانہ نصیحت و مشوروں کا بھی ظہور ہے بلکہ خوب تر اور خوب ترین ہے۔ شعر میں تجزئے نہیں ہوا کرتے اور اگرچہ بات بین السطور ہوتی ہے لیکن آپ کی جرأت اظہار پر بار بار داد دیئے بنا رہا بھی نہیں جا سکتا

محیط ہے جو رسید کا تو کوئی جگنو کر تلاش
کس بلا کی تیرگی ہے، روشنی کے شہر میں

آپ نے "رقاصہ، حیات کو جس چشم حقیقت سے دیکھا اور اس کی حالت بیاں کی ہے وہ فنی کمال کے عروج کی انتہا ہے ہمارے قبیل کے اکثر قبیلوں نے "ہمیں آداب غلامی سکھانے کی کوششوں میں رقصِ زنجیر" ناچنے کی ترغیبیں دیں مگر برادرم بخش آپ کی سوچ و فکر اور مشاہدات کا کمال سب سے الگ اور منفرد ہے۔ کیا خوبصورت تصویر کشی کی ہے آپ نے

ہر پیر میں ہیں بیڑیاں، پازیب کی جگہ
رقاصۂ حیات کے زیور بدل گئے

کردیا تقسیم اس کو مصلحت اندیش نے
ہم نے اپنا جسم ٹکڑوں میں کبھی بانٹا نہ تھا

اس سے تقسیم ہندوستاں اور پھر المیۂ مشرقی پاکستان کے ایام و واقعات میری آنکھوں میں آگئے۔ واہ بخش بھئی واہ۔ اس شعر میں محض آپ کے ہنر کا کمال ہی نہیں بلکہ یہ ایک محب وطن، حساس اور بے باک دل کی آواز بھی ہے، ایسی آواز جو محض ایک حساس شاعر کی سوچ نہیں بلکہ اس کے عوام اور وطن کی اصل حقیقت اور روپ ہے۔ آپ نے بڑے ہنر کے ساتھ 'گماں" کی حقیقت کا اظہار کیا ہے:

ہم ازل سے سن رہے ہیں آہنی قدموں کی چاپ
گھر کا دروازہ ہمیں، زنداں کا دروازہ لگے

ہائے 'احساس زیاں" کے اظہار میں آپ کا یہ انداز کچھ آپ ہی کا کمال ہے:

اجنبی دنیا کے ہر آباد گھر کو دیکھ کر
بخشؔ اپنے گھر کی بربادی کا اندازہ لگے

اور اپنے گھر کے موجودہ حالات کی
یہ تصویر کشی، کیسے متوجہ نہیں کرے گی:

حسے بھی چاھا صلیب ستم پہ کھینچ دیا
فقیہِ شہر تو قائل نہیں گواھوں کا

اور اس فقیہِ شہر" کے لئے آپ کا یہ
انتباہ—محض انتباہ ھی تو نہیں چشم بینا کو
اس میں بہت کچھ مل سکتا ھے:

میرے دیار کو مقبوضہ اِک زمیں نہ سمجھ
کہ ٹوٹنے کو ھے افسوں تری سپاھوں کا

آپ نے دورِ حاضر کے فرعونوں اور
یزیدوں کے خلاف جو شمشیر اٹھائی ھے وہ ان
فرعونوں اور یزیدوں کو یقیناً سرنگوں کرے گی
اور آپ کی یہ جرأت، بے باکی ھم جیسوں کے لئے
تقلید کا جواز پیدا کرنے اور ھم ین "مشتعل (مثبت
رنگ میں) کرنے میں بھی کار گر ھوگی اور کیوں
نہ ھوگی جب ھمارے کانوں میں ھمارے پیارے
بخش کی یہ صدا گونج رھی ھو:

قدم قدم پہ صفیں باندھ کر کھڑے ھیں یزید
نظر کو تیغِ برھنہ بدن کو ڈھال بنا

مجھے یقین ھے کہ "لھو کا خراج" ادا
کرنے کے بعد اب آپ کو یہ حسرت نہیں رھے گی کہ
کوئی چیخ ھی نکلے "نظر کو تیغ برھنہ اور بدن
کو ڈھال بنالینے والوں کے لئے پھر بھی آپ کا یہ
کھنا—مزید ھمت بندھانے کی بھتر کاوش ھے۔

نہیں جو تابِ گویائی تو کوئی چیخ ھی نکلے
کہ سنّاٹے میں خاموشی ھماری بزدلی ھوگی

اھل سخن کے لئے آپ کا مشورہ
محض مشورہ ھی نہیں بلکہ "ایسے اھلِ سخن"
جن کو آپ نے مخاطب کیا ھے ان کے لئے میرے
نزدیک "عبرت" بھی ھے۔

حرف و بیاں سے کام لو دورِ ستم میں بخش
یہ خامشی تو شیوۂ اھل سخن نہیں

"لھو کا خراج "پڑھنے اور بار بار
پڑھنے کے بعد، بے اختیار یہ کھنا پڑا کہ ھمارے
عھد کا "نیا عھد نامہ" ھے لیکن آپ کے اس شعر نے
میرے شعور کی توجہ کو جھنجھوڑ کر رکھدیا:

سوچوں کے جزیروں میں جب حشر بپا ھوگا
دنیا کے صحیفوں کا عنوان نیا ھوگا

میں سمجھتا ہوں کہ سوچوں کے جزیروں میں تلاطم و حشر بپا ہے اور پاروں کی صورت میں صحیفوں کی آمد آمد بھی ہے، "لہو کا خراج" بھی اس سلسلے کا ایک حصہ ہے۔ پرورش لوح و قلم جاری رہے اسے جاری رہنا چاہئے — آپ کو مبارک ہو — آپ نے واقعی سن سینتالیس سے لے کر اب تک کے "خون" کا "خراج مع "بیاج" ادا کردیا ہے گو کہ اس ادائیگی کے لئے "مکاں فرق، زمیں ضبط، فصل پر ڈگری" کے مراحل کا سامنا بھی آپ ہی کو کرنا پڑا۔ مبارک ہو آپ سرخرو ہوئے اتنا اچھا مجموعۂ کلام بھجوانے پر شکریہ اور اس کی اشاعت پر دلی مبارک باد بھی۔

آپ کا عزیز

نصر ملک

بخش لائلپوری کا تیسرا مجموعۂ کلام "بادشمال" بھی اسی روایت کا مظہر ہے جو اُن کے دوسرے مجموعوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ روایت تیسری دنیا کے مظلوم عوام کی آزادی، بہتر زندگی اور حسین مستقبل کی تمنا اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جدو جہد سے عبارت ہیں۔

بخش لائلپوری تیسری دنیا کے مسائل کے بارے میں مجرد خیالات کا اظہار نہیں کرتے۔ آمریت، بنیاد پرستی، طبقاتی استحصال اور انسانی قدروں کی پامالی کی ساری تصویر پاکستان کے حوالے سے ان کے اشعار میں موجود ہے۔ اپنے وطن سے گہری محبت کا جذبہ ان کی مزاحمتی شاعری کو مثبت طرزِ حیات سے مزین کرتا ہے۔ بے باکی اور راست بیانی بخش کی خصوصیت ہے۔

بخش لائلپوری کی شاعری ہم عصر شاعری کے تجریدی اور مُبہم طرزِ اظہار سے پاک ہے۔ کلاسیکی اسلوب نے بھی انہیں مغلوب نہیں کیا۔ ان کی شاعری کا اپنا لب ولہجہ ہے اپنا آہنگ ہے۔ جدّتِ فکر سے عبارت ان کی غزل نظریئے اور فن کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔

عابد حسن منٹو

لہو کے خراج کو خراج

ایم۔ ایم۔ حیدر

اقتباس از مکتوب بنام بخش لائلپوری

''آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے کہ ''ایک کامیاب فنکار حقائق و واقعات، مختلف انسانی رشتوں کے عمل اور رد عمل کی کیفیتوں، سماجی زندگی سے پیدا ہونے والے بہترین تصورات اور نظریوں (یعنی تعمیمات) کا مشاہدہ کر کے اور انہیں سمجھ کے اپنے دماغ میں جذب کرتا ہے۔ یہ سچائیاں اس کے جذبات کا اسی قدر حصہ بن جاتی ہیں جتنا کہ اس کے ذہن کا۔ پھر اپنے جوش، جذبے، تخیل، بصیرت، اور فنی مہارت کو کام میں لا کر وہ اپنے فن پارے کی تخلیق کرتا ہے۔ اس طرح ایک نئی خوش نما، اور نشاط انگیز شئے وجود میں آتی ہے۔ ایک الہامی نغمہ، جس سے دل کو سرور ہوتا ہے، دماغ میں روشنی آتی ہے، اور جو ہماری روح میں اہتزاز پیدا کر کے اس میں نئی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کا حوصلہ اور رجحان پیدا کرتا ہے۔ سچائیوں کی زمین میں تجربے مشاہدے اور بصیرت کی آبپاشی، فنی مہارت کی ٹھنڈی ہواؤں، اور گہرے جذبے کی گرم، تیز اور نورانی شعاعوں کے مجموعی عمل سے تخلیق کا دانہ، ایک مہکتے ہوئے رنگین اور لطیف پھول کی طرح ہمارے سامنے برآمد ہوتا ہے، ان تمام عناصر پر مشتمل لیکن ان سے مختلف تخیل، تصور اور تجربے کا مظہر، جوہر اول، کیف آور، حیات افزا اور فلک سیر، (روشنائی سید سجاد ظہیر)

چنانچہ اچھا شاعر وہ ہوگا، جس کے جذبے میں وہ خلوص کے شعلے ہوں۔ بیان میں سچائی کی چاندنی ہو، لفظوں میں دریاؤں کی نغمگی ہو، لہجے میں چشموں کی روانی ہو، فکر میں رجائیت کی چمکیلی کرنیں ہوں، دل میں زمین اور اس کے باسیوں سے محبت کے استوار رشتوں کا عزم راسخ ہو، اور دماغ میں رہ گزر حیات کی ارتقائی منزلوں کی نشاندہی کے لئے قندیلیں روشن ہوں۔

شاعری کی ہر صنف کا اپنا ایک الگ مزاج ہوتا ہے۔ شاعر اپنے موضوع کے اعتبار سے صنف کا انتخاب کرتا ہے۔ پھر ہر صنف کا ایک اپنا آہنگ اور Diction بھی ہوتا ہے چنانچہ غزل میں قصیدے کا Diction یا قصیدے میں دوہے، یا گیت کا Diction استعمال نہیں ہوتا۔ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے، تو، موجودہ دور میں جس فنکار کا دل انسان دوستی اور امن پسندی کے جذبے سے سرشار ہو، اور جو ظلم اور استبداد کے خلاف ہو، اور آزادیٔ فکر و اظہار پر پابندیوں سے جس کا دم گھٹتا ہو، اس کے لئے تمام متنوع موضوعات اصل میں صرف ایک ہی موضوع کی مختلف شکلیں ہوتی

ہیں یعنی احتجاج!! کبھی یہ احتجاج ایک بلند آہنگ چیخ کی شکل میں ہوتا ہے کبھی ایک آہ، ایک سسکی کی شکل میں، اور کبھی ایک شیریں اور نرم "دلاسہ" کہ "آنے والا کل" "آج" سے ضرور بہتر ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے اظہار فکر کے لئے غزل کی صنف کو انتخاب کیا ہے۔ آپ جس طرح سے اپنے متنوع موضوعات کی تخلیقی حسن کاری کے عمل سے، گل آرائی (Flower Arrangement) کرنا چاہتے ہیں، غزل میں بحسن و خوبی کر لیتے ہیں۔

میں نے "لہو کا خراج" کے مطالعہ کے دوران محسوس کیا کہ آپ نے واقعۂ کربلا کو اپنی احتجاجی فکر کے ابلاغ کے لئے ایک ایہامی Symbol کے طور پر بہت اچھی طرح استعمال کیا ہے۔

ہر ایک سمت یہاں کوفیوں کے ڈیرے ہیں
ہمیں شہید رہِ رسمِ کربلا کر دے

دیارِ شام میں جو اہلِ حق پہ گزری تھی
دل و نظر میں وہی حشر کی گھڑی ہے ابھی

قدم قدم پہ تھی درپیش کربلا لیکن
ہم اہلِ حق کی طرح امتحان دے نہ سکے

ہو ہو ہے فضا، قتلِ ماہ و انجم پر
زمینِ یاس پہ تجدیدِ کربلا بھی نہیں

بجائی کربلاؤں سے سہمے ہوئے ہیں لوگ
ہر ایک دل پہ خوف کا پہرا دکھائی دے

ہر ایک سر پہ جھومتی ہے شرِ نو کی تیغ
ہر گام پر ہے معرکۂ کربلا کھلا

پڑھے گا خاکِ شہیدانِ کربلا سی نماز
فقیہِ دیں کو سلیقہ مگر وضو کا بھی ہو

قدم قدم پہ صفیں باندھ کر کھڑے ہیں یزید
نظر کو تیغِ برہنہ، بدن کو ڈھال بنا

ہر طرف ہنگامۂ محشر بپا ہے شہر میں
کربلا ہی کربلا ہے زندگی کے شہر میں

آنکھیں یزیدِ وقت کی پُر نم نہ ہو سکیں
اک کربلا کا سانحہ ہم پر گزر گیا

کوئی ابنِ علی ہو، عیسیٰ و منصور و سرمد ہو
شہیدانِ صداقت پر ستم ہوتے ہی رہتے ہیں

ہر کوچۂ خلوص میں ہے کربلا کا رنگ
کس درجہ پر فریب ہے شہرِ وفا کا رنگ

اگرچہ آپ کے اشعار عموماً ایک دکھی دل کی پکار ہیں، اور اس میں آپ نے بہت خوب کہا ہے لیکن جہاں اس عام روش سے ہٹ کر آپ نے کہا ہے، تو نہایت خوبصورت شعر نکالے ہیں ۔

یہ بھی ہے ایک معجزہ جنسِ دوام کا
تازہ ہوا کے لوگ طلبگار تو ہوئے

مانا حصارِ شب ابھی ٹوٹا نہیں تمام
لیکن نمودِ صبح کے آثار تو ہوئے

سجاؤ بخش سبیلیں ہوائے تازہ کی
فضائے شہر وفا میں گھٹن بڑی ہے ابھی
شور تا حشر بپا ہوگا ستمگر کے خلاف
ہم نہ ہوں گے تو کوئی اور دہائی دے گا
ہمیں تو سوزنِ تعبیر سے گلا ہی نہیں
ہمارا چاکِ گریباں کبھی سلا ہی نہیں
حالات بے اماں سے بھی ہم بدگماں نہیں
دل کا مکاں سلگتا ہے، لیکن دھواں نہیں
رُتیں بدلتی نہیں ماتمِ خزاں سے کبھی
لبوں پہ ذکر، ذرا بخش رنگ و بو کا بھی ہو
عہدِ خزاں نوشتۂ تقدیر تو نہیں
گل کو نویدِ آمدِ فصلِ بہار دو
تم آگئے تو قیامت کا دن تمام ہوا
اب اس کے بعد تو محشر کا انتظار نہیں

سوچتا ہوں کہ اگر رائے لکھنا ہی تھی، تو یہی لکھنا کافی تھا کہ آپ کا یہ مجموعہ کلام اچھائی اور سچائی کا ایک دلکش مرقع ہے۔ امید ہے کہ وقت کی سان پر چڑھ کر زبان و بیان میں مزید ''کاٹ'' آئے گی اور دریائے فکر و خیال کو اور ''پاٹ'' میسر آئیں گے۔

★

شاعری نظریات کی پابند نہیں ہوتی۔ یہ تو مروجہ نظریات سے آگے جاکر نئے نظریات کو دریافت کرنے کا عمل ہے۔ یہ فکر جس کی پابندی میں آج ہم ہیں کل کہاں تھا؟ کل کی اجتماعی بود و باش میں کچھ خرابیاں تھیں جن کو شاعر نے محسوس کیا اور اس سے بہتر آئندہ کی نشان دہی کی۔ وہی خرابیاں آج میں بھی ہوسکتی ہیں۔ ایک طرزِ احساس ایک اندازِ حیات مرورِ ایام میں کبھی بہتر صورت میں خلقِ خدا کو دکھاتے ہیں اور انسانی معاشرے کو خوبصورت رشتوں میں استوار کرتے ہیں۔

بخش لائلپوری کی فکر اجتماعی شعور کی آئینہ دار ہے اور ان کی شاعری میں کچھ گزشتہ سے پیوستگی اور کچھ آئندہ کا نیاپن دو زمانوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

ایک اندازِ زندگی سے گہری وابستگی اور اس کے ساتھ تخلیقی تحریک — تخلیقی فن کی پاسداری، اجداد سے وفاداری اور ان کی میراث کو اور زیادہ خوبصورت لب و لہجہ میں بیان کرنے کی شعوری پختگی اور تمنا، یہ چاروں صفات بخش لائلپوری کے کلام کی اصل ہیں اور اُن کے اظہار کا خاصہ ہیں۔

منیر نیازی۔ لاہور

بخش لائلپوری کی "بادشمال" کا تعارف

مسعود منور۔ ناروے

مسند نشیناں تقریب جناب پروفیسر امین مغل صاحب، اردو مرکز کے معتمد اعزازی جناب افتخار عارف، صاحب "بادشمال" حضرت بخش لائلپوری اور دانشوران لندن! اس وقت جو شخص آپ کے سامنے کھڑا آج کی اس تقریب میں "دخل در معقولات" کا مرتکب ہو رہا ہے دراصل اس منصب کا اہل ہرگز نہیں کہ وہ کسی ادبی تخلیق کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھے۔ ادبی معاملات بے حد لطیف اور نازک ہوتے ہیں اور مجھ جیسے کسی دیہاتی کے بس کا روگ نہیں کہ وہ ان لطافتوں اور نزاکتوں کو حیطۂ تفہیم میں لا کر اپنی رائے کا اظہار کر سکے۔ میں نے جس لسانی نظام میں ادب کی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کی ہے وہاں مجھے کوئی ایسا موقع نہیں مل سکا کہ اپنے خالص مقامی اور علاقائی ادبی رویوں کے حوالے سے اپنے ادبی اور لسانی دفینوں کو برآمد کر کے ان سے فیضیاب ہو سکوں، میں تو قرآن سے لے کر ہیر وارث شاہ تک اور "پکی روٹی" سے لے کر "سیف الملوک" تک سب کچھ ناظرہ پڑھتا رہا ہوں۔ میرے ورثے میں فقط شکستہ اور غیر مصدقہ لب و لہجے کا اعتبار تھا مگر جس کے متن کو سمجھنے کا کوئی حق مجھے فائق نہیں تھا ان الفاظ کے معنی کا علم لغت ہائے حجازی کے قارونوں کو تھا۔ وہی میرے لفظوں کے مالک تھے اور وہی میرے شکستہ لب و لہجہ کو قبولیت بخشنے والے تھے۔ دانشوران لندن میری مادری زبان پنجابی ہے۔ پانچ برس پہلے میں ہندوستان میں تھا تو مجھے بتایا گیا کہ جواہر لال نہرو کی جنم بھومی اتر پردیش کے لوگوں کی مادری زبان اردو ہے۔ اس پر میں نے اہل ہندوستان کو بتایا کہ پاکستان پر ہندوستان کے ایک صوبے کی لسانی برتری کا تسلط ہر وقت مجھے مرعوب کرتا رہا ہے۔ برسوں مجھے شین قاف کی درستی کے لئے ہدایات ملتی رہی ہیں۔ یہ پنجابی اردو ہے، یہ گلابی اردو ہے۔ علامہ اقبال اور رشید احمد صدیقی کا مکالمہ بھی جی ہاں اور ہاں جی ہاں جی کے فرق کو محسوس کرنے سے شروع ہوا تھا اور اسی پر ختم بھی ہو گیا۔ بات آگے نہ بڑھ سکی۔ اب ایک اور صاحب ہیں جنہیں درست لب و لہجہ کے ساتھ اردو بولنی نہیں آتی اور وہ خواہ مخواہ لندن کے اکبر داد خانوں کی سماعتوں میں مدمزگی گھولتے رہتے ہیں۔ صاحب منہ سے نکلی کوٹھوں چڑھی، یعنی اعتراض کیا ہے کہ ہاں جی سکول آف "تلفظات" کو شاعری کرنے کا حق نہیں، چلئے ہم بانگ درا سے "ارمغان حجاز" تک اور "نقش فریادی" سے "کلیات منیر" تک سب کچھ واپس لے لیتے ہیں۔ اب تو

خوش ہیں اکبر داد خان صاحب، جگہ خالی ہو گئی ہے پُر کر لیجئے۔ آپ اپنا کام کیجئے اور مجھے اپنا کام کرنے دیجئے کہ مجھے ''بادِ شمال'' کا پنجابی لہجے میں مطالعہ کرنا ہے، شعر عرض ہے:

یہ کون مسندِ اہلِ سخن پہ بیٹھا ہے
زباں بھی گنگ ہوئی حرفِ معتبر بھی گیا

یہ قلم کے ذریعے خود کو معرضِ اظہار میں لانے کی ضرورت کا المیہ ہے کہ قلم کے اس ذریعے سے وابستگی کی ایک غضبناک صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے، چنانچہ جو شخص مسندِ سخن پر بیٹھا ہے وہ شہرت کے حصول اور اعلیٰ منصب کے لئے خامہ فرسا رہا ہے۔ لہٰذا تخلیق کار ہرگز نہیں ہے۔ اسے فنِ شعر سے نہیں اس کے ثمر سے دلچسپی ہے۔ وہ اپنی ضروریات کے تحت قاری کو استعمال کرنے کا ہنر جانتا ہے اور اسے قاری اور ادیب کے باہمی اور دو طرفہ رشتے کا نام دیتا ہے۔ کتنے خوبصورت ہیں کمیونی کیشن کے یہ رشتے لیکن اس کا حاصل کیا ہے، مایوسی! مایوسی نے ادیب کے احساس کو کند کر دیا ہے اور ایک نہ ختم ہونے والا دکھ اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ چنانچہ صورتِ حال یہ ہے کہ:

زباں بھی گنگ ہوئی حرفِ معتبر بھی گیا

اس صورتِ حال کا تسلسل اس شعر میں بھی ہے:

دربارِ شہریار میں بیٹھے ہیں اس طرح
جیسے کسی بھی شخص کے کندھوں پہ سر نہیں

تو اے دانشورانِ لندن! خود کو اس صورتِ حال میں شاعر بنا کر پیش کرنا یا شاعر ہونے کی اداکاری کرنا کیسا حماقت مآب فریضہ ہے۔ خود کو دوسروں سے ممتاز قرار دیئے جانے کی خواہش میں گرفتار رہنا اور متکبرانہ خود پسندی جیسی سنگین بدعنوانی کا مرتکب ہونا کیسا لطیف جرم ہے اور اس کے برعکس ایک سادہ سا واقعی اور حقیقی شاعر ہونا کتنا مشکل کام ہے، ویسے ہی رہنا جو بساط میں ہو اور سوانگ نہ رچانا، جب شاعر کوئی سوانگ رچائے تو وہ شاعر نہیں ہوتا۔ شاعر ہونے کا مطلب ہے منقلب ہوتے رہنا۔ شاعر ہمیشہ ایک کیفیت سے نہیں گزرتا، ہر لمحہ اس پر ایک نئی دنیا کو منکشف کرتا ہے، ایک نئے عمق کی وحی، ایک نئی سطح کا الہام لیکن جب شعر گوئی عادت بن جائے، سطحی جذباتیت لفظوں کو مصرعوں میں ڈھالنے لگے۔ تو پھر مخصوص علتیں اس سخن طرازی کا محرک ہوتی ہیں جس کی بنا پر شاعر لفظ سے رہائی نہیں پا سکتا۔ شاید میرے لئے شاعری لفظ کی غلامی سے نجات اور متن کی جذباتیت سے رہائی کا ہنر ہے۔ اس آزادی کے بغیر ایک تخلیق کار مخصوص پیرایۂ اظہار، خیالات اور افکار کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر اس غلامانہ ذہنیت کا شاعر صرف لفظوں کے کھلونے بناتا ان سے کھیلتا اور ان کی نمائش کرتا ہے تو وہ ایک ایسے مالی کی طرح ہے جس نے زمین تیار کر کے کیاریاں تو بنا دیں

ہیں لیکن گلاب اور یاسمین کے پودے نہیں لگا سکا مگر "باد شمال" کا مطالعہ کرتے ہوئے احساس ہوا کہ بخش لفظوں کی قید سے آزاد فن کار ہے۔ وہ لفظوں کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ لفظ مادی وجود نہیں رکھتے اور نہ ہی زندگی کی ٹھوس اور مادی حقیقتیں محض الفاظ ہیں چنانچہ وہ لفظوں کی پُر شکوہ اور رفیع القامت عمارتیں تعمیر کرنے کے بجائے احتیاط سے کام لیتا ہے۔ مگر گمان ہے کہ وہ لفظوں کے معاملے میں بہت حساس ہے لیکن لفظوں کے بے جا بوجھ تلے دبا ہوا نہیں۔ چنانچہ وہ جب لفظوں کو ایک بحر کا پابند کرنے لگتا ہے تو ہمیشہ زندگی کی حقیقتوں کو پیش نظر رکھتا ہے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لفظوں کی میکانکی زہرناکی کو نظر انداز کر کے ان کی جمال آرائی پر نظر رکھتا ہے۔ وہ محض لفظوں کے ذریعے اپنی شناخت مرتب نہیں کرتا بلکہ اپنا چہرہ معانی کے خدوخال سے دیدہ زیب بناتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ لفظ پھندے ہیں۔ وہ صرف علامتیں ہیں اور علامتیں حقیقتیں نہیں۔ چنانچہ "باد شمال" میں اس کا رویہ تارہا ہے کہ وہ لفظوں کی غلامی قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ اس کے کلام کا اصل جوہر تفہیم ہے۔ اپنے ماحول اور اپنی صورت حال کی تفہیم۔ یہ ماحول اور یہ صورت حالات کیا کیا ہیں '

پردیس، ہجر، اپنی روایات سے جبری گلو خلاصی، اور اس سے اس تعلق کی موت جسے مشرق کے نظام ہائے رشتہ و پیوند نے وضع کیا ہے اور اپنی طبعی بقاء کا رزم نامہ اور "باد شمال" کا مطالعہ کرتے ہوئے جہاں مجھے متذکرہ مرحلوں سے گزرنا پڑا وہاں یہ بھی محسوس کیا کہ ہمارا مروجہ شعری آہنگ روبہ شکست ہے اور وہ ایڈیم جسے ہم نے ان دنوں فیشن کے طور پر اپنا رکھا ہے ہم سے الوداعی تقریب کا متمنی ہے، خدا حافظ! ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے قافلو! خدا حافظ اب تک تم نے مشرق و مغرب کی رزم گاہوں سے روایات اور تسلسل کے علم چن چن کر جتنی عشق بازی کی ہے اس کا آخری لمحہ آن پہنچا۔ تمہارے انقلابی لشکروں نے پسپائی کے بعد ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور تمہاری جدت پسندی تقلید کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئی ہے اور وہ اس لئے کہ تم ایک روایت سے ہم آہنگ اور صورتِ حال کے تسلسل کو تخلیق کہتے ہو حالانکہ تخلیق ایک مظہر کے خاتمے کے بعد کسی بالکل نئی کیفیت کا جنم ہے اور یہ کیفیت کوئی عمل نہیں، یہ تو ایک صورتِ حال ہے جس میں آدمی ہوتا ہے اور اس کے بیان کو جو ایک اضافی عمل ہے تم تخلیق کہتے ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ وقت نے ہنر کا جوہر سلب کر لیا ہے اور بخش لائلپوری نے دانش کدۂ فرنگ میں بیٹھ کر جتنی پی تھی اس کا خمار اس تیسرے شعری مجموعے "بادِ شمال" میں پورے عروج پر ہے اور میرا مطلب ہے کہ کسی سکہ بند ترقی پسند کی طرح حضرت بخش نے جو نوحہ گری کی ہے اور بکھر کر ٹوٹتے انسانی رشتوں پر جو واسوخت مرتب کی ہے اسے میں بجھتے چراغ کی لو کے مصداق جان رہا ہوں کیوں کہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ ہماری آنے والی نسلیں جو غربت کدۂ فرنگ میں پل کر جوان ہوئی ہیں، اپنے آبا کی ان کتابوں کو یورپ

میں دیکھ کر اپنے دل سپارہ ہوتے نہیں پائیں گی۔
حضرات! آپ سب صاحبانِ دانش و فراست میرے اس بیان کو مجذوب کی بڑ کہہ سکتے ہیں جی ہاں، میں حرف و گویائی کے کوچوں کا مجذوب ہی تو ہوں جس سے کبھی کوئی معقول دلیل سرزد ہی نہیں ہوئی۔ میں کہ بقائمی ہوش و حواس مطالعہ کرتا ہوں، ہر ایک مصرعے پر پڑاؤ ڈالتا ہوں ایک ایک ترکیب پر مقیم ہوتا ہوں اور خیال کی لفظی تصویر کے باطن میں اتر کر لحۂ تخلیق کا مسافر ہوتا ہوں، میں ایک قاری ہوں کہ نہ تو کسی ایک فکری مسلک سے وابستہ ہوں اور نہ کسی خاص فلسفۂ اظہار کا پیرو ہوں۔ آپ جو لکھنے والے ہیں بھلا اپنے قاری کو کہاں جانتے ہیں؟ اس لئے کہ نہ تو آپ اور آپ کی تخلیق کے درمیان فاصلہ ختم ہوا اور نہ آپ اور آپ کے قاری کے درمیان کہ اصل میں خالق تخلیق اور قاری ایک ہی مثلث کے تین معروضی زاویے ہیں اور جب تک یہ تینوں نقطہ ہائے اتصال پر مربوط نہیں ہوتے تخلیق معرضِ خلق میں نہیں آسکتی، اور ہم ہیں کہ فاصلوں کے باوجود اپنی ذات کے جنگلوں میں ناچنے والے موروں کو تخلیق اور خود کو خالق ہونے کا اعزاز بخش رہے ہیں۔

دانش مندانِ گرامی! میں ایک قاری ہوں، میں نے حضرت بخش لائلپوری کا مجموعہ کلام ''بادِ شمال'' پڑھا ہے اور جب سے یہ کتاب مجھے موصول ہوئی ہے میں خود کو اصحابِ شمال میں سمجھ رہا ہوں لیکن جب کتاب کو ہاتھ لگاؤں تو دایاں ہاتھ استعمال کرتا ہوں کہ کہیں سچ مچ کا کوئی حشر نہ اٹھ کھڑا ہو۔ بخش کے ہاں ''بادِ شمال'' ترکِ وطن کے تجربے کا ایک بے حد عمیق استعارہ اور ایک راستہ دکھانے والا ستارہ بن کر طلوع ہوا ہے، غربت زارِ فرنگ میں ہم نے اپنا جو اعمال نامہ اپنے ہاتھوں سے رقم کیا ہے ''بادِ شمال'' میں اس کا بھرپور منظر نامہ مُرتب ہے۔ آپ کتاب کو پڑھ لیجئے لب و لہجہ مانوس ہے، ترکیبیں بھی جانی پہچانی ہیں، آشنا اسلوب ہے۔ دل کہتا ہے بخش اس وقت ترقی پسندوں کا معتبر ترین نمائندہ ہے۔ ذرا اور غلو کروں تو کہوں کہ آدمی نے کیمونسٹ مینی فیسٹو نہ پڑھ رکھا ہو تب بھی اس کے مکتبِ فکر پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے۔ اس لئے اس کے لہجے میں بڑی توانائی ہے۔ بے شک آپ نے ''لینن خدا کے حضور'' نہ بھی پڑھ رکھی ہو بخش آپ کو اس سطح پر لے آئے گا جہاں آپ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اس کلیم بے صلیب کے ہاتھ پر غائبانہ بیعت کرلیں۔ اسے کہتے ہیں کرشمہ سازی، بخش کہتے ہیں:

اک طرف دنیا کے دکھ ہیں اک طرف روزی کے غم
شعر کیا موزوں کریں زلف و لب و رخسار پر

یعنی اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا، فیض کی وضع کی ہوئی روایت کے مطابق یہ بخش کی عجز بیانی ہے چنانچہ ان کے یہاں اس عجز بیانی کی بنا پر احساس کی وہ شدت پیدا ہوئی ہے جو ان کی تخلیق و دسترس کو بھرپور توانائی فراہم کرتی ہے۔ اپنے اس رویے کی بنا پر بخش ایک ایسا فن کار بن کر سامنے آتا ہے جو صرف نام و نمود کی خواہش کے پیش نظر شاعری نہیں

کرتا اور نہ ہی اس کے لئے تخلیق شعر خود سے فرار کا کوئی ذریعہ ہے۔ وہ زندگی سے بھاگ کر سخن طرازی میں پناہ نہیں ڈھونڈ رہا۔ چنانچہ اس کا تخلیقی عمل اپنی ذات کو شعر میں تحلیل کرنے کا عمل نظر آتا ہے اور وہ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی کسی مخصوص نظریئے، فارمولے یا کلیئے کا پابند نظر نہیں آتا بلکہ وہ ان بندھنوں سے آزاد ہے اور اسی آزادی نے اس کے لہجے میں ایسی شدت اور بے باکی پیدا کر دی جس کا نہ کوئی کنارہ ہے اور نہ کوئی حد چنانچہ وہ اپنی تخلیقی بے باکی کا بیاں اس طرح رقم کرتے ہیں

لکھا ہے شعر تو تنقید کی صلیب پہ رکھ
ادب کے باب میں یوں شہر توں کی بات نہ کر
محاذ شعر پہ مجھ کو شکست کیا ہوتی
خیال و فکر کے لشکر مری کماں میں تھے
یہ مت سمجھ کہ شاعری لفظوں کا کھیل ہے
ہر شعر دل کے خون سے لکھنا پڑا مجھے

میں ان شعروں میں چھپے ہوئے اظہار شدت کو محسوس کرتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ گزشتہ ربع صدی سے اس فرنگی غربت کدے میں اپنے بچوں کے لئے اقتصادیات کے پتھر ڈھونڈنے والا بخش اپنی شعری روایت سے اس طرح کیسے جڑ کر رہ سکا کہ لندن میں حلقۂ ارباب ذوق، دبستانِ لاہور اور دبستانِ سرگودھا جیسی ادبی تربیت گاہیں نہ ہونے کے باوجود بخش کا کلام، اس کلام کے ہم پایہ ہے جسے متذکرہ حلقوں کے ناموروں نے بڑی عرق ریزی اور کاوش سے موزوں کر کے اپنے دواوین میں مدون کیا ہے۔ لیکن اس کا سبب بھی بخش خود ہی بتاتے ہیں:

جن کو بجھنا ہو تہِ داماں بھی جل سکتے نہیں
جن کو جلنا تھا وہ طوفانوں میں بھی جلتے رہے

پردیس میں محنت و مشقت کے چراغ روشن کر کے عدم تحفظ کے اندھیروں کو دور کرنا اور آنے والی نسلوں کے مستقبل اور بقا کی ضمانت دینا اس نسل کا کام ہے بخش جس کا نمائندہ ہے۔ بخش ترک وطن کر کے پردیس میں مقیم تو ہو گئے لیکن وہ خود کو اپنی آبائی ثقافت سے منقطع نہیں کر سکتے حالاں کہ لائلپور کا نام بدل کر فیصل آباد ہو گیا۔ مگر بخش لائلپوری بخش لائلپوری رہے اور اگر وہ اس تبدیلی کو قبول کرنے کا خطرہ مول لے لیتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنی آبائی ثقافت سے بھی کٹ کر رہ گئے ہیں۔ مگر بخش نے ایسا نہیں کیا چنانچہ اپنے محنت کشی کے رویئے کو ایک ادبی اور فکری رویئے میں منتقل کر دینے والا بخش ترکِ وطن کے تجربے کو ایک عجیب اذیت کے عالم میں قبول کرتا ہے اور ترکِ وطن کے بعد اس کی باطنی کیفیت کیا ہے ذرا ملاحظہ فرمایئے

جہاں تھا گھر کبھی آباد اپنا
وہاں پر گھر کا اب نقشہ پڑا ہے

یوں ہمارے ہنستے بستے گھروں کی ویرانی کا بیان بخش کے یہاں ایک دردناک چیخ میں تبدیل ہو کر سماعت میں منجمد ہو جاتا ہے۔ ہونٹوں پر خون کی پپڑی نظر آنے لگتی ہے۔ اقتصادی جبر کی بنا پر اختیار کئے جانے والے پردیس میں ایسے میں رونما ہوتے ہیں۔ بخش ان کی تصویر گری کرتا ہے تو پڑھنے والے پر اس کیفیت کا انکشاف ہوتا ہے کہ جو اس ترک وطن کے نتیجے میں مرتب ہوئی ہے

ہر برگ زرد کو کبھی دل سے لگا کے پوچھ
شاید چمن کی داستاں تجھ کو سنا ہی دے
جس کی ہر ایک خشت میں لاکھوں شگاف ہیں
بہتر ہے اس مکان کو اب تو گرا ہی دے

فانی سے وطن تو چھٹا ہی تھا لیکن اب غربت بھی راس نہیں آرہی۔ ہر طرف ایک تنہائی سی تنہائی ہے۔ بخش کے یہاں تنہائی ایک عذاب کی صورت اتری ہے، ایک ایسی تنہائی جس میں تمام انسانی رشتے بکھر کر رہ گئے ہیں۔ بخش انسانوں کے جنگل میں اکیلا کھڑا پکارتا ہے:

اک مسلسل خوف محرومی ہے اور اس کے سوا
بخش لندن میں مرا درد آشنا کوئی نہیں
اس شہر بدنصیب میں رہنے سے فائدہ
جس میں کسی سے رشتۂ ہمسائیگی نہیں

مگر یہ کیسی تنہائی ہے کہ دنیا کے مصروف اور گنجان آباد عروس البلاد لندن کی بھیڑ میں بھی بخش تنہا ہے، بخش کی یہ تنہائی اپنی نوعیت کے اعتبار سے کیسی عجیب تنہائی ہے کہ نہ تو اس تنہائی کے بغیر رہا جاسکتا ہے کہ اب تو اس کی عادت پڑ گئی ہے اور نہ ہی یہ برداشت ہوتی ہے۔ چنانچہ اسے محسوس کر کے شاعر کی اذیت ایک دل دوز چیخ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہی چیخ وہ سنگیت ہے جس کو چھیڑ کر بخش نے اپنی غزل کی موسیقی مرتب کی ہے۔ یہ تنہائی خود عدم اطمینان سے پیدا ہوتی ہے اور پھر اسے پاٹنے کے لئے آج کا انسان پناہ کے گوناگوں بہانے ڈھونڈتا ہے۔ کلب، انجمن، جلسے، سیمینار، کتابیں، چائے نوشی، سنیما وعلیٰ ہذالقیاس۔ ثقافت سے سیاست تک ساری پناہ گاہیں فرد کے عدم اطمینان کی پیداوار ہیں کہ وہ خود سے کبھی مطمئن نہیں رہا۔ اس کیفیت کو بخش کے یہاں انسانی رشتوں کے ابتلا کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، بخش کہتے ہیں:

وطن بھی ایک، تمدن بھی ایک، رنگ بھی ایک
وہ اس ادا سے ملا ہے کہ جانتا ہی نہیں
ہر اک شخص یہاں مصلحت کا بندہ ہے
رہِ حیات میں کوئی کسی کے ساتھ نہیں
منافقانہ چلن میں وہ اتنے مخلص ہیں
بجز ریا کہیں ان کے تعلقات نہیں

بخش کی شاعری ایک ایسی انسانی صورت

حال کا بیان ہے جس میں آج کے پاؤں تلے زمین ہی نہیں رہی۔ تیسری دنیا کے ملکوں کی باہمی رقابتیں، آویزشیں، انسانی آبادی کی وسیع پیمانے پر نقل پذیری کے طوفان اور آندھیاں اجتماعی انسانی معاشرت کا رنگ وروپ چھین کر لے جاتے ہیں۔ فرد سے رشتہ ختم ہو گیا ہے، فاصلے بڑھ گئے ہیں، بدعنوانی کا دور دورہ ہے۔ جسے اہل مغرب نے جنریشن گیپ کا نام دیا تھا وہ پھیل کر والدین اور اولاد کی اعصابی جنگ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ بخش اس صورتحال کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں

؎ حرام رزق پہ جن کی حیات چلتی ہے
وہ اہل شہر کو درس حلال دیتے ہیں
؎ یہ بات بات پہ اب مجھ کو ڈانٹ دیتا ہے
دیار غیر میں بیٹا مرا جوان ہوا

یہ صورت حال بخش کے یہاں یاس، ناامیدی اور اداسی کا منظر ابھارتی ہے اور وہ اپنا ردعمل یوں ظاہر کرتے ہیں

کس کے دامانِ محبت میں پناہیں ڈھونڈیئے
اپنے سائے پر بھی قاتل کا گماں ہے دوستو
ہم یہاں گردوں کے اب تک گھر سلامت ہیں اگر
شہر میں پھر کس لئے اتنا دھواں ہے دوستو

دانشورانِ لندن! یوں میں بخش کو پڑھتا رہا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنے اور بخش کے درمیان فاصلے مٹا سکا ہوں۔ میں اسے مکمل طور پر سمجھنے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اس لئے کہ مجھے تو خود اپنی ذات کی تفہیم کا شمہ بھر بھی دعویٰ نہیں اور جو خود اپنے آپ کو نہ سمجھتا ہو وہ بخش یا کسی دوسرے شخص کو کیا سمجھے گا۔ میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ میں بخش کی شاعری سے خود پر مرتب ہونے والے اثرات بیان کرنے کے بجائے اس تفہیم کی بات کروں جو میری استطاعت اور مقدور ہے۔ بخش ایک بہت اچھا شاعر ہے، بہت بھرپور شاعر ہے، اس نے بڑی لگن سے لکھا ہے اور بہت کچھ لکھا ہے مگر اس نے پچیس برسوں میں جو شعر تخلیق کیا اس کو مقامی رنگ نہیں دے سکا۔ یعنی بخش کا شعر لندن میں نہیں لائل پور میں کہا ہوا لگتا ہے جس کا مطلب ہے کہ بخش کا لندن کا قیام اس کی کارگہِ فکر میں قیام ہی نہیں ہے۔ یہ بات کتنی حیرت انگیز ہے کہ ربع صدی کا سفر اس کی ذات میں اپنی مٹی کا سفر ہے۔ وہ اپنے ماضی، اپنے گھر اور اپنے وطن سے جڑا ہوا ایک ایسا شاعر ہے جس کو اردو کی ترقی پسند روایت کا ایک مستند شاعر قرار دیا جائے گا۔ میں بخش کو رخصت سے پہلے فقط ایک لفظ کہنا چاہوں گا اور وہ ہے۔ ''بخش سفر مبارک ہو۔''

[یہ مضمون ۱۹۸۹ء میں "اردو مرکز، لندن" کے زیر اہتمام "مادشمال" کی تقریب اجراء میں پڑھا گیا۔]

بخش لائلپوری شاعر حق پرست

پروفیسر محمد شریف بقا۔ لندن

اگر تاریخ عالم کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کائنات روز ازل ہی سے حق و باطل کی دلچسپ اور نہ ختم ہونے والی معرکہ آرائی کی مظہر ہے۔ ہر دور میں ہمیں حق و باطل اور بقول زرتشت ظلمت و نور کی رزم آرائی سے واسطہ پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک انسان یہاں موجود ہے اسے کسی نہ کسی شکل میں خیر و شر کی اس باہمی آویزش میں شریک ہونا پڑے گا۔ غالب و مغلوب، حاکم و محکوم اور ظالم و مظلوم کی اس باہمی چپقلش سے عہد حاضر بھی خالی نہیں۔ اگرچہ ظلم و تشدد اور استحصال کے طریقے مختلف رُوپ دھار چکے ہیں تاہم انسانیت کی تذلیل اور انسان کشی کا یہ سلسلہ اب بھی کسی نہ کسی رنگ میں جاری و ساری ہے۔

ظلم اور بدی کی قوتوں کا مقابلہ کرنے والے مختلف محاذوں پر اب بھی اپنے انقلابی اور مدافعت آمیز پروگرام پر عمل پیرا ہیں۔ ایسے ہی بہادر، بے باک اور عہد آفریں لوگ ناسازگار حالات اور حوصلہ شکن موانعات کا ڈٹ کر مقابلہ کر کے جریدۂ عالم پر اپنا نقش ثبت کیا کرتے ہیں۔ ہر دور میں ایسی سعید روحیں حق و صداقت کی راہ پر چل کر دوسرے انسانوں کو منزلِ نجات سے روشناس کراتی رہی ہیں۔ دیگر مصلحین کی مانند انسان دوست اور انقلابی شعراء و ادباء بھی معاشرتی زندگی کو نکھارنے کے لئے قابلِ قدر اضافہ کرتے رہے ہیں۔ شعر و ادب محض زندگی کا ترجمان ہی نہیں بلکہ وہ اس کا ناقد بھی ہے۔ اس لحاظ سے شاعروں اور ادیبوں کی معاشرتی اور انسانی ذمہ داریوں کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بخش لائلپوری صاحب کی شاعری کا مرکز و محور انسانی محبت ہے۔ یہی جذبہ محبت انہیں ظلم و ستم، استحصال پسند لوگوں کی غلط روش، صاحبانِ اقتدار کی عوام فریبی، مذموم نظام معیشت، انسانیت کش سیاسی اصولوں اور معاشی انحطاط پر مبنی اقدار کے خلاف صدائے انقلاب بلند کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ سوسائٹی کے ان رستے ہوئے ناسوروں کو دیکھ کر انہیں شدید ذہنی کوفت ہوتی ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنے شعروں میں جابجا کیا ہے۔ ان کی کوئی بھی غزل اور نظم انسانی محبت کے ان جذبوں سے خالی نہیں۔ مذہب، اخلاقیات، معاشرتی اطوار، اقتصادی نظام، شعر و ادب اور سیاسی انتشار پر تند و تیز شعری تنقید ان کی انسانی دوستی کی عکاس نظر آتی ہے۔ وہ سوسائٹی کے مروجہ نظام کو تہہ و بالا کرنے کے لئے بار بار اپنے مخاطبین کو

دعوت عمل دیتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے ان کی شاعری کے ڈانڈے ادب کی انقلابی روایات سے جا ملتے ہیں۔ کئی صدیاں پیشتر علامہ اقبال کے محبوب شاعر رومیؒ نے اپنے زمانہ کی انسانیت سوز قدروں سے بے زار ہو کر صحیح قسم کے انسانوں کی آرزو کرتے ہوئے کہا تھا

کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

رومی کی طرح جرمنی کا مشہور فلسفی نطشے "سپر مین" اور علامہ اقبال بھی "مرد مومن" کے متلاشی تھے۔

بخش لائلپوری صاحب کی شاعری بھی صحیح انسانی اقدار کی جستجو کی آئینہ دار دکھائی دیتی ہے۔ ان کی رائے میں غلط، ظالمانہ اور استحصالی نظام خصوصاً اقتصادی نظام معاشرتی فساد اور اخلاقی گراوٹ کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ اس معیار پر ہر چیز کے حسن و قبح کو دیکھنے کے عادی ہیں۔ ان کی بعض آراء اور مخصوص نظریات سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن ہم ان کی انسان دوستی اور خلوص کے جذبات سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ بقول اقبال ان "خون جگر" سے "معجزۂ فن" کی نمود ممکن ہے۔ وہ صرف آمد پر ہی تکیہ نہیں کرتے بلکہ اپنے اظہار بیان کو زیادہ موثر اور واضح بنانے کے لئے موزوں الفاظ کی تلاش میں بھی رہتے ہیں۔ اس طرح ان کا فن درجہ بدرجہ آگے بڑھتا رہا ہے۔ بادشمال سے پہلے ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ میری رائے میں "باد شمال" ان کے اسی فنی ارتقا اور شعری محاسن کی طرف بڑھتا ہوا نیا قدم ہے۔ جہان تازہ کی ہمیشہ 'افکار تازہ' سے نمود ہوا کرتی ہے۔ پرانی روش پر چلتے رہنے سے شعر و ادب کی دنیا میں تازگیٔ فکر اور ندرت خیال کا سراغ لگانا ناممکن ہوتا ہے۔ بخش صاحب کے اشعار اگرچہ غزل کی قدیم روایت کے کلیتہً حامل نہیں ہیں تاہم ان میں غزل کی چاشنی ضرور موجود ہے۔ غزل کی جدید روایت داخلیت اور خارجیت دونوں عناصر کی ترجمان ہے کیونکہ اس میں غم جاناں ہی بیان نہیں کیا جاتا بلکہ غم دوراں کی روح کو بھی سمویا جاتا ہے۔ جو شاعر زندگی کے حقائق اور کائنات کے گوناگوں مظاہر کو اپنی قلبی واردات اور ذہنی کیفیات کا عکاس نہیں بناتا، اس کی شاعری دیرپا، جاندار اور جاذب ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو جایا کرتی ہے۔ شاعر اگر واقعی "دیدۂ بینائے قوم" ہو تو پھر لامحالہ وہ افراد قوم کے دکھ درد سے غافل نہیں رہ سکتا۔ شاعری محض اظہار ہی نہیں بلکہ یہ ابلاغ (Communication) بھی ہے۔ یہاں اس امر کی صراحت لازم ہے کہ شاعری اگر صرف پروپگنڈہ ادب کی نقیب ثابت ہو تو وہ اعلیٰ شعری محاسن اور فکری اصابت رائے کی حقدار نہیں بن سکتی۔ شاعر کو یہاں بڑی احتیاط سے پروپگنڈہ اور شعریت میں حدِ فاصل قائم کرنی چاہئے ورنہ اس کی شاعری روکھی پھیکی تبلیغ کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس حقیقت کو بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ ہر بڑا شاعر اپنے عہد کی تخلیق ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی عظمتِ فکر، فنی معراج، اعلیٰ اقدار کی ترجمانی اور آفاقی تناظر کی بدولت

اپنے زمانے کا خالق بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی ادیب، فنکار اور شاعر اپنے دور کی نشاۃِ ثانیہ اور فکری انقلاب کے علمبردار ثابت ہوا کرتے ہیں۔ بخش صاحب کی موجودہ کتاب میں ہمیں ان کی داخلی واردات میں خارجی حالات کے واضح نقوش، انسانی تکریم کی آرزو، اصلاح معاشرہ کی شدید لگن اور انسانی دکھوں کے شدید احساسات دکھائی دیتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی انقلابی روح کو انسانی محبت سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ وہ اپنی شاعری کے اس بنیادی جذبے کے اظہار کے لئے صنائع و بدائع کی نسبت سادگی بیان کو افضل گردانتے ہیں تاکہ ان کے قارئین حسین الفاظ کی بھول بھلیوں ہی میں گم ہو کر ان کے خیالات کی حقیقی روح سے ناآشنا نہ رہیں۔ اس لحاظ سے الفاظ کو وہ محض ذریعۂ اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں خیال لفظ سے، خارجیت داخلیت سے، زندگی شعر سے خلوص تصنع سے اور سادگیٔ بیان ابہام سے زیادہ اہم اور قابل قدر ہیں۔ ارباب حقیقت کبھی الفاظ کے چکر میں نہیں الجھا کرتے جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے ؎

الفاظ کے چکر میں الجھتے نہیں دانا
غوّاص کو مطلب ہے گہر سے کہ صدف سے

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کبھی تمام کمالات فن پر محیط نہیں ہو سکتا۔ قدرت نے ہر انسان کو مخصوص محدود صفات سے نوازا ہے۔ اس لئے معراج فن کو پانے کے باوجود بھی وہ عالم کل اور عقل ہمہ گیر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس اعترافِ عجز ہی میں اس کی عظمتِ کردار کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ کائنات رنگ و بو لحہ بہ لحہ ارتقائی مراحل طے کر کے آگے بڑھتی رہتی ہے اور انسان اس کے تغیرات اور ہنگامہ ہائے نو بہ نو کو معلوم کرنے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ انسان کی محدود عقل قدرت کے لامحدود امکانات کا کلی اور حتمی سراغ لگانے سے قاصر ہے۔ فلفی فلسفہ کی مدد سے، سائنس داں سائنس کی بدولت، صوفی نور باطن کے سہارے اور شاعر فکر و احساس کی شمعِ فروزاں کے ذریعے اسرار کائنات اور رموز حیات کے چہرے سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان سب کی منزل تو تلاشِ حقیقت ہے۔ مگر وہ راستے مختلف اختیار کرتے ہیں۔ اپنے اپنے مخصوص میدان میں نمایاں ترقی کرنے کے باوجود عظیم متلاشیانِ صداقت نے کبھی ''عقل کل'' ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس نقطۂ نگاہ سے عظیم شعراء نے بھی اپنے فنِ شعر کو اکمل قرار نہیں دیا۔ کسی شاعر کے کلام کو نقائص و معائب سے مبرا قرار دینا اسے الوہیت کا درجہ دینے کے مترادف ہے۔ کسی بڑے سے بڑے شاعر کا کلام بھی ہمیشہ ایک سطح پر قائم نہیں رہا اس لئے بخش صاحب کی شاعری کو بھی اس معیار پر پرکھنا چاہئے۔ کسی فن پارہ میں چند غیر ارادی فنی اسقام کا وجود اسے ''شجر ممنوعہ'' نہیں بنا دیا کرتا۔ اصل چیز تو شاعر کا خلوصِ فن اور قابلِ ستائش انسانی اقدار کا اظہار ہے۔ بخش صاحب کی شاعری بھی اس فکری ارتقا کی عکاسی کر رہی ہے۔ شاعر محنت شاقہ، گہرے تجربات اور وسیع

مطالعہ کی وجہ سے بتدریج مراحل ترقی کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ۔ نقاش، نقش ثانی بتر کشد ز اول

اس عمل مسلسل اور جد و جہد سے علوم و فن میں پختگی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ اب یہاں وہ چند اشعار ہدیۂ قارئین کئے جاتے ہیں جس سے بخش صاحب کی شاعری کے مختلف پہلو ہماری نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ چند اشعار ان کے شعر کے متنوع خیالات و احساسات کے مظہر ہیں۔

پڑا ہے جس کو بھی رزقِ حرام کا چسکا
مرے خدا! تو اسے لذّت حلال بھی دے

ہمارا شہر تو چھوٹا ہے لیکن
ہمارے شہر کا مقتل بڑا ہے

شب سیہ سے کئی آفتاب ابھریں گے
یہ حرف حق ہے، اسے ذہن سے نکال نہیں

اٹھائیں کس طرح بار تبسم
گلوں کے جسم کانٹوں میں جڑے ہیں
عمل پیرا کسی پر بھی نہیں ہم
ہمارے پاس منصوبے بڑے ہیں

کھلا فریب تھی تقسیمِ رزق و دولت کی
یہ شرمناک روپے بھی اہلِ زر کے تھے

یہ اور بات، کتنوں کو کچھ خبر نہ ہوئی
لگا رہے تھے محافظ مگر نقب کب سے
سمندروں سے کوئی موج سر بلند اٹھے
کہ ساحلوں پہ تڑپتے ہیں جاں بلب کب سے

ہم رہتے تو ہیں لیکن دلوں میں
زمین و آسماں کا فاصلہ ہے
ہم اپنے گھر کو خود ہی ڈھا رہے ہیں
خدا جانے ہمیں کیا ہوگیا ہے

مجھے انقلابی بصیرت ملی ہے
ضیا پاش میرے لہو کے دیے ہیں

بخش لائلپوری ایک خاص اسلوب کا شاعر ہے اور اس کی شاعری اجتماعی درد و کرب کے خلاف اعلان جنگ ہے اور مزاحمتی ادب میں ایک خاص مقام کی حامل ہے۔ بخش آفاقی محبت کا قائل ہے۔ اس نے انسانی زندگی کی محرومیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے وہ شاعری کو ایک تخلیقی عمل گردانتا ہے۔ اسی نقطۂ خیال کی وضاحت میں چند اشعار پیش خدمت ہیں

بھیگا ہوا لہو میں ہے لفظوں کا پیرہن
خوں باریٔ غزل مرے فن کی اساس ہے

زیرِ خنجر بھی اپنے لب پر
زندگی کے سوال آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں اچانک
کیسے کیسے خیال آئے

دارِ ستم پہ جھوم کے چڑھ جا
دیوانے! منصور بنے گا

مرے حریف مجھے روند کر نکل نہ سکے
فصیلِ سنگ کی صورت کھڑا میں راہ میں تھا
مہک رہے تھے نفس میں گلاب سپنوں کے
کھلی جو آنکھ تو دیکھا میں قتل گاہ میں تھا

رگیں کٹیں تو چلا خون روشنی کی طرح
ہمیں تو موت بھی آئی عجب وقار کے ساتھ

ظلم جتنا شدید ہوگا
چیخ اتنی بلند ہوگی
میرے شعروں کی آتشیں لو سے
ظلمتوں میں چراغ جلتے ہیں

اب آپ "بادِ شمال" کے مختلف جھونکوں کی ٹھنڈک، گرمی، نرمی اور شدت کا خود اندازہ لگائیں اور خود اپنی رائے قائم کریں کہ شاعر کس حد تک اپنے اور آپ کے جذبات و افکار کی صحیح تصویر کشی کر سکا ہے۔ شاعر نے اپنا سرمایۂ فکر و نظر آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب کمی اور بیشی کا آپ حساب لگاتے رہیں۔

بخش لائلپوری کی تازہ، توانا اور تہہ دار شاعری کسی سرٹیفیکیٹ کی محتاج نہیں ہے۔ موجودہ دور کے اکثر شاعر اپنا مافی الضمیر تلمیحات کے گورکھ دھندے میں کچھ اس طرح الجھا کر بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے ہر راستہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن بخش لائلپوری اپنے بچاؤ کے لئے کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑتا۔ یہ بڑے حوصلہ کی بات ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ بخش کی یہ خوبصورت احتجاجی اور موثر آواز انگلستان کی فضاؤں میں ہی دب کر نہیں رہنی چاہئے اسے سات سمندر پار جانا چاہئے۔

ڈاکٹر عقیل رضوی
صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی

"بادِ شمال" کا ایک سرسری جائزہ

پروفیسر سلیم اختر

ترقی پسند ادب کی تحریک اپنے وقت کی اہم ترین اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد نزاعی تحریک بھی تھی۔ حکومتوں کے دباؤ، بنیاد پرستوں کی مخالفت، ملاؤں کی معاندانہ شعلہ فشانیوں، رجعت پسندوں کی پیدا کردہ رکاوٹوں اور بحیثیت مجموعی نامساعد حالات کے باوجود یہ تحریک نصف صدی کی تخلیقی زندگی بسر کر گئی تو یہ بذات خود تاریخ ادب کا اہم واقعہ ہے کیونکہ (اردو ادب و نقد کی حد تک تو) بہت کم ایسی تحریکیں نظر آئی ہیں جنہوں نے اتنے طویل عرصے تک تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ ناقدین اور قارئین کو متاثر کئے رکھا ہو

اس کا بنیادی باعث تاریخی حالات کا جبر اور تیسری دنیا کے عوام کی ذہنی پسماندگی اور معاشی استحصال ہے۔ اسی لئے خوش آئند مستقبل کی صورت میں یہ تحریک جو خواب دکھاتی ہے وہ انفرادی سطح سے بڑھ کر اجتماعی روپ اختیار کر لیتی ہے اور اسی میں اس کی مقبولیت کا راز مضمر ہے لیکن کیا ایسا صرف تحریک اور اس کے تخلیقی، تنظیمی اور سیاسی پہلوؤں کی بنا پر ہی ممکن ہو سکا؟ یہ میرے خیال میں ایسا نہیں۔ اس لئے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے پہلے بھی ترقی پسندی کا احساس موجود تھا بلکہ یہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ رومانیت اور رومانی طرز احساس کی مانند۔ رومانیت کی ادبی تحریک ختم ہو گئی مگر رومانی طرز احساس ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ اسی طرح ترقی پسندی بصورتِ طرزِ احساس تخلیق کاروں اور ان کے تخلیقی رویوں میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اسی لئے تو ایک شخص یا تخلیق کار ترقی پسند ادب کی تحریک کا رکن بنے بغیر بھی ترقی پسند ہو سکتا ہے جبکہ کسی اور کے لئے شہرت طلبی، سمجھوتہ پسندی اور مواقع پرستی کی بناء پر اچھے خاصے کیریئر کی صورت بھی اختیار کر سکتی ہے اور اسی طرز احساس کی بنا پر بعض ترقی پسندوں کے مقابلے میں غیر ترقی پسند زیادہ سچے اور کھرے ثابت ہوتے ہیں اور یہ طرز احساس ہی تو ہے کہ زمانی بُعد کے باوجود غالب اور فیض ایک سطح پر آ جاتے ہیں ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہ غالب نے کہا تھا اور فیض یہ کہتے ہیں ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

اور لندن میں بیٹھ کر بخش لائلپوری یہ کہتا ہے۔

حرف و بیاں کا ایک سلگتا شہر ہمارے اندر ہے
رزم گہِ ابطال میں روشن صدقِ بیاں کا جام کریں

بخش لائلپوری ترقی پسند ادب کی تحریک سے تنظیمی طور پر وابستہ ہے یا نہیں، مجھے اس کا علم نہیں لیکن جہاں تک اس کی شاعری کا تعلق ہے تو اس میں ترقی پسندانہ طرزِ احساس بڑی متنوع اور بھرپور قوت میں اظہار پاتا ہے۔ تازہ مجموعہ ''بادِ شمال'' سے پہلے وہ ''لہو کا خراج'' اور ''زندانِ شہر'' کی صورت میں دو مجموعے پیش کر چکا ہے مگر شاعرانہ طرزِ احساس کی حد تک ان تینوں مجموعوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا اور یہ شعر بخش کے شاعرانہ مقاصد کے لئے سرنامہ کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔

پرورش خونِ جگر سے جس کی ہوتی ہے سدا
سینۂ شاعر کے اس ذوقِ نمو کی بات کر

اور جب ''سینۂ شاعر کے ذوقِ نمو'' نے تخلیقی سطح پر اظہار پایا تو بخش نے اس انداز و اسلوب کی شاعری کی:

ہمارا شہر تو چھوٹا ہے لیکن
ہمارے شہر کا مقتل بڑا ہے

اڑے جو ہم تو قفس کو بھی ساتھ لے کے اڑے
یہ معجزے بھی ہمارے ہی بال و پر کے تھے

پناہ مانگی تھی یخ بستگیٔ موسم سے
چڑھی وہ دھوپ کہ اب سایۂ شجر بھی گیا

نوکِ زباں پہ خار کو رکھنا پڑا مجھے
اپنے لہو کا ذائقہ چکھنا پڑا مجھے

کئی برس کے مسلسل قیام کے بعد اب
کھلا یہ ہم پہ کہ آفت زدہ مکان میں تھے

ترس رہا تھا جو خود ایک ایک قطرے کو
فرات و دجلہ بھی اس شخص کی امان میں تھے

قفس نصیب نے اب کے وہ قید کاٹی ہے
دل و دماغ سے احساسِ بال و پر بھی گیا

لوح و قلم کتاب کیا تن کا لباس بھی
ہر شے ادھار کی مرے بچوں کے پاس ہے
اوڑھ کر بدنامیٔ الفاظ کی تن پر قبا
بزمِ عریانی میں تیرا اونچا سر ہو جائے گا

دلِ غریب نے جب آسماں پہ دستک دی
صدا یہ لوٹ کے آئی وہاں خدا ہی نہیں

جہاں پہ ملا مجھ کو گھر سا سکوں
جو دیکھو تو وہ اپنا گھر بھی نہیں

ظلمت کے سناٹے میں
بولنے والا بولے گا

مکیں اس مکاں کے ہوئے خوش گماں ہیں
نہ چھت ہے نہ دیوار جس کی نہ در ہے

یہ چند اشعار کسی شعوری انتخاب کا ثمر نہیں کہ بخش لائلپوری کا سارا کلام ایسے ہی افکار و اشعار کا مرقع ہے۔

مقصدی شاعری کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ شعوری کاوش کی بنا پر شعر مقصد کی کھونٹی پر میلے کپڑے کی مانند لٹکا رہ جاتا ہے۔ یوں شعر اشتہار بن جاتا ہے اور ''استعاری نعرہ''۔ ترقی پسند ادیبوں پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا رہا ہے۔ ایسا اعتراض جس میں بڑی صداقت ہے۔ بخش لائلپوری کو بھی یہ احساس ہے کہ شعر کو ہر قیمت پر شعر رہنا چاہیے۔ اور مقصد کی قرباں گاہ پر اسلوب کے جمالیاتی اوصاف کی بھینٹ نہ چڑھائی جائے۔ اسی لئے تو وہ اس امر پر بطور خاص زور دیتا ہے

شعر کو بے رنگ کر دیتی ہے لہجے کی چبھن
استعاروں سے مزین گفتگو کی بات کر

بخش لائلپوری کا مجموعہ ''باد شمال'' چند نظموں (جیسے ''اے خدائے خشک و تر'' اور ''مرا اس شب سے رشتہ ہے'') کو چھوڑ کر غزلیات پر مشتمل ہے لیکن بخش کو ان روایتی غزل گو شعراء میں شمار نہیں کیا جا سکتا جن کی غزل جسم و جاں کا نوحہ ہوتی ہے، جو گل و بلبل کی حکایت سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور جن کی بے خواب راتوں کا مقصد محض اختر شماری ہے۔ اس کے برعکس بخش لائلپوری کی غزل میں نظم کا جاہ و جلال ملتا ہے۔ بالعموم اس کی غزل مسلسل ہوتی ہے کہ ایک جذبہ ایک سوچ اور ایک درد منتشر اشعار کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ابتدائی دو نظموں میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی بعض غزلیں انہی کی توسیع معلوم ہوتی ہیں۔ ''اے خدائے خشک و تر'' خدا کے حضور ''شکوہ'' بھی ہے اور ''دعا'' بھی

اے خدائے خشک و تر
تیری بارگاہ میں
جھک رہی ہے ہر نظر
سر بہ خم ہے اک جہاں
سجدۂ خلوص میں
اٹھ رہے ہیں اپنے ہاتھ
اب دعا کے واسطے
اس کٹھن کے دور میں
رحمتوں کی اک نظر
زندگی کے دشت پر

بھیج دے تو اس طرف
اک ہوائے تازہ تر
اک صدائے بت شکن
اک رسولِ خوش کلام
اک مسیحِ معتبر
جو نوائے درد سے
گنبدِ سکوت کی
خامشی کو توڑ دے
رمزِ کائنات کا
معنئ حیات کا
بھید ہم پہ کھول دے
(نظم کا اختتامیہ)

اور دیکھا جائے تو تخلیقی سطح پر اکثر غزلیں اس دعا کی بازگشت میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ان غزلوں میں بخش نے انداز و اسلوب بدل بدل کر ایک ہی بات ایک ہی دکھ اور ایک ہی کرب جسے ہم کرب ذات یا کرب حیات کا نام دے سکتے ہیں، کا اظہار کیا ہے۔

محاذِ فکر پہ مجھ کو شکست کیا ہوتی
خیال و فکر کے لشکر مری کمان میں تھے

زبان دی ہے تو پھر جرأتِ سوال بھی دے
شہیدِ حرف کو رعنائی خیال بھی دے

عطا کیا ہے اگر منصبِ سخن مجھ کو
قلم کے ساتھ مجھے حرفِ لازوال بھی دے

وبالِ جاں ہے یہ آسودگی بھی منزل کی
سفر نصیب کو اندیشۂ ملال بھی دے

بخش اپنے لائلپور (حال فیصل آباد) سے دور لندن میں رہائش پذیر ہے مگر اس نے وہاں کی زرق برق زندگی سے مسحور ہو کر فکر و شعور کی آنکھیں بند نہیں کیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وطن کی مٹی سے اس نے اپنا جذباتی رشتہ منقطع نہیں کیا۔ چنانچہ سات سمندر پار بیٹھا بھی وہ وطن اور اہل وطن کے بارے میں کڑھتا ہے یہاں کے ماحول میں جواب ایک مسلسل گھٹن اور جبر رہتا ہے وہ لندن میں بھی اسے بے چین رکھتا ہے۔ چنانچہ اپنی وطن دوستی میں وہ اتنا پختہ اور سچا ہے کہ اگر لندن میں اس کی مستقل رہائش کا علم نہ ہو تو بلا شبہ اس کی شاعری ایک حساس پاکستانی کی شاعری محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے جب وہ یہ کہتا ہے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے:

مارشل لاء میں جو ہوئے پیدا
مارشل لاء ہی میں جواں ہوں گے

جب کوئی ابھرا جہاں میں صورتِ تارا مسیح
کردیا قربان ہم نے سر کسی منصور کا

لندن کے قیام نے بھی اس کے شاعرانہ احساسات پر اثرات ڈالے ہیں مگر یہ احساسات اجتماعی نہیں۔ نہ ہی ان کا شعور وہاں کی تہذیب کے تضادات سے جنم لیتا ہے اور نہ ہی ان میں مغربی سیاست کی بازی گری پر احتجاج ہے۔ یہ احساسات ذات سے وابستہ ہیں اس لئے بلحاظ نوعیت نجی قرار پاتے ہیں۔ جیسے یہ اشعار

یہ بات بات پہ اب مجھ کو ڈانٹ دیتا ہے
دیارِ غیر میں بیٹا مرا جواں ہوا

مرے شعروں کی آتشیں لو سے
ظلمتوں میں چراغ جلتے ہیں

ہم سے شمعِ سخن فروزاں ہے
شہر لندن میں ہم ہی رہتے ہیں
مے کدہ بک گیا ہے جب سے بخش
دودھ پیتے ہیں شعر کہتے ہیں

اک مسلسل خوفِ محرومی ہے اور اس کے سوا
بخش لندن میں مرا دردآشنا کوئی نہیں

اب ذرا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیں۔

یہ اور بات کینوں کو کچھ خبر نہ ہوئی
لگا رہے تھے محافظ مگر نقب کب سے

نہ حوصلہ ہے دعا کا نہ آہ پر ہے یقیں
کہ ہم سے روٹھ گیا ہے ہمارا رب کب سے

بیٹھے بیٹھے ہمیں اچانک
کیسے کیسے خیال آئے
زیرِ خنجر بھی اپنے لب پر
زندگی کے سوال آئے
جان لیوا ہے بادِ مغرب
اب تو بادِ شمال آئے

اور پھر وطن کی محبت کا بانداز دگر اظہار ہوتا ہے۔

دارِ ستم پر جھوم کے چڑھ جا
دیوانے! منصور بنے گا
سر نہ جھکاؤ ظلم کے آگے
ورنہ یہی دستور بنے گا
ہم کو یقیں ہے اپنا مرقد
ارضِ وطن سے دور بنے گا

بخش، بہ حیثیت فرد کی کئی مجبوریاں ہو سکتی ہیں، ایسی مجبوریاں جنہوں نے ارضِ وطن سے اسے دور رکھا مگر بہ حیثیت شاعر بخش عمر بھر میں ہی رہا ہے وہ کبھی بھی لندنی نہ بن سکا۔ اس نے وطن سے اور شعر و ادب کے مراکز سے بہت دور بیٹھ کر جن فنی ریاضتوں جن فنی تقاضوں کی تکمیل اور جن فکری

زاویوں کو اپنایا وہ بد صورتی، ظلم اور جبر کی شب تار کو ختم کر کے حسن و عدل اور مساوات کے روشن خواب سے مشروط ہیں اور اس فکری جہاد اور عمل میں نہ صرف وہ کامیاب رہا بلکہ بعض امور کی حد تک وہ فرضِ کفایا بھی ادا کرتا نظر آتا ہے اور یہی اس کے شعری شعور اور فکری گہرائی کا نقطہ عروج ہے۔ شاید اسی لئے وہ یہ دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔

بھیگا ہوا لہو میں ہے لفظوں کا پیرہن
خونباریٔ غزل مرے فن کی اساس ہے

انہیں یہ زعم ہے اس کو وہ مٹی میں ملا دیں گے
ہمیں دعویٰ زمیں کا پیٹ سچائی اگل دے گا

بخش ہم اہلِ قلم پابندیوں کے باوجود
بحرِ دل سے فکر کے موتی اگلتے ہی رہے

تمام اہلِ قلم نے قلم کشائی کی
لکھا جو ہم نے وہی حرفِ لازوال ہوا

ہمارے گھر میں ہوا کے ہر ایک جھونکے پر
کسی کے آہنی قدموں کا احتمال ہوا

لکھا ہے شعر تو تنقید کی صلیب پہ رکھ
ادب کے باب میں یوں شہرتوں کی بات نہ کر

گزرے وہ سامنے مری قد آوری کے ساتھ
بے قامتوں کے سامنے جھکنا پڑا مجھے

سمندروں سے کوئی موج سر بلند اٹھے
کہ ساحلوں پہ تڑپتے ہیں جاں بلب کب سے

میں حرفِ حق بھی زباں پر نہ لا سکا کہ جہاں
دروغ گوئی کمالِ حیات ٹھہری ہے

گاڑے ہیں میرے جسم میں ہر بوالہوس نے دانت
میرے لہو میں دوستو! کتنی مٹھاس ہے

ہمیں ہر آن بچھڑنے کا احتمال رہا
تمہارے قرب میں جب تک رہے اداس رہے

رگیں کٹیں تو چلا خون روشنی کی طرح
ہمیں تو موت بھی آئی عجب وقار کے ساتھ

حیاتِ دہر کی رنگینیاں نہ پوچھ ہمیں
لہو لہو ہے بدن سنگ روزگار کے ساتھ

ظلم جتنا شدید ہوگا
چیخ اتنی بلند ہوگی
بخش ہمارا حرفِ صداقت
انسانی منشور بنے گا

بخش لائلپوری زندہ ادب کا شاعر

جاوید شاہین

ایک اچھے شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے کسی عام تجربے کو شعری تجربہ بنا دیتا ہے۔ یہی صلاحیت اسے دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہی صلاحیت اسے دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک عام آدمی جب کسی واردات سے گزرتا ہے تو خواہش کے باوجود عجز بیان اس کی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ایک تخلیقی شاعر اس کے تجربے کو زبان دے دیتا ہے اور قاری یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاعر نے تو گویا اس کے دل کی بات کہہ دی ہے۔ یوں شاعر اور عام آدمی کے درمیان ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اگر شاعر اپنے اس عمل کو جاری رکھے تو یہ رشتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ استوار ہونے لگتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے نزدیک تر آتے چلے جاتے ہیں۔

ہمارا ادیب جس معاشرے جس نظام میں رہ رہا ہے وہ نہ تو اس سے مطمئن ہے اور نہ ہی خوش ہے۔ وہ اپنی اس بے اطمینانی اور ناخوشی کا اظہار اپنی تحریروں میں کرتا رہتا ہے۔ وہ اس معاشرے اور نظام زندگی سے اکتایا ہوا ہے۔ اسی لئے وہ اس نظریہ کو خوش آمدید کہتا ہے جو اس نظام کو بدلنے پر زور دیتا ہے اور انسان کو اس کے دکھوں، اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور ظلم سے نجات دلوانے کا مژدہ سناتا ہے۔ بخش لائلپوری اسی نظریے کا شاعر ہے اور یہی اس کی شاعری کا بنیادی تجربہ ہے۔ ایک طبقاتی معاشرے میں انسان جس بے حرمتی اور تذلیل سے گزر رہا ہے اس کا دکھ بخش لائلپوری کی شاعری کی خصوصیت بن گیا ہے اور دکھ کا ذکر اس کے اشعار میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

نوکِ زباں پہ خار کو رکھنا پڑا مجھے
اپنے لہو کا ذائقہ چکھنا پڑا مجھے
گزرے وہ سانحے مری قد آوری کے ساتھ
بے قامتوں کے سامنے جھکنا پڑا مجھے

صلیبِ فکر پہ تکمیل ذات ٹھہری ہے
ہم اہل حق کی یہی کائنات ٹھہری ہے

مشاہداتِ ستم پر، ستم گرانِ جہاں
غلافِ چشم سے آنکھیں نکال دیتے ہیں

قلب و جگر میں خنجر اترے
جسم و جاں میں نیزہ ناچے

وقت کی دیمک چاٹ گئی ہے سایہ دار درختوں کو
دھوپ میں ہم کس پیڑ کے نیچے پل دو پل آرام کریں

لیکن شاعر کا صرف یہی منصب نہیں کہ وہ جو کچھ زندگی میں دیکھے اسی شکل میں اس کو پیش کردے۔ اسے اس سے بہت آگے دیکھنا ہے۔ اسے عوام کو ایک نئی اور بہتر زندگی کا مژدہ سنانا ہے اور ایسی زندگی کی تخلیق میں مدد دینی ہے۔ مایوسی اور بے یقینی میں گرفتار آج کے انسان کو امید کی کرن دکھانی ہے جو اس کے لئے زندگی کی کشش کو برقرار رکھ سکے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اپنے فرائض سے کوتاہی برتنے کا مرتکب ہوتا ہے۔ بخش لائلپوری اپنے ان فرائض سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس کا سماجی اور سیاسی شعور اس قدر پختہ اور ترقی یافتہ ہے کہ زندگی کے ہر لمحے، ہر آن پر اس کی نظر ہے۔ لیکن اس کا سیاسی شعور اسے فن کی دنیا سے دور نہیں لے جاتا۔ سیاست کی بات کرتے وقت بھی اس کے قدم فن کی سر زمین پر مضبوطی کے ساتھ گڑے رہتے ہیں وہ صرف سیاست کے تقاضوں کی بات نہیں کرتا بلکہ ادب کی ضروریات کو بھی سمجھتا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ سیاسی ادب بڑا ادب نہیں بن سکتا۔ اس ضمن میں عام طور پر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ کسی عام واقعہ کے رد عمل کے طور پر سیاسی شاعر کے یہاں جو جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ ابھی پختہ اور گہرا بھی ہونے نہیں پاتا کہ فوراً اظہار پالیتا ہے۔ چنانچہ ایسے اشعار میں گہرائی نہیں ہوتی۔ وہ سپاٹ اور یک رنگ ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی گہری معنویت بھی نہیں ہوتی یعنی سیاست ہلکے پیٹ کی ہوتی ہے۔

اگر مذکورہ بالا دلیل کو تسلیم کرلیا جائے تو سیاسی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ بے کار ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ میں شروع ہی میں ہی کہہ چکا ہوں کہ ایک اچھا شاعر زندگی کے عام تجربے کو شعری تجربہ بنادیتا ہے اور اس عمل سے وہ عوام کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال، فیض، جذبی، مخدوم، ساحر اور بعض دوسرے ترقی پسند شعراء کی شاعری ہمیشہ پڑھی جائے گی۔

بخش لائلپوری بطور شاعر ایک بیدار مغز اور باشعور انسان ہے۔ زندگی اور معاشرے کے مظاہر سے اس کا تعلق ایک سلجھے ہوئے انسان جیسا ہے۔ انسانی معاملات میں بطور شاعر اس کی دلچسپی حرکی بھی ہے اور زندہ بھی۔ اس کے تخیل کے دروازے ہر وقت انسانی تجربات پر کھلے رہتے ہیں۔ اس کے یہ شعر میرے بیان کی صداقت کے لئے کافی ہوں گے۔

دیکھ تو کائنات ہے اک جلوہ گاہِ رنگ
سوچ تو ایک کوکھ ہے آلام گاہ کی

ڈسنے لگا جو سایۂ دیوار و در تو ہم
گھر سے نکل کے آگئے جلتی دوپہر میں

جاں سے ہمیں عزیز ہے دل کا لہو مگر
اس تلخیٔ حیات نے ارزاں بنا دیا

مظلوم کی مدد کو تو نکلا نہیں کوئی
اہل ستم کے حق میں دلیلیں نکل آئیں

دربار شہر یار میں بیٹھے ہیں اس طرح
جیسے کسی بھی شخص کے کندھوں پہ سر نہیں

جس کی ہر ایک خشت میں لاکھوں شگاف ہیں
بہتر ہے اس مکان کو تو اب گرا ہی دے

ادب احساسِ حسن، عرفانِ ذات اور حقیقت کا شعور بخشتا ہے۔ دوسروں کے درد کو سمجھنے اور اپنے غم کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ ادب انسان کو انسانی تعلقات کی روشنی میں دیکھتا ہے اور ان بنیادوں کو مضبوط کرتا ہے جن پر ایک صحت مند معاشرے اور تمدن کی تعمیر کی جاسکے۔ بخش لائلپوری کی شاعری میں یہ ساری خصوصیات موجود ہیں۔ اس کی شاعری ذہن میں کشادگی اور آزادی پیدا کرتی ہے۔ اس کی کومٹ منٹ اپنے ضمیر کی آواز اور ایک روشن اور خوش حال معاشرے کی تعمیر سے ہے۔ وہ اپنے شعر کی وساطت سے اجتماعی مفاد کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے اور معاشی ناانصافی ختم کرنے کے درپے ہے۔ اس حوالے سے وہ عوام کی سب سے بڑی خدمت میں مصروف ہے۔ اس کے برعکس جو شاعر اور ادیب ثقافت اور تہذیب کے دائرے میں سامراج کے پھیلے ہوئے نظریات کے خلاف جدوجہد میں شریک نہیں ہیں وہ اپنے قومی فریضے سے روگردانی کرتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں زندگی کی مثبت اقدار درہم برہم ہو چکی ہیں۔ زندگی کا حسن قریب المرگ ہے۔ پورا معاشرہ تعفن سے بھرا ہوا ہے۔ یہ کسی اعتبار سے بھی مستحکم نہیں ہے۔ اس وقت سب سے اہم مسئلہ انسانیت کی حفاظت اور معاشرے کا استحکام ہے۔ پوری زندگی کا مستقبل اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ خود ادب کا مستقبل بھی۔ بخش لائلپوری اس خوفناک صورتحال کو پوری طرح سمجھتا ہے۔ وہ اس اہم ترین مقصد کے حصول کے لئے زندگی، انسانیت اور حسن کی بقا کے لئے اپنی شاعری کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ اسے زندگی سے پیار ہے، وہ اسے صحت مند بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسے حسن سے بھر دینے کا خواہش مند ہے۔ بخش لائلپوری کے یہ شعر زندگی اور انسانیت سے اس کی بے پایاں محبت کا کھلا اظہار ہیں۔

مری صورت سے مرے دل کا اندازہ نہ کر ہمدم
مجھے تو زخم کھا کر مسکرا دینے کی عادت ہے

گھرے ہیں بخش یہاں آہنی فصیلوں میں
ہمارے ہاتھ میں ایک تیشۂ کمال بھی دے

مجھے انقلابی بصیرت ملی ہے
ضیاپاش میرے لہو کے دیئے ہیں

دشت کا ہر اک ذرّہ ہو گیا گلشن فروش
اس یقیں کے ساتھ ہم نے پاؤں رکھا خار پر

معاشرے کی تبدیلی اور اس کی صحت کے لئے مسلسل جدو جہد کی ضرورت ہے۔ اگر ادب میں یاسیت آجائے تو ایسی جدو جہد ممکن نہیں رہتی۔ جو ادب یاسیت کی مخالفت کرتا ہے زندہ ادب ہے اور معاشرے اور انسانی زندگی کو صحت مند بنیادوں پر تعمیر کرتا ہے۔ بخش لائلپوری یہی ادب پیدا کر رہا ہے۔

اُردو ادب کے حوالے سے لندن ایک گمنام شہر ہے۔ اِس شہر میں بخش لائلپوری کی آواز ایک بار تو باہر سے آنے والے کو چونکا دیتی ہے۔ شاید اس لئے کہ اس کی شاعری ایک اِنقلابی اور نئی سوچ کی آئینہ دار ہے۔ ترکِ وطن کے باوجود بخش لائلپوری کی سوچ کا مرکز وہی ماحول اور وہی معاشرہ ہے جہاں کلمۂ حق اور اظہارِ خیال پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہیں۔

نہیں سایہ کسی بھی سر پہ لیکن
عقائد کا شجر چھایا بہت ہے

جہاں اتنی دھوپ ہے کہ موم کی گڑیا پگھل جاتی ہے جہاں تنوں کی فصل اس طرح کٹتی ہے کہ کسی کا ہاتھ غائب ہے تو کسی کا سر۔ بخش وقت کی گود سے لپکتے ہوئے شعلوں کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

بڑا ہی سخت ہے اے دوست موسموں کا مزاج
کسی بھی رنگ میں تضحیکِ ماہ و سال نہ کر

بخش خالی خولی مجرّد انسانیت دوستی کے سنگ مرمر سے بیزار ہے۔ وہ محنت کی بنیاد پر بنی ہوئی انسانیت میں اپنا رشتہ ان لوگوں سے جوڑتا ہے جو مادّہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے بارے میں حکم نہیں دیتے بلکہ اسے خود منتقل کرتے ہیں۔ اس کی یہی دھڑے بندی، مثبت سوچ، پیرایۂ اظہار، برہنہ گفتاری، موثر لہجہ اور مصلحت ناشناسی جسے وہ شاعری ہی میں نہیں، عام زندگی میں شدّت کے ساتھ برتتا ہے بخش کو ایک تشخص عطا کرتی ہے۔ بخش نے غزل کے تنگ مکان میں ڈکشن کے نئے، تازہ اور غیر مانوس پھول سجائے ہیں اور وہ اسلوبِ بیان کی نئی راہوں کا متلاشی ہے۔ اس کی آواز میں تیکھاپن ہے انوکھاپن ہے اور توانائی ہے۔ بخش غریبوں کا شاعر ہے اور اسی لئے وہ فکری طور پر مالا مال ہے ''لہو کا خراج'' اس بات کا ثبوت ہے۔

(پروفیسر) امین مُغل

بخش لائلپوری اور "بادشمال"

سیدہ نسرین نقاش

بخش لائلپوری سے نہ تو مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہے نہ ہی میں ان کی ذاتی زندگی کے معاملات سے واقف ہوں۔ ان کی تخلیق "باد شمال" کے مطالعے سے ان کے بارے میں جو رائے میں نے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ بخش لائل پوری ایک شریف النفس، نیک، صاف باطن، درد مند اور انصاف پسند انسان ہے۔ مذہب، معاشرہ، سیاست، اقتصادیات اور ادب کے عمیق مطالعے کا ثبوت ان کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

بخش لائلپوری کا مطالعہ حیات گہرا ہے۔ وہ فرد اور انبوہ، انبوہ اور مشینی نظام کے آپسی تصادم اور تصادم کی کوکھ سے جنم لینے والے سنگین مسائل کو اپنی شاعری کی اساس بناتے ہیں اور نفسیاتی کشاکش سے نظر نہیں چراتے بلکہ ان کو موضوع سخن بنا کر اپنے اشعار کو حقیقت کے قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کی شاعری آج کے دور کی آئینہ دار بھی ہے اور زندگی کی ترجمان بھی

ان کی بینائی ایک عام انسان کی بینائی سے زیادہ تیز ہے اور آپ لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں۔ ان کی نظر خوشنما لباس کو چیر کر روح کے رستے ہوئے ناسوروں کا محاسبہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا لہجہ کہیں کہیں بہت تلخ ہو جاتا ہے۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ بخش صاحب دکھی انسانیت کے شاعر ہیں۔ آپ بنی نوع انسان کی خوش حالی اور طمانیت کے خواب دیکھتے ہیں۔ امن، محبت اور مساوات کی اعلیٰ انسانی اقدار کو پھلتے اور پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں۔

بخش صاحب کو جبر و ستم غلامی و غربت سرمایہ و امارت اور استحصال کے چلن سے سخت نفرت ہے۔ یہ استحصال خواہ مل مالک مزدور کا کرے یا کوئی زردار کسی بیکس عورت کا روح تڑپ اٹھتی ہے شاعر کی ——

غنیم شہر سے پالا پڑا ہے
بدن اپنا صلیبوں میں جڑا ہے
گزرتے وقت کا ہر تلخ لمحہ
ہماری روح کے اندر گڑا ہے

شاعر کہتے ہیں

اسی کے ظلم سے میں حالتِ تباہ میں تھا
ہر اک نفس برا جس شخص کی پناہ میں تھا

مہک رہے تھے نظر میں گلاب سپنوں کے
کھلی جو آنکھ تو دیکھا میں قتل گاہ میں تھا

لعل و لب بکنے لگے اور سیم تن بکنے لگے
کنکروں کے مول ہیرے سے بدن بکنے لگے
اک تعفن خیز ہے اب گرمئ بازار حرص
ہر دکاں پر آدمیت کے کفن بکنے لگے
لٹ گئے لوح و قلم اور فکر بیوہ ہوگئی
مکر و فن کے ہاتھ میں اہل سخن بکنے لگے

یہ غزل عورت کے استحصال کے خلاف نعرۂ بغاوت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ساحؔر کی خوبی تو یہ ہے کہ ان کے الفاظ میں لوچ اور تراکیب میں لچک ملتی ہے لیکن ساحؔر اور بخشؔ میں جو بات مجھے مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ساحر کی طرح بخش صاحب بھی جو کچھ کہتے ہیں وہ پھولوں میں لپیٹ کر نہیں کہتے بلکہ عریاں کر کے کہتے ہیں اور لفظوں پر دھار رکھ کر کہتے ہیں۔

عورت کے استحصال کے علاوہ جہاں بھی جس شکل میں بھی کوئی کسی کا استحصال کرتا ہے بخش اس ظلم کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔

بخش کی شاعری میں چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ بعض الفاظ کو وہ علامت کے طور پر پیش کر کے خاطر خواہ مفہوم پیدا کر دیتے ہیں۔

ٹی۔ ایس ایلیٹ نے کہا ہے ''شاعر کی پہلی آواز وہ آواز ہے جو خطاب سے عاری ہو۔'' اگر اس قول کو کسوٹی تسلیم کر لیا جائے تو ماننا ہوگا کہ شاعر نے بعض بے پناہ شعر کہے ہیں۔ ان اشعار میں نہ تو خطابت ہے اور نہ ہی خود کلامی۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کی ذات کے کسی روزن سے ان کی داخلیت باہر ٹپک پڑی ہو۔

صلیب فکر پہ تکمیل ذات ٹھہری ہے
ہم اہل حق کی یہی کائنات ٹھہری ہے
بچاسکو تو بچالو بکھرتے جسموں کو
جنوں کے ہاتھ میں ہر ایک بات ٹھہری ہے
دعائیں مانگنے والوں کو یہ نہیں معلوم
در عذاب میں راہ نجات ٹھہری ہے

بخش صاحب کے مزاج میں بغاوت ملتی ہے جو شاید زمانے سے چوٹیں کھا کر پیدا ہوئی ہے۔

جا رہی ہے جو سوئے مقتل
رہ وہ مجھ کو پسند ہوگی
ظلم جتنا شدید ہوگا
چیخ اتنی بلند ہوگی

نوک زباں پہ خار کو رکھنا پڑا مجھے
اپنے لہو کا ذائقہ چکھنا پڑا مجھے
رو رو کے جو بیان کیا غم گسار نے
اس کے ہر ایک لفظ پہ ہنسنا پڑا مجھے

چھتوں میں زلزلے طوفان صحن و در میں ہیں
بڑے عجیب سے منظر ہمارے گھر میں ہیں
گڑے ہیں تیر بدن میں اڑان جاری ہے
بلا کے حوصلے میرے شکستہ پر میں ہیں
ہر ایک گام پہ دینا پڑا لہو کا خراج
وہ سخت مرحلے درپیش رہ گزر میں ہیں

بخش صاحب حوادث کے طوفان میں پس جانے کے بعد بھی ساحر کی طرح یہ نہیں کہتے کہ دنیا میں جینے سے مر جانا بہتر ہے، وہ ہر حال میں جینے کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تجھ کو کیا معلوم اے ظالم ہمارے خون سے
کتنی شمعیں جل اٹھی ہیں شہر کی دیوار پر
اک بنام دوستی ہے اک برائے دشمنی
ہاتھ دونوں ہیں ہمارے قبضۂ تلوار پر
دشت کا ہر ایک ذرہ ہو گیا گلشن فروش
اس یقین کے ساتھ ہم نے پاؤں رکھا خار پر

بخش صاحب ''بادِ شمال'' کو اپنی اہلیہ کے نام منسوب کر دینے والے وفادار شوہر بھی ہیں۔ آپ ایک نیک اور سادہ انسان ہیں۔ اتنے اچھے شعر کہہ کر بھی انہیں بڑا فنکار ہونے کا گھمنڈ بالکل نہیں ہے۔ وہ اپنی کوتاہیوں کا دشمن کی طرح جائزہ لیا کرتے ہیں۔
بقول بخش

شاعری میں خود تعین مت کرو اپنا مقام
اس طرح کے فیصلے تو اس طرح ہوتے نہیں

دل میں نہیں ہے سوزِ غم آنکھ بھی شبنمی نہیں
ہاتھ دعا سے کھینچ لے وقتِ دعا ابھی نہیں
سر میں نہیں جنوں اگر، توڑ دے نیتِ نماز
بندگی اور بقیدِ ہوش کفر ہے، بندگی نہیں
خضرِ جہاں کو ڈھونڈ لیں عقل کے جو غلام ہیں
اہلِ جنوں کی ہوش سے بات کبھی بنی نہیں
تیرہ شبی کے دور میں صبح کا انتظار کیا
خونِ جگر جلائے جا شمع اگر جلی نہیں
بچ نہ سکے گا کوئی گھر صاحبِ اقتدار سے
آگ لگا رہے ہیں وہ، آگ جہاں لگی نہیں
دستِ سوال لے کے ہم پھرتے ہیں کو بکو مگر
کہتے ہیں سینہ تان کر یہ تو گداگری نہیں
حامیٔ اہلِ بیت کا جوشِ جہاد دیکھئے
لب پہ علیؑ علیؑ تو ہے جرأتِ حیدری نہیں
میرا یہ قلبِ سوز ناک دامِ غزل میں آ گیا
بخش فغاں نصیب کو دعوائے شاعری نہیں

xxxxxxxxxxx

بخش لائلپوری کا شعری اجتہاد

موسیٰ نظامی کلیم

حرف اول کے طور پر میں واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں کوئی محقق ہوں نہ نقاد اور نہ میں اس فن سے واقف ہوں۔ میں تو ایک عام سا قاری ہوں۔ مجھے جو بات اچھی لگتی ہے اسے پلے باندھ لیتا ہوں۔ میں نے جب بخش لائلپوری صاحب کے کلام کا مطالعہ کیا تو میرا ذہن فوراً بنگال کے نامور انقلابی شاعر نذرالاسلام کی جانب منتقل ہو گیا۔ میرے خیال میں کسی شاعر کے کلام کو سمجھنے اور اس کا مقام متعین کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کس ماحول میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔ اس تناظر میں جب ہم بخش لائلپوری کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو بخش کی شخصیت ہمارے سامنے آئینہ کی طرح صاف و شفاف نظر آتی ہے۔ والٹر کا یہ قول کہ ''جب بھی میں قلم اٹھاتا ہوں تو عالم جنگ میں ہوتا ہوں'' یہ مقولہ بخش صاحب پر سو فیصد صادق آتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز ایک روایتی غزل گو کی حیثیت سے کیا لیکن تقسیم ہند کے بعد حکمراں طبقہ نے اپنے مفادات کی خاطر لوگوں کو طبقات میں تقسیم کر کے انسانی حقوق بے دردی سے پامال کئے۔ بخش نے جب یہ محسوس کیا کہ نئی آزاد ریاستوں کے حکمراں اور استعماری طبقات میں کوئی فرق نہیں تو یہ اپنی انقلابی طبیعت سے مجبور ہو کر اصلاح احوال کے لئے میدان عمل میں کود پڑے۔ وہ اپنے کلام میں مقصدیت اور افادی پہلوؤں کو اولیت دیتے ہیں۔ جب کبھی اس ملک کی سچی تاریخ لکھی جائے گی تو دنیا کو معلوم ہوگا کہ خوف اور وحشت کی اس فضا میں جہاں سانس لیتے ڈر لگتا ہے انہوں نے قوم کی ڈوبتی نبض میں کس طرح زندگی کا خون دوڑایا۔ ان کی شاعری شکستِ دل کی صدا بھی ہے اور سوزِ یقین کی للکار بھی۔

جسموں کے سردخول میں خونِ رواں ہے منجمد
پیکرِ ہست و بود کے سوزِ جگر کو کیا ہوا
تیرہ شبی کے راج کی دھوم مچی ہے کو بکو
صبح کے اے مؤذنو بانگِ سحر کو کیا ہوا

انہوں نے ہوش سنبھالا تو برصغیر میں انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ اور قیام پاکستان کے بعد اپنے جاگیردار حکمرانوں کے سفاک رویّوں نے اس میں مزید اضافہ کیا۔ بخش نے محسوس کیا کہ تمام تر مشکلات اور مصائب کا باعث سرمایہ دارانہ اور جاگیرداری نظام ہے اور جب تک اس آہنی

دیوار کو مسمار نہ کیا جائے گا حالات کا کوئی روشن پہلو سامنے نہیں آئے گا۔ وہ بلند و بالا ایوانوں میں بیٹھ کر حکم صادر کرنے والوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے جسارت کرتا ہے۔

کیا ہم کو دباؤ گے جہاں بانی کر کے
اتراؤ نہ ہنگامہ فشانی کر کے
جس آتش بارود پہ ہے ناز تمہیں
اُس آگ کو ہم رکھ دیں گے پانی کر کے

بخش اپنی شاعری میں عام آدمی کی بات کرتے ہیں۔ وہ عوام کے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والی آرزوؤں اور امنگوں کو سنتے ہیں۔ اس عمل میں انہوں نے ہمارے دور کی عوامی شاعری کو اپنا شعار بنایا جو جذباتی اور موضوعاتی اعتبار سے نئی ہے اور برصغیر میں کی جانے والی شاعری میں اس کی مثال مشکل سے ہی ملے گی۔ اگر میں بخش کو دکھی دلوں کا ترجمان کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ جیسا کہ میں نے کہا بخش بہت جذباتی اور حساس انسان ہیں۔ وہ عوام کے دکھ دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔

ہمارے شہر کی ہر اک گلی میں
ہزاروں بے کفن لاشے پڑے ہیں

بخش صاحب نے آمریت کے خلاف جدوجہد میں عوام کی جو خدمت کی ہے اور کر رہے ہیں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ انجام کی پرواہ کئے بغیر علم بغاوت بلند کرتے ہیں۔ اگر وہ علم بغاوت بلند کرتے ہیں تو اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں بلکہ عوام کے لئے۔ وہ ترقی پسند ضرور ہیں لیکن مذہب سے بیگانہ نہیں۔ انہوں نے نامساعد حالات میں بھی سچ کا دامن تھامے رکھا۔ ہم جیسے لوگ بقول شخصے جبر و تشدد کے خلاف تماشائی تو بن کر رہ گئے لیکن فریق نہ بن سکے لیکن بخش مصلحت اور خوف و ہراس کی دیواروں کو پھلانگتے ہوئے میدانِ عمل میں کود پڑے۔ ہم ابھی نو آبادیاتی کلچر کے اثرات سے آزاد نہ ہوئے تھے کہ لوٹ کھسوٹ پر مبنی سیاسی نظام میں گرفتار ہوگئے۔ بخش جیسا حساس طبع بھلا یہ کب برداشت کر سکتا تھا لہٰذا وہ اپنے قلم کی تلوار لے کر میدان جہاد میں نکل آئے۔ فرماتے ہیں۔

تعمیر نو کے نام پہ گھر کو اجاڑ کر
معمار اینٹیں لے گئے ساری اکھاڑ کر

یہ روز روشن کی طرح واضح ہے کہ جب بھی معاشرہ میں جبر، تشدد اور دہشت کے ذریعہ انسانی آزادی کو دبایا گیا تو اس کے نتیجے میں مزاحمتی ادب تخلیق ہوا جس نے جبر کے خلاف احتجاج کیا اور آزادی اور انصاف کی بات کی۔ مزاحمتی ادب نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ لوگوں میں اپنی ذات کا احساس دلوایا۔ انہیں طاقت و قوت کا شعور بخشا اور ان میں جو مایوسی دبے

چارگی کے جذبات پائے جاتے تھے انہیں دور کیا اور جب اس میں کامیابی حاصل ہو گئی تو اس کے خالق اپنے حقوق کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور حکمرانوں سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگے

پاکستان کی بدقسمتی یہ رہی کہ آزادی کے فوراً بعد ہی حکومت کے ارباب حل و عقد کو محض اپنے اقتدار و مفاد سے دلچسپی رہی اور ملک کو سیاسی طور پر مستحکم کرنے اور عوام کی حالت زار کو بہتر بنانے کا ان کے ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ یہ صورت حال اس وقت اور خراب ہوئی جب ملک میں فوجی آمریت نے جنم لیا اور جمہوری نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ بخش صاحب جیسا محب وطن۔ حساس طبع۔ صاحب دل یہ کب برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے ناانصافی۔ ظلم و استبداد کے خلاف علم بغاوت کر دیا اور حکمران وقت سے ٹکر لینے کے لئے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا میدان عمل میں نکل آیا۔

ہر سانس ہمارا شعلہ ہے ہر حال میں یہ تو بھڑکے گا
تم دار پہ ہم کو لٹکاؤ یا بند کرو تہہ خانوں میں
اس عہد ستم میں بہر یقیں ہر ایک بشر لٹ جاتا ہے
جس عہد میں خوئے قزاقی آجاتی ہے دربانوں میں

بخش ترقی پسند محب وطن ہے۔ وہ دیار غیر میں بیٹھ کر وطن کی باتیں کرتا ہے۔ اس کا جسم وطن کے باہر ہے لیکن اس کی روح وطن کے اندر ہے۔

ہمیں جان و دل سے بھی پیارا وطن ہے
دلوں میں وطن کی محبت جواں ہے
رگوں میں شہادت کا دریا رواں ہے
جبیں سے نشانِ عقیدت عیاں ہے
مقدس ہمیں اُس کا ہر اک نشاں ہے
یہی اپنی جاں ہے یہی اپنا تن ہے

ہے ملت پرستی پہ ایمان اپنا
وطن پہ ہی سب کچھ ہے قربان اپنا
ہے پرچم ہلالی خدی خوان اپنا
ہم اس کے ہیں اور یہ نگہبان اپنا
یہی مال و زر ہے یہی اپنا دھن ہے

ماسوائے چند نظموں کے جو اس نے ایتھوپیا اور فلسطین وغیرہ پر لکھیں تمام تر اپنا ناتا اپنے وطن سے ہی جوڑے ہوئے ہے۔

حبیب جالب کی طرح بخش نے بھی تین عشروں میں پھیلے ہوئے ہر آمر اور جابر کو للکارتے ہوئے مدافعت کی موثر آواز بلند کی۔ عزت نفس اس کا اوڑھنا بچھونا اور اصولوں پر ڈٹے رہنا اس کا شعار ہے۔ اس میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ منافق نہیں۔ جو بات دل میں ہے وہی اس کی زبان پر۔ وہ نہ کسی سے ڈرتا ہے اور نہ ہی کھری کھری سنانے سے گھبراتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ بخش اپنے عہد کی بھرپور آواز اور

اپنی ذات میں مجسم درد کی تحریک ہے تو میں یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہونگا۔ بخش فطری سطح پر انسان دوست ہے اور اس حوالے سے جبر و ستم کے خلاف ہے۔ وہ بنی نوع انسان کے لئے پُر امن اور متوازن معاشرہ کا خواہاں ہے۔ اسے حقوق بشری اور شخصی آزادی عزیز ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص بلا امتیاز اس دولت سے مالا مال ہو۔ بخش کا موازنہ کسی انقلابی شاعر سے نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنی طرز کا منفرد مزاحمتی شاعر ہے۔ بلاشبہ جوش بھی انقلاب کے حامی تھے۔ انہوں نے بھی چند انقلابی نظمیں لکھیں لیکن ان کا انقلابی جذبہ پُر شکوہ لہجے اور شوکت الفاظ میں گم ہو کر رہ گیا۔ وہ اپنا مقصد واضح کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ میرا اپنا خیال ہے ہو سکتا ہے کہ اس سے بعض حضرات کو اختلاف ہو۔ رہے فیض صاحب تو وہ بڑے پایہ کے شاعر ضرور تھے لیکن میں انہیں انقلابی نہیں کہہ سکتا۔ وہ ترقی پسند تھے لیکن ان کی سوچ کا دھارا ماسکو کی طرف بہتا تھا۔

اگر آج نہیں تو آنے والا وقت بتائیگا کہ بخش کون ہے؟ بخش کی شاعری ظلم اور ناانصافی کے خلاف لڑنے والوں کے لئے امید کی کرن ہے۔ وہ ایک استحصال زدہ معاشرہ میں مسلسل مزاحمت کا نام ہے۔ وہ نہایت دکھ بھرے لہجے میں کہتا ہے

ظلم سہتے ہیں دہائی نہیں دیتا کوئی
گرمیٔ تیغ نوائی نہیں دیتا کوئی

پھر وہ سوال کرتا ہے۔

کس کی آغوشِ محبت میں پناہیں ڈھونڈیں
دور ظلمت میں دکھائی نہیں دیتا کوئی

اور پھر خود ہی رہنمائی بھی کرتا ہے۔

دوستو ہر کڑی منزل سے گزرنا ہوگا
گھر میں بیٹھے تو خدائی نہیں دیتا کوئی

اظہار حق اور بخش لائلپوری ایک ہی شئے کے دو نام ہیں۔ مختصر یہ کہ بخش لائلپوری کی شاعری نہ صرف بین الاقوامی جذبات کی آئینہ دار ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی احتجاج کا نام بھی ہے۔ اس مضمون کے اختتامیہ کے طور پر آپ کے ملاحظہ کے لئے چند اشعار درج کرتا ہوں

اس حسنِ انتخاب میں کس کو کلام ہے
جو زیرِ احتساب تھا، عالی مقام ہے

جس اسپِ اقتدار پہ ہم تم سوار ہیں
اپنے عدو کی ہاتھ میں اس کی لگام ہے

کچھ لوگ سارے شہر کی گھڑیاں خرید کر
فرما رہے ہیں وقت اب ان کا غلام ہے

شہر دشت میں ہجومِ قاتلاں کے درمیاں
ہم اگر زندہ ہیں تو یہ معجزے سے کم نہیں

آنے والے دور کے ہر اک مورخ کے لئے
ہم نے آنکھیں گاڑ دی ہیں شہر کی دیوار میں

تمام رات ستارہ شناس روتے رہے
نظر گنوادی، ستارہ نظر نہیں آیا

تغیرات کا ہے معجزہ زمانے میں
نیا شعور جنم لیتا ہے پرانے میں
یہ اپنے اپنے کمالات کا نتیجہ ہے
کہ ہم قفس میں پڑے ہیں تم آشیانے میں
ستم کے مارے پڑے ہیں عجب تذبذب میں
وگرنہ دیر نہیں انقلاب آنے میں
یہ اور بات کہ فاقہ کشی میں گزری ہے
مرے لہو کی حرارت تھی دانے دانے میں
تم اور تیز کرو روشنی چراغوں کی
بہت ہے دیر ابھی تو سحر کے آنے میں
کریں گے خاک کسی اور کا وہ گھر آباد
سکون جن کو ملا اپنا گھر جلانے میں

××××××××××××××

محبت ہو چکی تم سے تڑپ کر جی لیا میں نے
جوانی میں فراق و غم کا ساغر پی لیا میں نے
تجھے اے بے وفا تیرا پرایا پن مبارک ہو
سر مژگاں شکایت کی نظر کو سی لیا میں نے
غنیمت ہے خوشی سے اس جہانِ بے ثباتی میں
ترے رنگیں فریبوں سے کئی دن جی لیا میں نے
تمہاری ہی محبت زینتِ چاکِ گریباں تھی
تمہارے ہی اشارے سے گریباں سی لیا میں نے

××××××××××

بخش لائلپوری — زندہ اصولوں کا شاعر

پروفیسر سجاد حارث

فن و ادب میں مقصدی اور غیر مقصدی ادب کی تفریق مصنوعی اور غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر دور میں ہر نوع کا ادب مقصدی رہا ہے۔

بخش لائلپوری کی شاعری بھی ایک واضح نقطۂ نظر اور آدرش کی حامل شاعری ہے اسی طرح جیسے غالب، اقبال، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ کے ہاں زندگی اور انسانی معاشرے کے بارے میں مخصوص تصورات اور ایک بنیادی فکری نظام موجود ہے۔ واضح رہے کہ یہاں ان شعرائے کرام کے مابین شاعری کے معیار و اسلوب کا تقابل مقصود نہیں ہے۔ ان کے ہاں ادب کی مقصدیت کا شعوری یا غیر شعوری جو ایک تصور ملتا ہے فی الوقت محض اس کی نشاندہی پیش نظر ہے۔

دور جدید میں بعض دانشور اور ادیب اپنے مخصوص اور محدود نظریہ ادب کے تحت لفظِ مقصدیت کو ایک فریب کن اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ شدید داخلیت پسندی اور دروں بینی کی بنیاد پر ادب تخلیق کرنے والوں نے مقصدیت کی اصطلاح کو دشنام اور الزام کی صورت میں رائج کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ ان ارباب فن کے نزدیک معروضی اور معاشرتی حقیقتوں اور مسائل کا بیان مقصدیت کے زمرے میں آتا ہے، جبکہ خالصتاً موضوعی اور داخلی حقیقتیں اور ان کا بیان مقصدیت سے ماوراء، مقدس اور معتبر ادب قرار پاتا ہے، یہ حضرات، عملی طور پر انسان کے معاشرے، معاشرتی تنظیم، اور اس کی تاریخ و تہذیب سے الگ تھلگ، ایک خلائی مخلوق تصور کرنے پر زور دیتے ہیں، جس مقام پر وہ انسان کو معاشرتی، سیاسی یا اقتصادی سطح پر سوچتے، محسوس کرتے یا عمل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، انہیں ادب کی عصمت و حرمت کا خیال ستانے لگتا ہے، ایسے ادب کو وہ خود ساختہ جمالیاتی اقدار اور فنی تصورات کی روشنی میں پرکھنے لگتے ہیں اور انجام کار اسے فن و ادب کی مملکت سے خارج کر کے، اسے سیاست، صحافت اور جمہوری تربیت کی سیاسی تحریریں کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔

تاہم حقیقت پسندی کا تقاضہ ہے کہ تاریخی حقائق اور شواہد کی روشنی میں اس مسئلے پر غور و خوض کا اعادہ کر لیا جائے۔ مقصدی ادب ہو یا غیر مقصدی ادب، بنیادی طور پر انسانی زندگی کے ہمہ جہت اور ہمہ گیر پہلوؤں ہی کو، بیش و کم، موضوع بناتا ہے۔

جب ہر دو اطراف کے ادب کا محور و مرکز ایک ہی ہے تو مقصدی اور غیر مقصدی ادب کی تفریق بے معنی سی بات بن جاتی ہے۔ مسئلہ موضوع یا زاویۂ حیات کے انتخاب کا ہے، اور ضروری نہیں ایک فرد کا انتخاب دوسرے فرد کی نظر میں معتبر اور پسندیدہ ٹھہرے، یہ اپنی اپنی صوابدید کا معاملہ ہے، تاہم یہ سوال اب بھی جواب طلب رہ جاتا ہے، مقصدی ادب کی طرح کیا غیر مقصدی ادب کا بھی کوئی مقصد ہوتا ہے؟ اگرچہ اس ضمن میں غیر مقصدی ادب کے علمبردار بزعم خویش یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی تخلیقی سرگرمیوں کے محرکات و مقاصد وہ نہیں ہوتے جو مقصدی ادب تخلیق کرنے والوں کے ہوتے ہیں اور بظاہر وہ یہ بات ٹھیک کہتے ہیں لیکن عملی مضمرات اور نتائج کے لحاظ سے یہ بات سچ نہیں ہے۔ عملی مضمرات اور نتائج کی رو سے غیر مقصدی ادب کے بھی سیاسی، سماجی معاشی اور عمرانی اثرات مرتب ہوتے ہیں، خواہ یہ اثرات بلاواسطہ طور پر نظر نہ آئیں، تاہم یہ انسان اور انسانی معاشرے کے طرز فکر اور طرز احساس کو منفی یا مثبت طور پر بہر حال متاثر کرتے ہیں۔ مثبت اور منفی عمل کے اس مظاہرے اور نتیجے کے طور پر ہی نظریہ، ادب اور مقصدیت کی بحث چھڑتی ہے، خیالات و اقدار کی جنگ کا آغاز ہوتا ہے، انسان اور کائنات کا رشتہ، انسانی شرف و اکملیت کے تصورات، فلسفہ جمالیات، ترقی کے نظریئے اور مقصدِ زیست جیسے مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ اس بحث و تنازعے کے سلسلے میں ایک بنیادی اصول کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے

انسانی زندگی اور اس کائنات کی اپنی ایک باطنی منطق ہے۔ انسانی معاشرہ ایک مخصوص قانونِ حرکت کے تحت ارتقا پذیر ہے۔ اب جو افکار، تحریکات اور رجحانات، کائنات کی اس باطنی منطق اور معاشرے کے اس قانونِ حرکت سے مطابقت رکھتے ہیں وہ زندہ رہتے اور مہ و سال کی اگلی منزلوں کی جانب سفر کرتے ہیں، لیکن معاشرے اور کائنات کے اس بنیادی حرکی قانون کی، دانستہ یا نادانستہ، مخالفت کرنے والے چند روز ہی میں گرد سفر کی طرح معدوم ہو جاتے ہیں۔ انسان کا اجتماعی ضمیر اور انسانی روح کا ارتقا پذیر جوہر بالآخر ان بر خود غلط افراد اور ان کے افکار کو رد کر کے ارتقا کی صحیح سمت میں گامزن ہو جاتا ہے۔ اسے آپ چاہیں تو تاریخی عمل بھی کہہ سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انسان کا اجتماعی ضمیر کیا چاہتا ہے؟ انسانی روح کی تگ و تاز کیا ہے؟ یہ سوال بیک وقت ادبی بھی ہے، سیاسی اور تہذیبی بھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بخش لائلپوری کی شعری تحقیقات کا صحیح معنوں میں جائزہ لیا جا سکتا ہے اور انسانی آدرشوں کے حوالے سے، ادب اور تہذیب کی بیکراں وسعتوں میں ان کے کام اور مقام کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

لہجہ اور لفظیات کی دلکشی اور بوقلمونی، ندرتِ خیال، جدتِ ادا اور انفرادی اسلوب کے رنگ و آہنگ کے زاویئے اور معیار اپنی جگہ یقیناً نہایت خوبصورت اور مفید فنی موشگافیاں ہیں لیکن فن محض طلسم خیال، آئینہ خانہ اور سولہ سنگھار ہی کا نام تو نہیں ہے

نہ ہی جمالیات پرستوں کی طرح جمالیاتی حس کی تسکین کا ذریعہ واحد ہے، بلکہ فن تو انسانی ضمیر اور ذہن کے تاریک گوشوں کو منور و وسیع کرنے کا وقیع اور بنیادی فریضہ انجام دیتا ہے۔ جو فن انسانی ضمیر کو روشن نہیں کرتا، اور انسانی شعور کی سطح بلند کرنے میں ناکام رہتا ہے وہ خیال و معنی کی خواہ کتنی ہی تہیں اپنے اندر رکھنے کا دعویدار ہو، یا احساس جمال اور ترفع کے بلند آہنگ دعوے ہی کیوں نہ کرتا ہو، انسان کے اجتماعی ضمیر اور ترقی یافتہ شعور کے نزدیک ایک دفتر بے معنی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بخش لائلپوری کی شاعری اور فن بنیادی طور پر انسانی ضمیر ہی کا احتجاج اور اظہار ہے، لیکن دھیان رہے، یہ اظہار، اظہار محض نہیں، ہر شعر میں جرأت اظہار کا جو دبدبہ اور طنطنہ موجود ہے، وہ باضمیر اور حساس انسانوں کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ وہ لوگ جو نوع انسانی کی محبت اور اس کے درخشاں مستقبل کا تصور رکھتے ہیں، جو انساں پر انسان کے ظلم و ستم کا کربناک احساس رکھتے ہیں اور جو انصاف اور سچائی کے معروضی مفہوم کا ادراک و شعور رکھتے ہیں، بخش لائلپوری کے اشعار سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتے۔

ممکن ہے، غیر مقصدی ادب کے بعض مبلغین ان اشعار کو انیسویں صدی کے یورپ کی تحریکِ انسان دوستی کی متروک شدہ روایت کا شاخسانہ قرار دینے کی سعی کریں۔ یا عین ممکن ہے، ان اشعار میں انہیں وقت کی راگنی کا صوت و آہنگ نظر نہ آئے تو یہ قصور ان کی فکر و نظر کا ہوگا، اگر دن کی روشنی میں معروضی حقیقتیں اور ان حقیقتوں سے متاثرہ اور مرتب شدہ انسانی جذبات و احساسات کا ارتعاش اور تحرک انہیں دکھائی نہ دے تو در اصل یہی وہ بے حسی اور بے مہری کی صورتحال ہے جس کا اشارہ ہمارے اس شاعر نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔

جھٹلا کے اپنے دور کی زندہ حقیقتیں
ہم کھو گئے خرابۂ وہم و گمان میں

بخش کے اشعار کو محض تحریکِ انسان دوستی تک محدود کر دینا بڑی زیادتی ہوگی۔ انسان دوستی کا زیر لب احتجاج بخش کے ہاں انقلابی فکر اور فعالیت کا متحرک استعارہ بن گیا ہے۔

بخش کے مجموعۂ کلام میں اگر عشقِ دلبراں اور مہ رخوں کی عشوہ طرازیاں موجود نہیں ہیں اور کوئے یار اگر نگاہوں سے اوجھل ہے تو اس کا ایک ٹھوس جواز بھی ان کے پاس ہے۔ طویل عرصہ گزرا، ساحر لدھیانوی نے بھی مطربہ سے نشاط انگیز نغمے نہ گانے کی یہ کہہ کر التجا کی تھی، ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں۔ بخش آج بھی اصلاحِ احوال کی صورت نہیں دیکھتے اور وہ بھی خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتے ہیں۔

بربطِ دل کا ہر اک تار پریشاں ہے بہت
ایسے عالم میں کوئی گیت نہ گایا جائے

تاہم شاعر کی یہ پریشاں خیالی کسی دروں

بنی یا کسی قسم کے آشوب ذات کی پیدا کردہ نہیں ہے، گردو پیش اور بساط عالم پر موجود انسان کی تذلیل و تحقیر اور مظلومیت کے حساس مشاہدے اور ادراک کا منطقی نتیجہ ہے۔ وہ آج کے ستم رسیدہ انسان کی حالت زار کو تجریدی اسلوب میں پیش کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ حقیقت کا بیباک اور سچا اظہار و ابلاغ ان کے فن کا بنیادی طریقۂ کار ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بصورت دیگر فن مصلحت اندیشی اور ریاکاری کا لبادہ اوڑھنے کا امکان پیدا کر لیتا ہے۔ اس صورتحال میں فنکاروں کی امنت خرافات میں کھو جاتی ہے۔

بخش کا یہ کرب آگہی کیا ہے؟ ان کے لبوں پر یہ صدائے احتجاج کیوں ہے اور دل میں جذبۂ جاں سپاری کے کیا محرکات ہیں؟ ان حقیقتوں کا سراغ شاعر کا کلام پڑھ کر بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

چاند تاروں کی بلندی سے گزرنے والو
تم زمیں کے بھی نشیبوں میں اتر کر دیکھو
عین ممکن ہے کہ آشوب زمانہ نکلیں
جھانک کر بند مکانوں کے بھی اندر دیکھو

بنتا ہے پیرہن جو زمانے کے واسطے
اس شخص کے بدن پہ تو اک تار بھی نہیں

بخیل اپنا شکم بھر کے یہ سمجھتا ہے
کہ شہر بھر میں کہیں بھوک کا عذاب نہیں

فن و ادب میں زمین کی بو باس اور ارضیت کو بنظر تحقیر دیکھنے والے روٹی، کپاس اور چھت کے ذکر کو سیاسی نعرہ زنی قرار دیتے رہے ہیں لیکن بخش کے نزدیک یہ ارضی حقیقتیں ہی زندگی کی ایسی علامتیں ہیں جو انسان کے ماضی، حال اور مستقبل سے گہرا ربط و رشتہ رکھتی ہیں۔ اور یہ علامتیں ہی توسیع اور ترفع حاصل کر کے تہذیب و فن کے نگار خانوں میں زندگی کا جز بن جاتی ہیں۔ تاہم اس ضمن میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ زندگی جو فن کو قوت، حسن اور روشنی دیتی ہے اسے اجزاء میں یعنی کچھ ادنیٰ اور کچھ اعلیٰ مظاہر میں تقسیم کر کے، زندگی کا عرفان حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کے تمام مظاہر ایک دوسرے سے ایک سلسلۂ کل میں اس طرح مربوط اور پیوست ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے یا انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھنا صحیح طریقۂ کار نہیں ہوگا۔ جب زندگی کا مطالعہ کل کی حیثیت سے کیا جاتا ہے تو اس راہ میں مختلف اور متنوع منزلیں آتی ہیں۔ انسانی تہذیب، تاریخ، عمرانی صورت حال، سیاسی اور معاشی حالات و کوائف، انسانی کردار کی پستی اور بلندی، فرد اور معاشرے کا رشتہ، انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال، انسانی رشتے۔ VS۔ دولت کے رشتے، حرص و ہوس کی خوں آشامیاں اور کمینگی کے مظاہر، فکر و فن کے مسائل، انسانی روح کی زمزمہ پردازی، حوصلہ مندی اور جرأت، سچائی سے پیار اور بہترین انسانی آدرشوں کے لئے جذبۂ سرفروشی۔ غرضیکہ بخش کی شاعری میں، ان کی فکر و نظر کی مناسبت سے، انسانی تہذیب و تاریخ، معاصر حقیقتوں

اور زندگی کا ایک وسیع کینوس نظر آتا ہے۔ انسانی صورت حال کا پرخلوص، دیانت دارانہ اور پرجوش ادراک و ابلاغ ملتا ہے، حق و باطل کی رزم آرائی میں حق کی جرأت مندانہ حمایت اور انسانی زندگی اور مستقبل کو تاریک بنانے والی قوتوں کی کھلی مزاحمت اور مخالفت ملتی ہے۔ یہ انداز نظر اور اسلوب اظہار ہر ایک کا مقدر نہیں ہوتا، اس کے لئے خلوص و سچائی دیکھنے والی نظر درکار ہوتی ہے، قریۂ ذات کے زنداں سے رہائی اور آزادی حاصل کرنا پڑتی ہے، سقراط، سرمد اور منصور کا یہ قبیلہ زماں و مکاں کی حد بندیوں سے آزاد ہوتا ہے، ہر دور ہر خطے میں اس قبیلے کے افراد انسانی ضمیر پر دستک دیتے رہتے ہیں، شرف انسانی کی تابناک منزل کی نشاندہی کرتے آئے ہیں۔ اپنے خون سے انسان کی سیہ بختی کی سیاہی دھوتے رہے ہیں، بخش کے یہ چند اشعار اس زندہ اور روشن روایت کی یوں ترجمانی کرتے ہیں ۔

چراغ صدق فصیل بیاں پر رکھ دے
زبانِ کند کو جرأت کی سان پر رکھ دے

کوئی ابن علی ہو، عیسیٰ و منصور و سرمد ہو
شہیدانِ صداقت پر ستم ہوتے ہی رہتے ہیں

عالمی تاریخ کے ہر دورِ استبداد میں
وقت کے منصور کو زنجیر پہنائی گئی!

صورت منصور وہ سولی پہ لٹکائے گئے
جو رہے ہر دور میں زندہ اصولوں کی طرح

فن و ادب میں، گزشتہ نصف صدی میں، ادبی معیار، اصول اور موضوعات جس تیزی سے بدلے ہیں، زندگی اور نظامِ زندگی کا بنیادی ڈھانچہ اس تیزی سے اور تفصیل سے نہیں بدلا ہے، یہ بات بالتخصیص تیسری دنیا کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات و کوائف کے بارے میں بے کم و کاست کہی جاسکتی ہے، تاہم ادب کے پنڈتوں کا اصرار ہے کہ تیز رفتار سائنسی ترقی کے اس دور میں ادب سے سادگی، صراحت اور ترسیل خیال کا جوہر خارج کردیا جائے تاکہ سائنس کی تکنیکی پیچیدگی کہ اس عہد میں ادب زیادہ خیال افروز اور فکری گہرائی و بصیرت کا حامل ہو سکے اور عہد جدید کے انسانی ذہن کو زیادہ مطمئن اور مسرور کر سکے۔ اس مقصد کے پیش نظر جدت پسند اور جدید ادب کے علمبردار ادب کو تجریدیت اور علامتوں کے ایک ایسے جنگل میں لے گئے ہیں جہاں محض معدودے چند دانشور ہی ذہنی مشق و ریاضت کے بعد، ان فنی شہ پاروں کی تفہیم و تحسین کر سکتے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ سے پہلے مغربی استعمال کے نو آبادیاتی نظام کے جبر و استحصال کو ادب کی وساطت سے بہ آسانی سمجھا جاسکتا تھا، لیکن جدید اور جدت پسند ادب کی تجریدیت اور تکنیکی پیچیدگیوں نے ابلاغِ عامہ کے اس دروازے کو اب بند کردیا ہے۔ تاہم جدید ادب کے پنڈتوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں کرلینا چاہیے کہ فن و ادب انسان کے ذہن اور ضمیر کا عمل ہے، یہ بنی نوع انسان کا تہذیبی ورثہ ہے۔ ہر وہ فنی تکنیک اور ادبی سرگرمی، فنی تحریک اور ادبی نظریہ جو بنی نوع انسان کے ایک بڑے حصے کو

اس تہذیبی ورثے اور تخلیقی عمل سے، بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر، دور رکھنے کی سعی کرے گا بہت جلد طاقِ نسیاں کی نذر ہو جائے گا۔

معاصر عالمی ادب کی تاریخ میں اس حقیقت کے کئی شواہد اور آثار موجود ہیں۔ نئے، نو آبادیاتی نظام کے پس منظر میں نئے اقتصادی اور سیاسی رشتے، عالمی استعمار کی نئی حکمت عملیوں کی روشنی میں، نظریات کی جنگ اور انسانی تہذیب کے نئے امکانات کے شعور وادراک کی آج پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

بخش ان عصری حقیقتوں کا مکمل شعور رکھتے ہیں۔ مقامی اور عالمی استحصال کی ان قوتوں کے اس گٹھ جوڑ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

غیروں کو دشنام نہ دو یہ غیر تو غیر ہی ہوتے ہیں
اپنے گھر کو لوٹنے والے دربانوں کی بات کرو

حریمِ جسم میں تیغِ ستم گڑی ہے ابھی
سپاہِ ظلم مرے سامنے کھڑی ہے ابھی

وقت کے تاریخ داں اجڑے گھروں کے ساتھ ساتھ
سیم و زر کے مقبروں کو دیکھ کر چکرا گئے

روند کر لاشوں کو آہن پوش لوگ
رات کے اندھے کنویں میں بھر چلے

جبر واستحصال کی یہ قوتیں مقامی طور پر گندم نما جو فروشی کے اس کاروبار میں جس طرح ملوث ہیں بخش ان چہروں سے نقاب نوچ کر کہتے ہیں ؂

جس زمیں پر دینِ فطرت کا نشاں ملتا نہیں
اس زمیں پر دینِ فطرت کی بہت تشہیر ہے

کوچۂ مومناں میں بندش ہے
کلمۂ حق زباں پہ لانے کی

تجھے ایک رسما خدا مانتے ہیں
ترے دَر پہ سجدہ ادا کرنے والے

شہر کی سڑکوں پہ ہے جو بے گھروں کا ایک ہجوم
یہ حقیقت میں مری تہذیب کی تصویر ہے

اپنے گھر پر چھوڑ کر اپنے ضمیر!
دفتروں میں قوم کے نوکر چلے!

جسے بھی چاہا صلیبِ ستم پہ کھینچ دیا!
فقیہِ شہر تو قائل نہیں گواہوں کے

بخش کی شاعری کا منظر نامہ کلاسیکی اور روایتی شاعری سے مختلف ہے۔ جدید شاعری کی دور از کار علامتوں، ابہام پسندی اور فنی باریکیوں سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ سچ بولنے اور سچ کو خلوص دل سے محسوس کرنے کی شاعری ہے۔ انسان آج جس کربناک صورتحال سے دوچار ہے، بخش کی شاعری اس صورتحال کا مردانہ وار مقابلہ کرنے اور اسے تبدیل کرنے کا عزم اور حوصلہ دیتی ہے۔ اسے پڑھ کر ہم خود کو تیسری دنیا کے کسی نو آبادیاتی شہر میں سانس لیتے ہوئے محسوس کرتے

ہیں اس میں نہ تو کلاسیکی دور کے خوبانِ مرغوب وطرح دار نظر آتے ہیں، نہ ہی گل ہائے رنگین کے افسانے مرکز توجہ بنتے ہیں، اس شاعری کے شہر میں گلشنِ زیست خزاں کی زد میں ہے ہر شخص آزمائش کی گھڑی سے گزر رہا ہے، قدم قدم پر صلیبیں باندھ کر یزید کھڑے ہیں اور شاعر ان حالات میں ہر باضمیر انسان سے کہتا ہے۔

"نظر کو تیغ برہنہ، بدن کو ڈھال بنا"

شاعر جانتا ہے

صلیبِ شہر پہ گو کوئی سر نہیں ہوتا!
ستم کا دور کبھی مختصر نہیں ہوتا

تاہم یہ دیوارِ ستم ایک دن انقلابی قوتوں کے سامنے یقیناً سرنگوں اور منہدم ہوگی۔ آج اگر یہ دیوار نہ گر سکی تو کل انسانی ضمیر اسے ریزہ ریزہ کردے گا۔

شور تا حشر بپا ہوگا ستم گر کے خلاف
ہم نہ ہوں گے تو کوئی اور دہائی دے گا

اس شعر میں "تا حشر" اور دہائی دینا، جیسے ماضی کے محاورے شاعر کے شاید کسی کمزور لمحے میں در آئے ہیں، حقیقت تو اس کے برعکس ہے، وہ یہ کہ انصاف، آزادی، انقلاب اور مساوات کی گھن گرج اور ہٹ ستم گروں کی طرب گاہوں کی جانب لپک رہی ہے۔ انسانی تاریخ آج ایک نئی منزل میں داخل ہو رہی ہے۔

xxxxxxxxx

طلوعِ فکر کا ہر معرکہ گزر بھی گیا
ذرا سی آنچ سے رنگِ نمو اُتر بھی گیا

قفس نصیب نے اب کے وہ قید کاٹی ہے
دل و دماغ سے احساسِ بال و پر بھی گیا

یہ کون مسندِ اہلِ سخن پہ بیٹھا ہے
زباں بھی گنگ ہوئی، حرفِ معتبر بھی گیا

پناہ مانگی تھی یخ بستگیٔ موسم سے
چڑھی وہ دھوپ کہ اب سایۂ شجر بھی گیا

بہت ہی ناز تھا جس شخص کی رفاقت کا
ہمارا ہاتھ جھٹک کر وہ ہمسفر بھی گیا

منافقانہ نظریات کا بہاؤ تھا
کہ جس میں ڈوب کے ہم کیا، ہمارا گھر بھی گیا

کہا یہ کان میں کیا؟ سر پھری ہواؤں نے
ہمارے ذہن سے اہلِ ستم کا ڈر بھی گیا

طبیبِ وقت پڑا تھا عجب تذبذب میں
اور آبگینۂ دل ٹوٹ کر بکھر بھی گیا

بڑے وثوق سے وعدے جو وقتِ شام کئے
عجیب شخص تھا وہ صبح دم مکر بھی گیا

"زندانِ شہر" کی شاعری اور شاعر

پروفیسر محمد حسن

بخش لائلپوری کی شاعری کا دوسرا مجموعہ "زندانِ شہر" زیر نظر ہے۔ اس کے بارے میں پہلی چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ دل کش اور دل نواز غزل کی شاعری ہونے کے باوجود یہ عشقیہ شاعری نہیں ہے۔ ہمارے اکثر غزل گو عشق کی بیساکھی کے بغیر سیدھے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اکثر عشق و عاشقی کی سرمستی کا سہارا لیتے ہیں۔ بعض تصوف سے مدد لے کر مجاز کی لذت میں حقیقت کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ بعض عشقیہ لب و لہجے میں انسانی رشتوں کی بات کرتے ہیں۔ بخش چلچلاتی دھوپ میں کسی سائبان کے بغیر کھڑے ہیں۔ ان کی شاعری بے رحم تجربے کی شاعری ہے۔ انہوں نے خود ایک جگہ اپنی شاعری کے کردار کو ایک مصرعہ میں اس طرح بیان کر دیا ہے۔

دیکھنے والے تیری تہذیب کا چہرہ ہوں میں

وہ اس تپتی دھوپ اور سنگلاخ زمین پر کھڑے ہو کر خود رحمی، مظلومیت یاد کھ درد کی دہائی دئے بغیر زندہ ہیں۔ ان کی شاعری کی اساس صلابتِ کردار ہے۔ انہیں سماجی ناہمواریوں، بے انصافیوں کا شدید احساس ہے۔ اتنا شدید احساس کہ یہ کانٹا ہر دم ان کے ضمیر میں کھٹکتا رہتا ہے۔ اور اسی لئے ان کے ہاں غصہ بھی ہے، طنز بھی۔ نفرت اور بے زاری بھی ۔

مفلسی سے تنگ آکر کوئی مفلس مر گیا
خودکشی کی ایک سرخی لگ گئی اخبار میں

مگر ان کے ہاں منفی جذبوں سے کہیں بڑا رشتہ درد کا ہے جو انہیں استحصال کے شکار سبھی عناصر سے ہم آہنگ اور ہم نوا کرتا ہے۔ تفصیل اس مجموعہ کے انتساب میں موجود ہے۔

اگر صیاد مجھ پر مہرباں ہوگا تو کیا حاصل
زیادہ سے زیادہ میری زنجیریں بدل دیگا

ان غزلوں اور نظموں کا خالق انسانیت کے اس درد و کرب کو محسوس کرتا ہے جو وہ تہذیب کے اس دوراہے پر جھیل رہی ہے۔ ایک طرف علم و عرفان کے چہرے سے نقابیں اٹھتی جا رہی ہیں، انسان ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ خلا کی تسخیر ہو رہی ہے۔ زندگی کے راز فاش ہو رہے ہیں۔ وہ بیماریاں جو کل تک موت کا

پیغام تھیں اب علاج سے دور کی جاسکتی ہیں۔ انسان خود اپنے کو بہتر طور پر پہچان رہا ہے اور دوسری طرف تسخیر شدہ خلا میدان جنگ بن رہا ہے۔ ایٹمی آلودگی سے سانس لینا مشکل ہوتا جارہا ہے، استحصال بڑھ رہا ہے خیالات کی قدامت پرستی، توہمات کی پرستش اور دقیانوسیت کے سائے پھیلتے جارہے ہیں، انسان پر انسان کے ہاتھوں ظلم بڑھتا جارہا ہے۔ عورتیں چاردیواری میں قید، نئے دور کے نقیب پس زنداں، روشن خیالی کا نام لینے والے آمروں اور جابروں کے شکار!

عجب انداز سے پیاسے پڑے ہیں
ہمیں اٹھ کر سمندر دیکھتا ہے

عطا کیا ہے اگر منصب سخن مجھ کو
قلم کے ساتھ مجھے حرف لازوال بھی دے
کوئی فرشتہ مدد کے لئے نہ آئے گا
تو اپنے ذہن سے یہ واہمہ نکال بھی دے
دامن ہزار دہر میں ہوتے ہیں تار تار
بنتی ہے تب قبا کسی زریں کلاہ کی

بخش لائلپوری نے زندگی کو اسی موڑ سے دیکھا ہے۔ ایک ایسے دردمند انسان کی نظروں سے جو ایمانداری سے جینا چاہتا ہے اور جس کا دل پوری انسانیت کے لئے دھڑکتا ہے جو کسی کو بھوکا، ننگا، مجبور اور لاچار نہیں دیکھ سکتا اور اس کی یہ حیرانی بجا ہے کہ آخر اس ترقی یافتہ دنیا میں اتنا دکھ اتنا استحصال، یہ قحط اور یہ دقیانوسیت کیوں ہے اور اس حیرانی سے اس کی فکر و نظر میں وسیع تر دردمندی پیدا ہوئی ہے۔

"زندانِ شہر" کی نظمیں زیادہ تر برملا ہیں، راست لہجے کی ہیں جن میں ہنگامی موضوعات ہیں، عمل کی تلقین اور ترغیب ہے۔ نعرہ ہائے جنگ بھی نظم ہوئے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت البتہ قابل قدر ہے کہ ان کا دائرہ فلسطین سے امریکہ تک، ایتھوپیا سے افریقا اور پاکستان تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں کہیں بھی ظلم و استبداد نے سر اٹھایا ہے بخش کا دل ان مظلوموں کے لئے دھڑکا ہے۔ ان نظموں میں تندی نمایاں ہے جو لفظوں کے گریبان پھاڑ کر نکل پڑتی ہے۔ کہیں کہیں خطابت کا جوش بھی ہے جو آج کل نامانوس اور غیر مروج ہو گیا ہے بعض نظمیں ایسی ہیں جن کے ترانہ بن جانے کا امکان ہے اور کم سے کم ایک نظم "وقت" کا ان دونوں سے جداگانہ اپنا خیال افروز لہجہ ہے۔ بخش کا اصل آرٹ غزل میں نمایاں ہے۔ جس کے مطالعہ سے اس کے احتجاجی اسلوب کی پہچان اور مدافعتی لہجے کی شناخت ہوتی ہے۔

مجھے اُمید تھی اُس شخص سے بنیاد محکم کی
خبر کیا تھی مرے گھر کا وہ نقشہ ہی بدل دیگا
ہمارا شہر تو چھوٹا ہے لیکن
ہمارے شہر کا مقتل بڑا ہے

بخش کی شاعری کا مرکزی نکتہ عروج کیا

ہے؟ دیانتدار، مخلصانہ اور دردمندانہ وجود کے لئے زندگی کی ناہمواریوں کا ناقابل برداشت ہونا۔ یہ ستم وہ ہے جس کے ردعمل کے طور پر کہیں کہیں نغمہ چیخ بن گیا ہے۔ خود بخش نے اعتراف کیا ہے۔

ظلم جتنا شدید ہوگا
چیخ اتنی بلند ہوگی

اس "چیخ" کو نکھار اور سنوار کر نغمہ بنانے والے اور اس کی روشنی اور تلخی کو مسکراہٹوں اور لطافتوں میں چھپانے والے بہت ہیں۔ مجھے بخش لائلپوری کا بھی برہنہ گوئی کا لہجہ عزیز ہے وہ زخم کو زخم اور داغ کو داغ کہتے ہیں۔ اور اس کے درد و کرب سے تڑپتے ہیں جہاں جذبات اور احساسات کی تہہ داری آجاتی ہے وہاں شعر و نغمہ کا پہلو غالب آجاتا ہے۔ جہاں تجربے کی کاٹ براہ راست ہوتی ہے وہاں گفتار کی گرمی اور تلخی دونوں برقرار رہتی ہیں۔ دونوں قسم کی مثالیں ان کی غزلوں، نظموں، رباعیوں اور قطعات میں جا بجا ملیں گی۔

کبھی میں اپنے کبھی میں پرائے بس میں رہا
مرا تمام سفر عالم ہوس میں رہا
بڑے خلوص سے اپنا لیا ہے گھر کی طرح
میں تاحیات نظر بند جس قفس میں رہا
تمہارے شہر میں اہل ستم کی بھیڑ اتنی تھی
تمہیں معلوم کیا کس کس کے ہم پاؤں تلے آئے
ہم جہاں گردوں کے اب تک گھر سلامت ہیں اگر
شہر میں پھر کس لئے اتنا دھواں ہے دوستو
سمندروں سے کوئی موج سر بلند اُٹھے
کہ ساحلوں پہ تڑپتے ہیں جاں بلب کب سے
کہا یہ کان میں کیا سرپھری ہواؤں نے
ہمارے ذہن سے اہلِ ستم کا ڈر بھی گیا

وہ اپنے قد کو پیمانہ بنا کر
مرے سورج کی قامت ناپتا ہے

ان اشعار کے پہلو بہ پہلو ایک رنگِ سخن وہ ہے جس میں بخش کی شاعری اور شخصیت کا ایک عجیب قلندرانہ سرمستی والا روپ سامنے آتا ہے۔

بیٹھے بیٹھے ہمیں اچانک
کیسے کیسے خیال آئے
زلفِ گیتی تو کیا سنورتی
دل کی حسرت نکال آئے
زیرِ خنجر بھی اپنے لب پر
زندگی کے سوال آئے،

مظلوم کی مدد کو تو نکلا نہیں کوئی
اور ظالموں کے حق میں دلیلیں نکل آئیں
یہ عجب بات کہ ساعت ہو قبولیت کی
حوصلہ دل میں مگر ترکِ دعا کا رکھنا

وقت کی دیمک چاٹ گئی ہے سایہ دار درختوں کو
دھوپ میں ہم کس پیڑ کے نیچے پل دو پل آرام کریں

بظاہر شان شوکت سے کھڑے ہیں
سب اندر سے مگر ٹوٹے پڑے ہیں

ان دونوں لہجوں سے بخش کی شاعری عبارت ہے۔ ان کے احساس کی تندی تیزی۔ غصہ اور دردمندی اور ان کی شخصیت کی ربودگی، قلندری اور بے ساختگی میں ان کے فن کی دلکشی چھپی ہوئی ہے۔ اس شاعری میں نہ شخصیت کا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے۔ اور نہ فن کے پینترے اور جمالیاتی کرتب دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ عصر حاضر کے انساں کے درد و داغ، جستجو و آرزو کا کھرا اور بے ملاوٹ عکس ہے جس میں نہ دقیانوسیت اور ماضی پرستی کے تعصبات ہیں نہ فیشن اور فارمولے کی نہک ہے اور نہ ہی مصلحتوں اور شہرتوں کی آئینہ بندی۔

بخش روشن خیال انسان ہیں اور بیسویں صدی کے تہذیبی رویوں سے متاثر۔ وہ ہر قسم کی رجعت پسندی کو للکارتے ہیں خواہ وہ مذہب اور مذہبیت کے پیرائے میں ہو یا سیاست کے پیرائے میں کیونکہ ہر صورت میں وہ انسانی ارتقا میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے اور انسان کی جمالیاتی تخلیق میں رخنہ ڈالتی ہے۔ ''زندانِ شہر'' کی شاعری کے مطالعہ سے بخش لائل پوری کی فکری جہتوں اور فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کی تہہ داری کا ایک بھرپور تاثر قاری کے ذہن میں ابھرتا ہے۔ مذہبی دقیانوسیت پر ''مُلاجی کی بستی'' میں بھرپور وار کیا گیا ہے۔ ''سیاہ فام'' میں امریکی وافریکی نیگرو کی حمایت کی گئی ہے۔ ''جنگ نہیں ہے امن کا گہنا'' میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے اور اس موضوع پر اردو کی یہ ایک منفرد نظم ہے۔ ''چودہ اگست''، ''مارشل لا''، ''عوام دشمن سپاہ''، ''اسلام آباد'' ''افسردہ حسینہ'' اور ''قائداعظم گیا'' عنوانات کی نظمیں پاکستان کی صورت حال پر ہیں۔ لمحوں کی زنجیر۔ ایتھوپیا کے قحط اور فلسطین کی نظموں سے شاعر کی بین الاقوامی ہمدردیوں کا نشان ملتا ہے لیکن ان نظموں میں غالباً سب سے بھرپور نظم (مسلسل غزل) ''بند ہیں'' کے عنوان کی ہے

لمحہ لمحہ بڑھ رہا ہے خود فروشوں کا ہجوم
تاجرانِ سرفروشی کی دکانیں بند ہیں
تافلک اک حلقۂ زنجیر کی جھنکار ہے
طائر آزاد فطرت کی اڑانیں بند ہیں
کوئلہ افراط میں ہے روسیاہی کے لئے
اور ہمارے شہر میں ہیرے کی کانیں بند ہیں
شدّتِ رنج و الم سے چیختا کوئی نہیں
بے حسی کے دور میں حق کی اذانیں بند ہیں

بخش کی شاعری اسی بے حسی، جمود اور سکوت میں دیانتدارانہ ضمیر کی چیخ ہے جو مصلحت کی دیواروں سے آواز بن کر چھن رہی ہے۔ اس کی پذیرائی

میں فن کی آبرو کی پذیرائی ہے۔ ورنہ فن بھی دوسری اشیاء کی طرح بکری کا مال ہو کر رہ جائے گا۔ مارکس نے ۱۸۴۸ء میں اپنے اشتراکی منشور میں پیش گوئی کی تھی کہ سرمایہ داری کے عروج اور ذاتی نفع کے لئے انسانی استحصال کی کوششیں پورے معاشرہ کو نیلام گھر بنا دیں گی۔ اور تمام علم و ہنر، فکر اور فن جنسِ بازار بن کر رہ جائیں گے۔ اور عالم، فاضل، مفکر اور فنکار آجر اور مزدوروں کے ساتھ تولے جائیں گے۔ اقبال نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ جب اس نے افغان دہقان سے مخاطب ہو کر محراب گل کی زبانی کہا تھا:

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

بخش لائلپوری کی شاعری اس نیلام گھر میں ایک ایسے فنکار کی آواز ہے جو بکنے کو راضی نہیں ہے، جسے مصلحتیں خاموش نہیں کر پاتیں۔ اور مذہبی کٹر پن، رجعت پسند جبر، سیاست کی سختیاں اور تعصبات کی زنجیریں روک نہیں پاتیں اور اس کی شاعری کا کوندا ظلمت میں روشنی کی لکیر بن کر لپکتا ہے کہیں وہ فن کی رعنائیوں کو چھو لیتا ہے اور اس کے دامن میں ست رنگی قوس قزح کے رنگ کھل اٹھتے ہیں۔ کہیں صرف تلخی، تندی، غصہ اور دردمندی کی نذر ہو جاتا ہے اور چیخ بن کر رہ جاتا ہے مگر اس کی دونوں حیثیتیں ایک دیانت دارانہ فن کار کی سرگزشت کے طور پر ہمارے دور کے لئے لائق توجہ ہیں۔ بقول بخش لائل پوری ؂

دل کے ورق پر نقش رہے گی
زندہ لفظوں کی تحریر

دل نے کیا نہ سینۂ صد چاک نے کیا
اِک حشر جو بپا مرے ادراک نے کیا
اک عمر اپنی نزع کے عالم میں کٹ گئی
یہ کھیل ہم سے قاتلِ سفاک نے کیا
جس کا نصیب دار تھی اس کے ہے سر پہ تاج
کیسا ستم یہ گردشِ افلاک نے کیا
مِٹ کر بھی تو خطاب کی گرمی نہیں گئی
ذرّوں کو ہم زبان مری خاک نے کیا
جو کام میری عجز بیانی نہ کر سکی
وہ کام میرے لہجۂ بے باک نے کیا

xxxxxxxxx

ایک حرف میرا بھی

جاوید حکیم قریشی، لندن
سابق رکن پنجاب اسمبلی

بخش لائلپوری کے پہلے شعری مجموعے "لہو کا خراج" کے دیباچے میں فارغ بخاری نے پیشن گوئی کی تھی کہ اگر بخش کی شاعری اسی طرح ارتقا پذیر رہی تو وہ جلد اردو کے مشاہیر شعرا کی صف میں کھڑا ہو جائے گا۔ فارغ بخاری کی یہ پیشن گوئی تو "لہو کا خراج" کے منصۂ شہود پر آتے ہی پوری ہو گئی تھی اور آج جب بخش کا تیسرا شعری مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس نے اپنے شعری سفر کی کئی اور منازل طے کر لی ہیں۔ مختلف مکاتیب فکر کے نقادانِ فن بخش کو ایسا شاعر تسلیم کر چکے ہیں جس کا اپنا ایک اسلوب اپنا ایک نظریہ اور اپنی ایک سوچ ہے۔ اس وقت بخش کی شاعری کے محاسن کا تجزیہ کرنا نہ تو میرا مقصد ہے اور نہ ہی منصب، مجھے تو اپنی دوستی کے ناطے بخش کی شخصیت اور اس کے نظریات کے حوالے سے کچھ عرض کرنا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بخش کی شاعری کو کسی طرح بھی اس کی شخصیت سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بخش کلیشے زدہ شاعر نہیں، نہ ہی وہ کتابوں میں پھول رکھنے والا شاعر ہے۔ وہ تو اپنے نظریات کے تناظر میں پوری انسانیت کا شعوری طور پر احاطہ کرنے والا قلم کار ہے۔

بخش سے میری دوستی بہت پرانی نہیں۔ میں اس کا لنگوٹیا تو کیا جوانی کا یار بھی نہیں لیکن سات آٹھ سال کا عرصہ اتنا کم بھی نہیں ہوتا کہ شناسائی گہری دوستی میں نہ بدل سکے۔ بخش سے میرا تعارف عمر کے اس مرحلے میں ہوا۔ جب ہم دونوں پختگی کے دور میں داخل ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود میری اور بخش کی دوستی میں جذبات کا خاصہ دخل ہے اور یہ جذبات اس نظریاتی ہم آہنگی سے وابستہ ہیں جو بخش کی شاعری اور میری سیاست کا محرک ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میری "سیاسی مصلحتوں" کی طرح بخش کی شاعرانہ مصلحتیں، کبھی اس کے مسلک کی راہ میں نہ حائل ہوئیں۔ بخش لائلپوری نہ صرف ترقی پسند ہے بلکہ بائیں بازو کی واضح سائنسی سوچ رکھتا ہے۔ ذہنی، فکری اور نظریاتی اعتبار سے وہ ترقی پسند نظریات کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتا ہے اور اس باب میں وہ کسی قسم کی مصلحت یا مصالحت کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوتا۔ بخش کا یہی اصول اور بے لچک رویہ کبھی کبھی مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اب اس سخن گسترانہ بات کو بخش کی خوبی سمجھئے یا خامی لیکن یہی اس کی شخصیت اور فن کا حقیقی اظہار ہے۔ بخش اپنی ذاتی اور فنی دونوں زندگیوں میں کھرا انسان ہے۔ اس میں اور اس کی شاعری میں ذرا سا بھی تضاد نہیں۔ وہ جس کا

دوست ہے، علی الاعلان دوست ہے اور جس کا دوست نہیں، اسے وہ کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دیتا۔ بخش کے اس غیر منافقانہ رویے نے اس کی شخصیت میں ہلکا سا کھردرا پن پیدا کر دیا ہے لیکن کھرچ کر دیکھئے تو اس کھردری سطح کے نیچے نہایت ملائم اور ہمدرد شخصیت نظر آئے گی۔

بخش سے میری دوستی کی ابتدا اس کی سیاسی بصیرت اور شاعرانہ تفکر کے حوالے سے ہوئی تھی۔ ہماری ذہنی ہم آہنگی بڑھتے بڑھتے ذاتی دوستی اور اشتراک عمل میں بدل گئی۔ گزشتہ آٹھ سالوں میں ہم دونوں نے کئی ادبی، ثقافتی اور سیاسی محاذوں پر اکٹھے کام کیا۔ اس دوران ہماری دوستی کئی آزمائشوں سے بھی گزری۔ بعض مرحلے ایسے بھی آئے کہ تعلق اور بے تعلقی میں برائے نام سا فاصلہ رہ گیا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ بخش ہی کی ذات تھی جس نے دوستی کے اس رشتے کو نہ صرف ٹوٹنے نہیں دیا بلکہ ہر بار پہلے سے زیادہ مضبوط بنایا۔ بخش کا یہ رویہ صرف میرے ساتھ ہی نہیں۔ وہ تو ایک عرصے سے ان 'دوستوں' کو بھی برداشت کئے چلا جا رہا ہے جنہوں نے بخش کے بل پر اپنا مقام بنایا اور پھر اپنی تمام توانائیاں اس بات پر صرف کر دیں کہ کہیں اس سلسلے میں کوئی بھولے سے بھی بخش کا نام نہ لے بیٹھے۔

گزشتہ عشرے میں برطانیہ کی بڑی بڑی ادبی انجمنوں، بین الاقوامی کانفرنسوں، مشاعروں اور مذاکروں کا محرک اور معمار بخش رہا ہے۔ فیض اکیڈمی سے انجمن ترقی پسند مصنفین تک ہر قابل ذکر ادبی ثقافتی، تنظیم کی بنیاد بخش کے ہاتھوں رکھی گئی اور وہ کسی ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز ان کاموں کو اپنا فرض سمجھ کر پورا کرتا رہا بلکہ اکثر اپنی کامیابیوں کے پھول دوسروں کے دامن میں ڈال کر مگن رہا۔ دوستوں اور نظریات سے خلوص بخش کی شخصیت کا ایسا حسین رُخ ہے جس پر مجھے ہمیشہ رشک آتا رہا ہے۔ بخش کی شاعری کے تیسرے مجموعہ "بادشال" میں آپ کو اس کی شخصیت پوری طرح نظر آئے گی۔ یہ مجموعہ متعارف کراتے وقت مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں دوستی کی اس تکون کا ایک ضلع ہوں جس کے دوسرے ضلعے بخش لائلپوری اور یونس تنویر ہیں۔

زندگی کی منتظر آنکھوں کے شیشے توڑ کر
کیا سمجھتا ہے کہ تو آئینہ گر ہو جائے گا
اوڑھ کر بدنامیٔ الفاظ کی تن پر قبا
بزمِ عریانی میں اُونچا تیرا سر ہو جائے گا
لمحۂ موجود سے آنکھیں چُرائے گا اگر
آنے والا وقت تجھ سے بے خبر ہو جائے گا

xxxxxxxxxxx

موسم بدلنے کا منتظر

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی۔ سویڈن

بخش لائلپوری، مہاجر شعراء میں اپنی پہچان رکھنے والا شاعر ہے۔ "ابھی موسم نہیں بدلا" اس کا چوتھا اردو مجموعۂ کلام ہے۔ لہو کا خراج ۱۹۸۵ء میں، زندانِ شہر ۱۹۸۷ء میں اور بادِ شمال ۱۹۸۹ء میں چھپے تھے۔ یہ مجموعہ ۱۹۹۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ غیر ملک میں رہنا اور چاروں طرف سے اپنوں اور غیروں کی غیریت میں گھرے رہنے کے باوجود شعر کہتے چلے جانا اسی کو سزاوار ہے جو حوصلہ مند اور جری ہو۔ بخش اندر باہر کی کشمکش میں فتح مند ہو کر ابھرا ہے۔ اسے یقین ہے کہ موسم بدلے گا مگر اسے اس بات کا بھی اندازہ ہے کہ "ابھی موسم نہیں بدلا"۔

بخش لائلپوری سے پہلی ملاقات، سٹاک ہالم میں مہاجر ادیبوں کی ورکشاپ ۱۹۹۶ء میں ہوئی۔ اس سے قبل بخش کا نام اور کام میرے علم میں آچکا تھا۔ ذاتی شناسائی کا موقعہ نہیں آیا تھا، وہ بھی آگیا۔ بخش سے ملنے اور اسے سننے کا موقعہ ملا تو خیال ہوا کہ بخش لائلپوری دل کے حملے کے بعد کچھ زیادہ ہی فکرمند رہنے لگا ہے۔ جب اس کی کتاب "ابھی موسم نہیں بدلا" پڑھی تو اس بات کا یقین آگیا کہ بخش دل کے ہاتھوں تنگ نہیں دوست نما دشمنوں کے ہاتھوں تنگ ہے۔ اسے دوستوں کی منافقت کے خلاف سراپا جہاد پایا۔ وہ موسم کے خلاف جہاد میں مصروف ہے اور اس یقین کے ساتھ مصروف ہے کہ موسم بدلے گا۔ منافقت کے منحوس سائے چھٹ جائیں گے، دوستی پھر خلوص اور محبت کا رنگ روپ اختیار کرلے گی۔ بونے، قد آور نہیں بنائے جائیں گے اور قد آوروں کی قدر و قیمت ان کے قد و قامت کے حساب سے جانی جائے گی۔ منافقت، جسے ہمارے سائنسدان شاعر دوست نصیر احمد خان نے، "اس دور کا اخلاقی کوڑھ" قرار دیا تھا دنیا سے مٹ جائے گی۔ بخش موسم بدلنے کا منتظر شاعر ہے۔ اس نے ابھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ پرُامید احتجاج بخش کا خاص لہجہ ہے۔ اسے یقین ہے کہ زمانہ اس کے لہجہ کو پہچانے گا کیونکہ اس کا رنگِ سخن اشتہار کا محتاج نہیں۔

مزا تو جب ہے کہ رنگِ سخن ہو وجہِ نمود
جو اشتہار کی محتاج ہو وہ شہرت کیا؟

وہ اس پیغام کا علمبردار ہے کہ

شاعری میں خود تعین مت کریں اپنا مقام
اس طرح کے فیصلے تو اس طرح ہوتے نہیں

بخش لائلپوری سے ملنے کے بعد میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ شخص سچ کو سچ کہنا جانتا ہے اور ایسا کرنے کے لئے اسے دوسری بار سوچنا نہیں پڑتا۔ ہم ایسے دور سے گزر رہے ہیں جہاں سچ کو سچ کہنا ہی سب سے بڑا جرم ہے۔ سچ کو سچ کہنا تو مشکل تھا ہی یہ دور تو جھوٹ کو جھوٹ بھی نہیں کہنے دیتا۔ بخش نے اس میدان میں اتر کر نعرہ لگایا ''شور گھر کے باہر ہے چور گھر کے اندر ہے''۔ اندر کے چور کو للکارنے والے کا نام بخش لائلپوری ہے۔

ہمارے ہاں ایک بدعت چل پڑی کہ ہم لوگ شہروں کے نام بدلنے لگے۔ منٹگمری کو ساہیوال کہنا تو بجا تھا کہ یہی اس شہر کا پرانا نام تھا۔ کیملپور کو اٹک کہہ دینا بھی مناسب تھا کہ تاریخ میں یہی نام مروج رہا مگر لائلپور کو فیصل آباد کہنا تو ایسے ہی تھا جیسے ایک غیر ملکی کے نام کو ہٹا کر ایک دوسرے غیر ملکی کا نام اختیار کر لیا جائے۔ پہلے نے تو یہ شہر بسایا تھا دوسرے نے اس شہر کو سوائے نحوستوں کے اور کیا دیا ہے؟ بخش نے اس بدعت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ بھی بخش لائلپوری کی بجائے بخش فیصل آبادی لکھنے لگتے تو یونہی لگتا جیسے انہیں مسلمانیاں بٹھا دیا گیا ہو۔ بخش نے اس تکلیف دہ عمل سے گزرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ بخش دوسروں کے کئے ہوئے فیصلے اپنے اوپر مسلط نہیں کرتا۔ اسے دوسروں کے احمقانہ فیصلوں کو رد کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔

مہاجر ادیبوں کی کانفرنس میں جو مسائل زیر بحث آئے لوگ ان کے بارہ میں مقالے لکھ کر لائے تھے مگر بخش نے ان سارے مقالوں کا جواب پہلے سے اپنے مجموعۂ کلام میں دے رکھا تھا۔ اس کی کتاب ابھی موسم نہیں بدلا کا عنوان ہی نہیں اس کا سارا متن ہی مہاجرت کے عنوانات سے مملو ہے:

درد ہجرت کے ستائے ہوئے لوگوں کو کہیں
سایۂ در بھی نظر آئے تو گھر لگتا ہے

بھٹک رہے ہیں ابھی زیست کے سرابوں میں
مسافروں کو شعور سفر نہیں آیا
دیار غیر میں میرا وہ سر پھرا بیٹا
گیا ہے گھر سے تو پھر لوٹ کر نہیں آیا

دشتِ غربت کی بلاؤں سے بھی ڈر لگتا ہے
گھر کی بے رحم فضاؤں سے بھی ڈر لگتا ہے

ہجرتوں سے لہو لہو خلقت
خوبصورت دیار مانگتی ہے

ہمیں ہر آن آمادہ بہ ہجرت
ہمارا آب و دانہ مانگتا ہے

بخش لائلپوری کو اپنے لہجے اور اپنے نو بہ نو تخیل پر اعتماد ہے اسی لئے تو وہ کہتا ہے:

نو بہ نو تخیل ہے دل پذیر مصرعے ہیں
بخش شعر گوئی کا آخری پیمبر ہے

اور یہ بات وہ اس دور میں کہہ رہا ہے
جب تنگ نظر ملا نے ذہنوں کو مسموم کر رکھا ہے۔ مذہب کے نام پر دہشت گردی روا رکھی جا رہی ہے۔ جہالت کا سکہ رائج ہے

ہر ایک مکتب علم و ادب پہ چھائی ہیں
فروغ عام پہ مائل جہالتیں کیا کیا

بخش لائلپوری ہر اس رویہ کو للکارنے کی جرأت رکھتا ہے جو اسے نوع انساں کی ترقی میں حائل نظر آتا ہے۔ اپنے وطن میں جو سرکاری درباری ادب رائج کرنے کی کوشش کی گئی اور جس طرح بڑے بڑے مگادھری ادیب اس دہلیز پر سربسجود ہوئے بخش نے بلا خوف لومتہ لائم اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس کا احتجاج رائیگاں نہیں گیا کیونکہ اس کے بعد بہت سے ایسے آئے جو اس کی راہ پر چلنے والے نکلے۔
بخش لائلپوری کے ہاں احتجاج کیلئے مزاحمتی ادب کی روایتی علامتیں در نہیں آئیں مگر ان علامتوں کے نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے لہجے میں ایسی تلخی پیدا کرلی ہے کہ اس کا احتجاج نمایاں ہو کر ابھرتا ہے۔

کھا لیا ہے تو اسے دوست اگلتے کیوں ہو؟
ایسے پیڑوں پہ تو ایسا ہی ثمر لگتا ہے
یا

ٹپک رہی ہے خباثت ہر ایک چہرے سے
ابل رہی ہیں دلوں میں کدورتیں کیا کیا

بخش نے تلوار اتلخ ترمی زن کو اختیار کیا ہے مگر اس کے باوجود اس میں ذوق نغمہ کی کمیابی نہیں ہے۔
بخش لائلپوری کے ہاں، ہمارے معاشرہ میں رواج پا جانے والی متضاد کیفیتوں کا احساس بہت نمایاں ہے۔ اس نے انہی متضاد کیفیتوں کے تضاد کو بار بار بیان کیا ہے تاکہ پڑھنے والے پر ہمارے معاشرہ میں راہ پا جانے والے دوغلے پن کا اظہار ہو سکے ''پتھر کو بت لکھیں کبھی بت کو خدا لکھیں۔'''' دیدۂ بے رنگ میں خوں رنگ منظر رکھ دئے۔'' ''روح دربستہ بدن پتھر کی دیواروں میں بند۔'' منزلوں نے سوچا ہے فاصلوں نے دیکھا ہے۔'' غرض ان کے ہاں تضادگری کی کیفیت بہت نمایاں کیفیت ہے اور اسی ناطے سے وہ اپنے قاری کو جھنجھوڑتے چلے جاتے ہیں۔
مجھے یقین ہے بخش لائلپوری کی موسم بدلنے کی آرزو ضرور پوری ہو گی۔

چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا (بخش لائلپوری کی شاعری)

حیدر طباطبائی۔ لندن

بخش لائلپوری کی شاعری میں فکر کی توانائی، خیالوں میں تازگی، بلندی اور بے باکی غیر معمولی طور پر نمایاں ہے۔ اس توانائی کا سرچشمہ کہاں سے پھوٹتا ہے؟ بنیادی طور سے بخش ترقی پسند تحریک کے اچھے شاعر اور حلقۂ دانشوراں میں سے ہیں، اس کے علاوہ وہ محبِ وطن، محبِ قوم اور اعلیٰ انسانی اقدار کے امین ہیں۔

بخش لائلپوری ابھی کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ کر رہے تھے کہ سید سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کو راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کر کے پسِ دیوارِ زنداں بھیج دیا گیا، یہ پچاس کی دہائی ادیبوں اور شاعروں پر بہت گراں گزری۔ بخش ایک انقلابی شاعر ہیں ان کی شعلہ مزاجی اور آتش پارہ طبیعت نے ان دونوں رہبروں کی گرفتاری سے اتنا اثر لیا کہ ان کے ترقی پسند نظریات، عزائم اور عالمی ادب پر ان کے نظریات اور بھی محکم ہوگئے۔ سَن پچاس کی دہائی میں پہلی بار پاکستان میں جمہوریت کا خون ہوا اور فوجی افسروں کی آمد کے ساتھ بڑا اندھیر ہوا۔ بخش ان حالات کو اور ادبی دنیا پر پائی جانے والی کشمکش کو چھپا نہیں پائے۔ اگر بخش لائلپوری کی شاعری کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاید ہی برصغیر میں رونما ہونے والا کوئی اہم سیاسی واقعہ ان کی گرفتِ تخیل سے بچ سکا ہو۔ ان ممالک میں فاسد حکومتوں کی جانب سے بدعنوانیوں، غریب عوام کے استحصال اور فوجی استبداد وغیرہ کے مضامین کو غزل ایسی صنف نازک میں نہایت حسن و خوبی سے انہوں نے پیش کیا ہے۔ برصغیر میں موجود مسائل خاص طور پر بخش کے وطن پاکستان میں، کہیں تو ملائیت عقاید کا فریب دے کر سادہ لوح افراد کا استحصال کر رہی ہے، اور کہیں سیاسی مداری لوٹ کھسوٹ میں لگے ہیں۔ بخش بحیثیت ایک حساس دل شاعر ان تمام مفسدانِ فی العرض کی خوب شناخت رکھتے ہیں۔ چنانچہ بخش کے معاصرین میں شاید ہی کسی شاعر نے سماج کے ہر رستے ہوئے ناسور کا اتنی گہرائی سے مطالعہ کیا ہو۔ اردو شعراء کا ایک المیہ یہ ہے کہ وہ زلفِ محبوب کے پیچ و خم نکالنے میں اس طرح لگ جاتے ہیں کہ ان کو اطراف کی سیاسی نیرنگیوں اور عوامی مسائل کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی ہے۔

باشعور شعراء نے ہمیشہ ہی عوامی حالات، خاص طور سے تیسری دنیا میں پائی جانے والی بے چینی کو ہی اپنا محبوب بنالیا۔ اور اپنے افکار کو شاعری کے قالب میں ڈھال کر اس بے چینی کے پیچ و خم کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرز کو غالب کے بعد نمایاں

انداز میں علامہ اقبال نے پیش کیا۔ جس نے ان کو ربع صدی میں حکیم الامت، ترجمانِ حقیقت، لسان الاسلام اور شاعر مشرق بنا دیا۔ پھر فیض نے نہایت حسن کے ساتھ غزل کا رخ عوامی و سیاسی حالات کی جانب موڑ دیا۔ فیض کے بعد صرف دو شاعر اس نہج پر گامزن نظر آتے ہیں۔ حبیب جالبؔ اور بخش لائلپوری۔ بخش کی شاعری کوئی حادثاتی شاعری نہیں ہے اور نہ ہی اس میں واقعات کا سرسری یا سپاٹ بیان ہے۔ بلکہ اکثر ملکی واقعات ان کے تصور اور تخیل سے منسلک ہو کر کسی بڑے خیال کی ایک کڑی بن چکے ہیں۔ ان کی غزل میں بھی حالات کی کج روی داخلی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ داخلی حس خود ماحول سے پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح شاعر بلاواسطہ طور سے اپنے گردوپیش کا ترجمان گیا ہے۔ بخش کے لحن میں شدت تسلسل اور برجستگی جس انداز میں ملتی ہے وہ ان کو منفرد بنا دیتی ہے۔ وہ پاکستان کے حالات اور آشوب حالات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

لمحہ لمحہ بڑھ رہا ہے خود فروشوں کا ہجوم
تاجرانِ سرفروشی کی دکانیں بند ہیں
تا فلک اک حلقۂ زنجیر کی جھنکار ہے
طائرِ آزاد فطرت کی اڑانیں بند ہیں
کیونکہ افراط میں ہے رُو سیاہی کے لئے
اور ہمارے شہر میں ہیرے کی کانیں بند ہیں
شدتِ رنج و الم سے چیختا کوئی نہیں
بے حسی کے دور میں حق کی اذانیں بند ہیں

ہر بدن پر ہے یہاں بے رحم کوڑوں کا نزول
دست و پا جکڑے ہوئے ہیں اور زبانیں بند ہیں
اہلِ پاکستان کا حالِ زبوں تو دیکھئے
اک اندھیری کوٹھری میں سب کی جانیں بند ہیں

ان اشعار میں بڑی صداقت اور سلیقے کے ساتھ حالات کا نوحہ نظم کیا ہے۔ دوسری جانب بخش کے اشعار سوئی ہوئی غیرت کو جگاتے ہیں۔ عوام کو حوصلہ اور مبارزہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ نظم ہو یا غزل سب سے بڑی خصوصیت بخش کے کلام میں پنہاں طنز ہے۔ یہ طنز شاعر کی ذات کا کرب ہے جس سے وہ عوام میں نئی روح پھونک کر ان کو مجادلے پر آمادہ کرتا ہے۔

پھر بخش نے یورپ میں رہ کر یہاں کے لوگوں میں جو تہذیب کی طوائف الملوکی کی زد میں ہیں، اور فرنگی مآب ایشیائی گھرانوں کی جو حالت زار ہے۔ اس جانب کس حسن و خوبی سے پیغام دیا ہے۔ برصغیر سے آنے والے مہاجرین کی دوسری نسل نے جوان ہو کر اپنے اجداد کا ورثہ گنوا دیا اور یورپ کی تہذیب بھی ان میں نہیں آپائی۔ ایک نیا انداز ثقافت و تہذیب ان میں ملتا ہے جس کو ایمگرینٹ کلچر (Immigrant culture) کہہ سکتے ہیں۔ جوان بیٹے عام طور سے ناواقف آداب ہیں۔

یہ بات بات پہ اب مجھ کو ڈانٹ دیتا ہے
دیارِ غیر میں بیٹا مرا جوان ہوا

ایشیا سے ہجرت کر کے یورپ آنے والوں کی اکثریت محنت کش طبقے سے متعلق ہے جن کا عقیدہ یہاں آکر بھی ضعیف ہے اور مکار مولوی یہاں آکر گنڈے تعویز کرنے اور نت نئے حیلے کرنے سے نہیں چوکتے۔ بخش اس جانب کیا پیارے انداز میں افشاگری کرتے ہیں۔

ہر دینِ مبیں کی مسند پر
بے دینوں کی خر مستی ہے
یہ ملا جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
صدیوں کے پرانے معبد پر
اک دنیا نئی آباد کرو

حرام رزق پہ جن کی حیات پلتی ہے
وہ اہلِ شہر کو درسِ حلال دیتے ہیں

ہر چور یہاں کا رہبر ہے
ہر پیر ہوس کا بندہ ہے
ہر دل میں ہے زہر تعصب کا
ہر سر میں جنوں کا پھندا ہے
ہر علم و ادب کے مکتب میں
کج ذہن کی بالادستی ہے
یہ ملا جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
اس فکر و نظر کے گلشن کو
گل چینوں سے آزاد کرو

بخش نے بہت سے شعراء سے الگ ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی راہ بنائی ہے۔ یہ راہ صرف کانٹوں بھری راہ ہے، اس میں کہیں بھی مخمل و دیبا کا فرش نہیں ہے۔ وہ ہر گام پر خطرات سے کھیلتے ہیں ان کے شعری آہنگ میں شعلے لپکتے ہیں۔ حساس قاری کے ذہن پر بجلی کوندجاتی ہے۔ بخش نے زلف ور خسار جیسے کاذب عنوان چھوڑ کر جو مضامین اپنائے ہیں وہ اپنے عہد کی فکر کے آئینہ دار ہیں۔ وہ اپنی نظم "ملاجی کی بستی" میں سماج کے سیاہ تاریک اور منفی پہلو کی کس شان سے نقاب کشائی کرتے ہیں۔

یہ فسق و فسوں کی محفل ہے
ہر جسم یہاں کا گندہ ہے
تم مردِ خدا کہتے ہو جسے
وہ اپنے نفس کا بندہ ہے
یہ کذب بیانی کا مرقد
یہ ایمانوں کی پستی ہے

پندار و رعونت کا پیکر
ہر پیرِ مغاں کی ہستی ہے
مسجد میں درس فقیری کا
حجرے میں عیش پرستی ہے

یہ ملا جی کی بستی ہے صدیوں کے پرانے معبد پر
اس بستی کو برباد کرو اک دنیا نئی آباد کرو

تبلیغ جنوں کے پنجوں سے
انسانوں کو آزاد کرو

چہروں پہ نمائش کی داڑھی
بغلوں میں ریا کا خنجر ہے
اخلاق کی مردہ لاشوں پر
یہ حرص و ہوس کا مندر ہے
ہر سانس گراں ہے جینے کی
اور موت یہاں پر سستی ہے
یہ ملا جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو
امکان و عمل کے جذبے سے
اک دنیا نئی آباد کرو

نظروں کے دریچے چھلنی ہیں
اوہام کے رنگیں خاروں سے
وحشت کی صدائیں آتی ہیں
اس بستی کے بازاروں سے
یہ شرک و شرر کی دنیا ہے
انسان کی تیرہ بختی ہے
یہ ملا جی کی بستی ہے
اس بستی کو برباد کرو

بخش کی راہ خاردار ہے اور ان کے تلوے لہولہان ہیں۔ ان کے یہاں حسن و عشق۔ عیش و نشاط اور آرائش و زیبائش نہیں ہے بلکہ ہر گام پر مسند نشین مطلق العنان حکام۔ مولوی۔ مُلا یا روحانی رہنما اور سیاسی روباہ گری کرنے والوں کے گریبان چاک کر دیتے ہیں۔ ان کے اشعار برملا اور بروقت ہوتے ہیں۔ ان کو آج کا انسان جہاں بھی پابہ جولاں نظر آتا ہے وہاں وہاں وہ ایک نئی آواز بن کر ابھرتے ہیں۔ ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں بطور کلی ان کے کلام میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی۔ ان کے تمام اشعار کسی نہ کسی کیفیت کے تحت لکھے گئے ہیں۔ اس طرح بھی اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری آمد ہی آمد ہے۔ بخش نے اپنی شاعری کی گیند سے آمدنی بڑھانے والی چوگان نہیں کھیلی بلکہ انہیں سیاسی رہبروں کی پستی یا سماجی و دینی محاذ پر کاربند افراد کی عدمِ استطاعت کا بہت شعور ہے۔ اس لحاظ سے ہم ان کی شاعری پر فقط تنقیدی شاعری کا لیبل نہیں چسپاں کر سکتے ہیں۔

شاعر کے تخلیقی شعور کو پروان چڑھنے اور برگ و بار لانے کے لئے حالات کا عمیق مطالعہ لازم ہے۔ اور یہ مطالعہ بخش کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ تخلیق کار میں اگر تنقیدی شعور کم ہو تو اس کی تخلیق ایک منزل پر رک جاتی ہے۔ وہ یا تو سہل پسندی

کا شکار ہو کر ایک رجعت پسند غزلچی بن جاتا ہے یا پھر اپنے کو دہرانے لگتا ہے اور بہت جلد شہید شہرت ہو جاتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ شاعر کو جو شہرت ملی ہے وہ صرف اس کے فن کی خوبی کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی نظریئے، طرز بیان، انوکھے میلان یا برجستہ اسلوب بیان کی وجہ سے، کسی مثبت تحریک اور فارمولے کے سہارے یا شاعر کی سماجی حیثیت کی وجہ سے۔ بخش کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن کی تنظیم نہایت مہذب اور باشعور انداز سے ہوئی ہے۔

ذیل کے اشعار اس بات کے ضامن ہیں:-

یہ مانا بند ہیں سارے دریچے آسمانوں کے
صدا کو رفعتِ پرواز دے کر دیکھ لیتے ہیں
یہ گونگے لب جو گویائی کی حسرت میں تڑپتے ہیں
تکلم کا انہیں اعجاز دے کر دیکھ لیتے ہیں
خرد نے جب کہ مضرابِ محبت توڑ ڈالا ہے
جنوں کے ہاتھ میں یہ ساز دے کر دیکھ لیتے ہیں
کوئی شاید خدا کے روپ میں انسان مل جائے
حرج کیا ہے، چلو آواز دے کر دیکھ لیتے ہیں

ہمیں محتسب جو ستانے لگے ہیں
وہ قصے بہت ہی پرانے لگے ہیں
ہمیں وصل کا ایک لمحہ عطا کر
تری جستجو میں زمانے لگے ہیں
ان اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈر سے
مرے ہاتھ کیا کیا خزانے لگے ہیں

ہر اک آنکھ میں اک شکایت رقم ہے
یہ چہرے بھی آئینہ خانے لگے ہیں
بدن کی زمینوں میں اہلِ تشدد
صلیبوں کی فصلیں اگانے لگے ہیں
خلاؤں میں بھی نغمہ زن ہیں پرندے
ستارے ہمیں آشیانے لگے ہیں
بڑے تیز اپنے قدم اٹھ رہے تھے
تجھے دیکھ کر لڑکھڑانے لگے ہیں

بخش کا ایک شعر تو کجا پوری پوری غزلیں و نظمیں اس قدر بلند خیالی اور پاکیزگی پر مبنی ہوتی ہیں کہ پڑھنے والے کو سنبھلنے نہیں دیتی ہیں۔ سہلِ ممتنع میں یہ گہرے پانیوں کا سفر بڑا مشکل کام ہے۔ کلامِ بخش کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کی زندگی مصیبتوں اور آلامِ حیات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ان کے دل کی کلی کبھی نہیں کھلی۔ یہ آلام ان کے عہد کا مقدر ہیں۔ وہ تیسری دنیا کے عوام کی مصیبتوں کی تقسیم میں برابر کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ جب تک وہ اپنے وطن کے ساکن رہے، سیاسی حالات نہایت مکدر تھے۔ ناانصافی اور ظلم کا بول بالا تھا۔ پھر ہجرت کی صعوبتیں ان پر سوار رہیں۔ بخش کو یورپ میں بھی دلبستگی کا سامان نہیں ملا۔ وہ ہر شوخ رنگ کو کاذب سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے وطن کے رنگوں میں لہو آشامی ہے۔ دکھوں کی دھنک ہے۔ اس طرح سے شاعر کی روح کو سکون کی جستجو ہی رہی۔ وہ اصل فنکار ہیں اور اصلی فنکار وہی ہوتا

ہے جو حالات کو شکار کرے، خود مقید حالات نہ ہو اور بخش اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

دردِ ہجرت کے ستائے ہوئے لوگوں کو کہیں
سایۂ در بھی نظر آئے تو گھر لگتا ہے
بزمِ شاہی میں وہی لوگ سرافراز ہوئے
جھکے کندھوں پہ ہمیں موم کا سر لگتا ہے
اجنبیت کا وہ عالم ہے کہ ہر آن یہاں
اپنا گھر بھی ہمیں اغیار کا گھر لگتا ہے

قاتل ہوا خاموش تو تلوار بول اٹھی
مقتل میں خونِ گرم کی ہر دھار بول اٹھی
پوچھا سنگ سروں کا نمائندہ کون ہے
سن کر فقیہِ شہر کی دستار بول اٹھی

خوابِ گراں میں ہمسرِ عرشِ بریں لگا
آنکھیں کھلیں تو آسماں مجھ کو زمیں لگا
دیوار و در بھی اب اسے پہچانتے نہیں
اپنے ہی گھر میں اجنبی گھر کا مکیں لگا
تمام رات ستارہ شناس روتے رہے
نظر گنوادی، ستارہ نظر نہیں آیا
بھٹک رہے ہیں ابھی زیست کے سرابوں میں
مسافروں کو شعورِ سفر نہیں آیا

تجھ کو ملا ہے منصبِ جلاد، مجھ کو دار
اے دوست اپنے اپنے مقدر کی بات ہے
ہے کربلا کا منظر خوں رنگ ہر طرف
تشنہ لبوں پہ بندشِ آبِ فرات ہے
کندھوں پہ دن کا بوجھ ہے جیسے کوئی پہاڑ
جو سر پہ جھومتی ہے قیامت کی رات ہے

کسی کو قتل کسی کو حلال کرتے ہیں
وہ اپنا رنگِ سیاست بحال کرتے ہیں
کہیں پہ ڈاکہ کہیں پر غبن کہیں چکمہ
یہ سارے کام اب اہلِ کمال کرتے ہیں
مقابرانِ سیاست کے حرص خوردہ نقیب
گداگرانِ ہوس کو نہال کرتے ہیں
جنہیں شعور ہے تخلیقِ شعر کا اےدوست!
وہ بانجھ لفظ کو بھی لازوال کرتے ہیں
زباں پہ ناز ہے جن کو کوئی جواب تو دیں
ہمارے عہد کے گونگے سوال کرتے ہیں
ہر سر پہ تیغ تان کے سرکار تھی کھڑی
لوگوں نے سر اٹھایا تو سرکار گر پڑی
مت پوچھئے طوائفِ لوح و قلم کا حال
بازار سے اٹھی سرِ دربار گر پڑی

پتھر کو بت لکھیں کبھی بت کو خدا لکھیں
شہرِ ادب کے مسخرے اب اور کیا لکھیں
عادت سی بن گئی ہے اب اہلِ کمال کی

بادِ سموم جب چلے بادِ صبا لکھیں
ہر دور کے یزید کا کردار ایک ہے
اک مرتبہ لکھیں کہ یا سو مرتبہ لکھیں
بارود جن کے پیٹ میں جن کے پروں میں آگ
کم ظرف ایسے کرگسوں کو فاختا لکھیں
کھانے کو زہر پینے کو خوں پھانکنے کو دھول
کیا ساکنانِ شہر کی نشو و نما لکھیں

آنکھ کے دریچے میں اک عجیب منظر ہے
شور گھر کے باہر ہے چور گھر کے اندر ہے

یہ اشعار زندگی سے بھرپور ہیں۔ ان میں حقیقت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ایسا معلوم دیتا ہے کہ شاعر لسان العوام بن گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے جہاں پورے اردو ادب کو نیا آہنگ اور اعتماد عطا کیا وہاں غزل کو بھی ایک نئی سمت عطا کی۔ ایک زمانہ تھا کہ جب عشق بتاں کو تج کر فکر معاش اور عوامی انقلاب کی بات ہو رہی تھی، اور اسی زمانے سے غزل کے قالب میں نئے انداز سے ایک خوشنما تبدیلی آئی۔ ہر ترقی پسند شاعر نے غم عشق اور غم روزگار دونوں سے انصاف کیا۔ غزل بھی زندگی کی آئینہ داری اسی وقت کر سکتی ہے جب اس میں تمدنی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے میں سمونے کی صلاحیت موجود ہو۔ بخش لائلپوری نے غزل میں اس کے حسن و ادا کے ساتھ اس کے بانکپن کو برقرار رکھا ہے۔ جس طرح کوئی لفظ کبھی حقیر نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے اور کوئی بھی لفظ ایسا نہیں کہ اسے شعر میں استعمال نہ کیا جا سکے۔ (فارسی کے دو شاعر ایرج مرزا اور کاظم زادے کی شاعری ٹکسال باہر اور متروک الفاظ سے پُر ہے اور جان بوجھ کر گرے ہوئے الفاظ کو آبرو بخشتی ہے۔ اور یہ تجربہ بھی کامیاب رہا۔ اسی طرح سے کوئی موضوع ایسا نہیں جسے شاعر نہ برت سکے۔ ترقی پسند ادیبوں نے نظم اور غزل میں جدا جدا مضامین باندھنے کے فرسودہ فارمولے کو توڑ دیا۔ اب مجاز۔ فیض۔ جذبی۔ اور مجروح کی غزلیں بھی بھرپور سیاسی انداز لئے ہوئے سامنے آئیں۔ بخش کا تعلق ادب میں اسی خانوادہ سے ہے۔ ترقی پسندوں پر اعتراض تو بہت ہوئے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ لیکن دیدہ دلیری یہ کہ جدیدیت اپنے سارے دعووں کے باوصف کوئی بیدار ذہن شاعر یا ادیب پیدا نہ کر پائی۔ آج جدیدیت ہم کو قدروں کا احساس نہیں دے رہی ہے۔ نثر ہو یا نظم کسی صنفِ سخن کے ضمن میں ایک کھلی نظر عطا نہیں کر پائی۔ جدیدیوں کی شاعری نہایت سطحی اور گنجلک و مسخرے پن کے سوا کچھ نہیں۔ نہ معلومات عطا کرتی ہے نہ علم نہ دانشمندی۔ اس کے برخلاف اگر ہم اقبال۔ جوش۔ فراق اور جمیل مظہری سے چلیں اور ترقی پسند شعراء تک آئیں تو ان کے بارے میں ایک ہی رائے سامنے آتی ہے کہ ان کا کلام ہی ضرب المثل بن چکا ہے اور آج ان تمام شعراء کے اشعار یا مصرعے بطور مثال پیش کر کے سخن کو تاہ کیا جاتا ہے۔ جبکہ جدیدیت ہنوز طفلک بے پدر ہے۔ ہر چند

کہ ترقی پسند تحریک ختم ہو چکی ہے، لیکن فکرو ادب پر وہی ۱۹۳۶ء والی آئیڈیالوجی محیط ہے۔ اسی سہارے اچھے شاعر آج بھی ابھر رہے ہیں اور ادیب و شاعر سے قاری تک کو اسی تحریک نے اعلیٰ شعور عطا کیا ہے۔ ترقی پسندی کے ہموا آج بھی استحصال، ظلم و ستم کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ جبکہ جدیدیت شہوت اور نراجیت کے ابہام میں الجھی ہوئی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں صنفِ ادب میں جو بھی مثبت کاوشیں ہیں وہ ترقی پسند تحریک کا ہی اثر ہیں۔ بخش لائلپوری لندن میں مقیم ہیں جہاں شاعروں وادیبوں کی کمی نہیں۔ اردو کے اخبار و جرائد بھی شائع ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی ادبی گردہائی نہیں ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ ایک افلاطون بنا ہوا ہے۔ یہاں تنقیدی شعور عنقا ہے۔ سنجیدہ ادبی حلقے یا کارآمد جرائد یکسر مفقود ہیں۔ ہر شخص اپنی سواری دھوم سے نکالنے کا قائل ہے۔ لیکن بخش اس ناسازگار ماحول میں رہ کر آرائش گلستاں کی بات کرتے ہیں۔ وہ اپنی غزل سے تزئینِ گلدستے نہیں بناتے۔ وہ عوام کے شاعر ہیں اور انہی کے غزل خواں ہیں کہ جن کو رنگ، نکہت کے سراب نے ان کے حق کی طراوت اور شادابی سے محروم کر رکھا ہے۔ پاکستانی سیاست میں جاگیرداروں۔ وڈیروں اور سوداگروں نے فرعونیت کی رداوڑھ کر ہر عوامی تحریک کو پائے کوب کیا ہے۔ وہاں عوام کی بات کرنے والے قرونِ وسطیٰ کی شکنجہ گاہوں میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ بخش نے پاکستان کے ان حالات کو اپنے دھڑکتے دل کی صدا بنالیا ہے۔ موجودہ حالات پر کتنے بلیغ انداز میں روشنی ڈالتے ہیں ۔

اس حسنِ انتخاب میں کس کو کلام ہے
جو زیرِ احتساب تھا، بالائے بام ہے
جس اسپِ اقتدار پہ ہم تم سوار ہیں
اپنے عدو کے ہاتھ میں اس کی لگام ہے
کچھ لوگ سارے شہر کی گھڑیاں خرید کر
فرمارہے ہیں وقت اب ان کا غلام ہے

بخش کی ندائے شاعری عصری موضوعات سے ہم آہنگ ہے اور اس میں تیسری دنیا کے عوام کی زبانی آفاقی قدریں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نظم ہو یا غزل ان کے یہاں انسانی نفسیات کا گہرا شعور نہایت سلیقے سے رچا بسا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ شہر لندن کی حالتِ زار کو فقط چار مصرعوں میں نہایت خوش سلیقگی سے نظم کر کے سمندر کو کوزے میں سمانے کے مترادف عمل کا ملکہ ظاہر کرتے ہیں ۔

اک مسلسل خوفِ محرومی ہے اور اس کے سوا
بخش لندن میں مرا دردآشنا کوئی نہیں
اس شہرِ بدنصیب میں رہنے سے فائدہ
جس میں کسی سے رشتۂ ہمسائیگی نہیں

بخش نے رباعیات اور قطعات بھی بڑی آن سے کہے ہیں۔ ان کا ایک قطعہ ہے ۔

کسی دہلیز پہ قاتل کھڑا ہے
کسی دیوار میں خنجر گڑا ہے
ہمارا شہر تو چھوٹا ہے لیکن
ہمارے شہر کا مقتل بڑا ہے

ہر برگِ زرد کو بھی دل سے لگا کے پوچھ
شاید چمن کی داستاں تجھ کو سنا ہی دے
جس کی ہر ایک خشت میں لاکھوں شگاف ہیں
بہتر ہے اس مکان کو اب تو گرا ہی دے

کس کے دامانِ محبت میں پناہیں ڈھونڈیئے
اپنے سائے پر بھی قاتل کا گماں ہے دوستو
ہم جہاں گردوں کے اب تک گھر سلامت ہیں اگر
شہر میں پھر کس لئے اتنا دھواں ہے دوستو

بخش کی شاعری میں ایک ایسا ترنم پنہاں ہے جو محنت کشوں اور آزادگان کا ترانہ معلوم دیتا ہے۔ اور جو تسلسل اور ایک مزاج ہے وہ شاعر کے عمیق مطالعہ اور مشاہدے کی سند پیش کرتا ہے۔

وطن بھی ایک تمدن بھی ایک رنگ بھی ایک
وہ اس ادا سے ملا ہے کہ جانتا ہی نہیں
ہر شخص یہاں مصلحت کا بندہ ہے
رو حیات میں کوئی کسی کے ساتھ نہیں

منافقانہ چلن میں وہ اتنے مخلص ہیں
بجز ریا کہیں ان کے تعلقات نہیں

غزل ہو یا نظم اپنی شاعری میں تمام مقتضیاتِ عصر کو بخش نے مجسم کر دیا ہے۔ ان کے بعض موضوعات ایکدم نئے اور چونکا دینے والے ہوتے ہیں اور قاری کو یہ شناخت کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ کلام بخش لائلپوری کا ہے۔ بخش کو اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں انسانی نفسیات کا بہت گہرا شعور ہے، پھر جس طرح اس کو وہ پیش کرتے ہیں، وہ انہی کا حصہ ہے۔ اسی حصے کو اسلوب کہتے ہیں۔

بخش کے اشعار میں حقیقت اور واقفیت ہے خلوص اور صداقت ہے۔ سادگی اور صفائی ہے، رمزیت اور ایمائیت ہے۔ ربط اور توازن ہے۔ نغمگی اور غنائیت ہے۔ جدال اور جہاد ہے۔ مبارزہ اور مجاہدہ ہے۔ اعتماد اور تزکیۂ نفس ہے۔ انسانیت اور شرافت ہے۔ غرض وہ سب کچھ ہے جو اس عہد کے ایک حساس دل شاعر میں ہونا چاہیئے۔ پاکستان شاعر کا اصل وطن ہے اور دنیا بھر کے مضعف عوام ان کی شاعری کا محور ہیں۔ وہ یورپ میں بیٹھ کر ان بستیوں کی سیر کرتے ہیں جہاں انسانوں پر ابولہبوں کی حکمرانی ہے۔ میر کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے

کیا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے
چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

سخن کا اک نیا انداز

مسعود منور۔ ناروے

(بخش لائلپوری کے شعری مجموعے
''ابھی موسم نہیں بدلا'' پر ایک جانبدارانہ محاکمہ)

بخش لائلپوری کو میں ہمیشہ لیلپوری پڑھتا ہوں کیونکہ لیل کا آہنگ مجھے لیلے اور لیلۃالقدر کے تلازموں کی موسیقیت سے سرشار کر دیتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے لائل اور لیل کے مابین نسبت معنوی موجود ہے۔ لائل پور اُس زمانے میں آباد ہوا جب پورے برّصغیر پر غلامی کی رات کا آسیب طاری تھا۔ یہ پورا خطہ سفید فاموں کے زیرِ نگیں غلامی کی نیند سو رہا تھا۔ لیکن بعد کا سانحہ بھی کسی ستم ظریفی سے کم نہیں کہ لائل پور تو غلامی سے آزاد ہو گیا مگر آزادی کے پروانے ترکِ وطن کر کے برطانیہ آبسے کہ تاریخ کے المیے کو ایک خوبصورت موڑ دینا مقصود تھا۔ بخش کی شاعری اسی خوبصورت موڑ کی شاعری ہے اور میں اس سے جی بھر کر لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اب اُن کا چوتھا مجموعۂ کلام میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ میں اس کتاب کو اُن کی پچھلی تینوں کتابوں لہو کا خراج، زندان شہر اور بادِ شمال کے تناظر میں پڑھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ نیا مجموعۂ کلام ''ابھی موسم نہیں بدلا'' کوئی علیحدہ تخلیقی اکائی نہیں بلکہ پچھلے مجموعوں کا ایک مانوس تسلسل ہے۔ لیکن اس مجموعے کی اپنی ایک انفرادیت ہے اور وہ یہ کہ اس میں بخش کا شعری تفلسف بہت توانا، پہلے سے قوی اور سخن کے باطنی سنگیت میں بڑی شدت سے رچ کر نکھرا اور نشر ہوا ہے۔ خود بخش نے اس مجموعہء کلام کو پیش کرتے ہوئے دو تین بڑے بڑے دعوے کئے ہیں اور بقول آسکر وائلڈ اپنی سیلزمین شپ کرنے کا تکلف کیا ہے۔ دعویٰ مذہبی پیغمبری کا ہو یا سخن کی پیمبری کا، دونوں صورتوں میں زیبا یہی ہے کہ مدعی کے یہاں اس کے دعوے کا جواز تلاش کیا جائے اور ان عوامل کی فہرست مرتب کی جائے جو اس دعوے کا ممکنہ سبب بنے یا جن کی بنیاد پر اس قسم کا دعویٰ معرضِ امکان میں آیا۔

پہلا دعویٰ یہ ہے کہ شاعر نے کوئی نیا اندازِ سخن ایجاد کر لیا ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب کی پہلی نظم ''آواز'' ذیل کے شعر سے آغاز ہوتی ہے:

پرانے لفظ تفہیم معانی سے ہوئے عاجز
سخن کو اک نیا انداز دے کر دیکھ لیتے ہیں

نظم پڑھتے ہوئے قاری جب اس شعر کو پڑھتا ہے کہ:

کوئی شاید خدا کے روپ میں انسان مل جائے
حرج کیا ہے چلو آواز دے کر دیکھ لیتے ہیں

تو کہیں پاس ہی سے ایک سرگوشی سنائی دیتی ہے۔ کوئی بڑے تیقن اور تجربے سے کہہ رہا ہے:

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

ممکن ہے یہ میرا توارد قراءت ہو کہ ایک مانوس آواز دوسری آواز میں مل کر خلط اصوات کا باعث بن گئی ہو۔ میں اس اندیشے کو مان لیتا ہوں اور انداز نو کے دعوے کے اساسی اسباب کا جائزہ لیتا ہوں۔ پرانے لفظ؟ مگر لفظ تو خدا کی طرح قدیم ہیں اور خدا بھی ایک لفظ ہے اور جدت و بدعت بھی لفظوں ہی کے پچھو کڑ ہیں۔

میری تفہیم کے مطابق شاعر کہنا یہ چاہ رہا ہے کہ تخلیق شعر کے لئے نئی شعری زبان کی ضرورت ہے۔ ایک قرار واقعی شعری زبان جو ابھی دریافت ہو کر رائج نہیں ہوئی۔ آج جس زبان میں شعر کہے جا رہے ہیں وہ زبان شعری آہنگ کے برائے نام اثاثے کی وارث بھی نہیں ہے۔ چنانچہ ایسی غیر شعری زبان میں شعر کہا ہی نہیں جاسکتا۔ آج جس قدر الفاظ شعری انڈسٹری میں استعمال ہو رہے ہیں وہ بے حد دھندلے، مدھم اور غیر یقینی ہیں جبکہ اُن کو پہنائے جانے والے معانی غایت درجہ بے رحم، بے ہنگم، عدم تطابق کے حامل اور غیر موزوں ہیں۔ اور یہ لفظ و معنی کا وہ المیہ ہے جس کی ذیل میں شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔

اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج کا شاعر جو زبان استعمال کر رہا ہے وہ ایک ناتمام اور خام زبان ہے۔ چنانچہ خام اور ناتمام زبان کی مٹی سے کوئی تخلیقی صنم تراشنا یقینی طور پر ایک کڑی ریاضت ہے۔ پھر یہ طے کرنا اور بھی مشکل ہے کہ جو لفظ جن معنوں میں پرویا جا رہا ہے آیا وہ ان کا متحمل بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔

چنانچہ بخش کے محولہ بالا شعر کو پڑھ کر مجھے قطعاً کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ بخش وہ شاعر ہے جو ایک سطح پر مروجہ شعری زبان کی ناپائیداری اور عدم استحکام سے پوری طرح آگاہ ہے اور اس کی یہ آگاہی ایک نیک فال ہے۔

بخش نے جو دوسرا دعویٰ پیش کیا وہ خاصا پریشان کن ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو:

تو بہ تو تخیل ہے، دل پذیر مصرعے ہیں
بخش شعر گوئی کا آخری پیمبر ہے

بخش کا دعویٰ ہے کہ ان کے ہاں تو بہ تو تخیل ہے۔ اس بیان سے مجھے سقراط یاد آ رہے ہیں جنھوں نے اپنے آخری ایام میں ایتھنز کے زنداں میں ایک آدھ مناجات موزوں کی تھی۔ انھوں نے شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا"

A poet, if he is to be worthy of the name, ought to work on imaginative themes and not descriptive ones

بخش جب تو یہ تخیل کی بات کرتے ہیں تو وہ دراصل اپنے ہاں انہی imaginative themes کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں لیکن اس دعوے کا کیا کیا جائے جس میں وہ خاتم الشعراء ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ اب یہ کوئی آسان کام تو ہے نہیں کہ اُن کے دعوے کا ثبوت تلاش کر کے مرتب کیا جائے۔ چنانچہ بہتر یہی ہوگا کہ اس دعوے کو مجذوب کی بڑ قرار دے کر داخل دفتر کیا جائے کہ

خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

اب بخش کا تیسرا دعویٰ دیکھیے جو ایک طرح سے دوسرے دعوے کا تکملہ ہے۔ بخش کہتے ہیں:

عہد رفتہ کے حق صحیفوں سے
بخش تیری کتاب کیا کم ہے

اس شعر میں بخش نے ایک طرف تو حق صحیفوں کی عظمت کو تسلیم کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ترقی پسندوں کے ہاں بھی مذاہب کے لئے نرم گوشہ موجود ہے اور وہ اس کی سچائی اور الوہیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس بات کی ایک دوسری توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بخش کا یہ نقطہ نظر شاید گورباچوف کے گلاسنوسٹ کی ادبی تشکیل ہے۔

دوسری طرف بخش نے اپنی کتاب کو رضاکارانہ طور پر مذہبی صحیفوں کے ساتھ تقابلی جائزے کے لئے پیش کیا ہے اور پھر یہ فیصلہ بھی خود ہی دے دیا ہے کہ یہ کتاب تخلیقی سطح پر اُن کے ہم پلہ اور برابر ہے۔ اس طرح کے فیصلوں کے بعد کتاب پر تنقید یا تبصرے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

بایں ہمہ میرا ارادہ ہے کہ بخش کی کتاب میں اتر کر اس کی شعری کائنات کی سیر تو کی جائے مگر اس کے کسی بیان یا دعوے سے متاثر نہ ہوا جائے کیونکہ دعاوی سے قطع نظر بخش اپنی ذات میں ایک کہنہ مشق، ہنرور، یاقوت تراش اور صنم گر شاعر ہے جو ان تمام کوالیفکیشنز کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کی از کار رفتہ روایت سے بھی پوری طرح منسلک ہے۔ بخش نے اپنی شعری اقلیم میں لب و لہجے کا اعتبار قائم کر رکھا ہے اور اسے اب اپنے شعری اسلوب کا تعارف نہیں کرانا پڑتا۔ میں نے اس زیر مطالعہ کتاب کو بخش سے پرانی آشنائی کے حوالے سے پڑھا اور اس مطالعے کے نتیجے میں مجھ پر افشا ہوا کہ اس نئی کتاب میں کلیدی لفظ گھر ہے۔ وہ اس ایک لفظ کا اتنی بار اعادہ کرتے ہیں اور اتنے رنگوں میں اسے باندھتے ہیں کہ توجہ کا سارا ہدف بھی ایک لفظ بن جاتا ہے:

جنگ و جدل کے کارزبوں میں
اہل جہاں کو امن کا گھر دے

دردِ ہجرت کے ستائے ہوئے لوگوں کو کہیں
سایۂ در بھی نظر آئے تو گھر لگتا ہے

عہد غفلت میں چراغ آگہی روشن کیے
مجھ سا جگنو بے خبر لوگوں کے گھر بھیجا گیا

دشت غربت کی بلاؤں سے بھی ڈر لگتا ہے
گھر کی بے رحم فضاؤں سے بھی ڈر لگتا ہے

دیوار و در بھی اب اسے پہچانتے نہیں
اپنے ہی گھر میں اجنبی گھر کا مکیں لگا

تشنگیٔ لب پہ ہم عکس آب لکھیں گے
جن کا گھر نہیں کوئی گھر کے خواب لکھیں گے

حرز جاں سمجھتے ہیں ہم وطن کی مٹی کو
اپنے گھر کے خاروں کو ہم گلاب لکھیں گے

اس غزل کے پرتو میں بے گھروں کی باتیں ہیں
بے گھروں کے نام اس کا انتساب لکھیں گے

دیمک نے گھر کو چاٹ کے وہ حال کر دیا
در کو سنبھالا ہم نے تو دیوار گر پڑی

ساری دنیا جانے ہے نقشہ گھر کے باہر کا
آنکھوں کا پس منظر روزنوں نے دیکھا ہے

اندھے پن میں جسے تو آگ لگا بیٹھا ہے
عین ممکن ہے کہ وہ گھر تیرا ہی گھر نکلے

وہ گھر ہے رہگذر ہر راہ زن کی
کہ جس کی چار دیواری نہیں ہے

اہل ہوس کے گھر کا سایا
ہر اک گھر سے اونچا نکلا

ہوس کے راج میں ہر سلطنت برباد ہوتی ہے
جہاں آسیب بستے ہوں وہ گھر باقی نہیں رہتے

بے خبری کے سارے فسانے
اہل خبر کے گھر سے نکلے
بخش کو بے گھر کرنے والے
تو بھی اپنے گھر سے نکلے

زمیں پر سایۂ قد آوراں بھی ظلم ہوتا ہے
ہمارے گھر سے جو اونچے ہیں گھر اچھے نہیں لگتے

میں ان کی شکل زیبا دیکھتا ہوں
وہ میرے گھر کا نقشہ دیکھتے ہیں

جس گھر کی آرائش تھے ہم
اس گھر سے بیدخل ہوئے ہیں

متصوفین کے ہاں گھر روایتی طور پر اس کائنات کا اسم تانیث ہے جو دودھ پلانے والے پستانوں، دیوار یا ایک چار دیواری میں گھرے باغ کے سلسلے کی علامت ہے۔ اس علامت کا ایک دوسرا مفہوم عقل کل کی کارگاہ ہے جو روایت کی ایک صورت ہے۔ تحلیل نفسی کے علماء کے مطابق گھر کا خواب سائیکی کی مختلف پرتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ گھر کا بیرونی نقشہ خود خواب دیکھنے والے کا سراپا ہے، اس کی شخصیت ہے، اس کا ماسک ہے۔ اس حوالے سے ''ابھی موسم نہیں بدلا'' کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ بخش کی شاعری میں گھر خود اس کی اپنی ذات ہے۔ اور یہ ذات ایک آشوب میں مبتلا ہے۔ تخلیق کار کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا ایک مرکز تخلیق کرے۔ یہ مرکز کبھی ایک خواب ہوتا ہے، کبھی ایک ویژن ہوتا ہے اور کبھی ایک سراب۔ کوہلر اور کوفکا نے اپنی گیسٹالٹ تھیوری میں، حقائق اور اظہار کی نشاندہی کرتے ہوئے طبیعات اور مابعد الطبیعات کے مابین ایک متوازی خط کھینچنے کی کوشش کی تھی اور ''تابولا سمارگدینا'' کے قدیم اصول کی ایک نئی اور تازہ توجیہہ پیش کی تھی کہ جو اوپر ہے وہی نیچے ہے۔ چنانچہ جب میں بخش کے ہاں گھر کی اتنی تکرار دیکھتا ہوں اور پھر اس تکرار سے منسلک نو بہ نو تلازمے پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بخش کا پورا شعری اظہار خود اس کی اپنی ذات سے وابستہ ہے اور وہ ترقی پسندی کے پنجرے میں بند ایک معصوم کبوتر ہے جس کی نظریاتی وابستگی محض ایک تحریری مشغلہ ہے۔ بالکل اسی قسم کا مشغلہ جو کتاب میں اس طرح حنوط ہو جاتا ہے جس طرح بوتل میں کوئی ممنوعہ مشروب جسے صرف اس کا مالک یا قیمت ادا کرنے والا ہی پی سکتا ہے اور پھر اس نشے سے خود ہی سرشار ہوتا ہے کسی دوسرے کو اس کے ذائقے یا مہک کی خبر تک نہیں ہوتی۔

گھر کا امیج بخش کے یہاں اس کے اپنے شعوری سفر کی داستان ہے جس کے جیڈ کی طرح ہزار شیڈ ہیں۔ زندگی کی جدوجہد میں گھر بخش کا محور ہے اور یہ گھر دو کمروں کا گھر ہی نہیں بلکہ اس کی اپنی ذات، حیات اور کائنات بھی ہے۔ آپس کے رشتہ و پیوند ہیں۔ سماجی روابط ہیں اور اپنی ذات کے اندر سند سماجی دو پائے کو سدھانے کا جادوئی اسم ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ گلوبل گاؤں کا ایک واشگاف استعارہ ہے۔

بخش کے شعور کی نچلی تہوں میں جسے فرائیڈ یے لاشعور کا نام دیتے ہیں، جن مسائل نے آشیانہ بنا رکھا ہے، گھر ان کا کنایہ ہے۔ ان مسائل میں جنگیں، ترک وطن، پاکستان کی غالب اکثریت کو لاحق جہالت اور بے علمی کا سرطان، مفلسی اور ناداری، سماجی ابتلاء، ذات کا آشوب، سیاسی راہزنوں کی شب و روز کھلے عام اور علی الاعلان ڈاکہ زنی کے آپریشن، قتل و غارتگری اور سماجی بے انصافیاں سرفہرست ہیں۔ اگر ان سارے مسائل پر کہے گیے اشعار کو یکجا کیا جائے تو بخش کی

شاعری کو شہر آشوب کا نام دیا جا سکتا ہے۔

بخش کا کمال ہنر یہ ہے کہ وہ ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھتا ہے اور ہر رنگ سو خوشبوؤں کا ارژنگ نظر آتا ہے۔ چنانچہ گھر کے حوالے سے کہے گئے سارے اشعار ایک ایسی سبد گل ہیں جو مسائل کا عالمی منظر نامہ مرتب کرتی نظر آتی ہے۔ بخش ترقی پسندی کا دعویدار ہے۔ وہ برطانیہ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا صدر بھی ہے۔ اب ترقی پسندی آؤٹ آف فیشن ہے۔ میں نے ترقی پسندوں کے خود ساختہ اماموں سے یہ بات پوچھنا بھی چاہی کہ موجودہ عالمی سیاسی سماجی ادبی تناظر میں ترقی پسندی کی تعریف کیا ہو گی تو انہوں نے کافی و شافی جواب دینے کے بجائے الٹا مجھے یہ کام سونپنے کا فیصلہ صادر فرمایا کہ اب یہ آپ جیسے نوجوانوں کا کام ہے کہ اس سلسلے میں پیش رفت کریں اور ترقی پسندی کی نئی جہت متعین کرنے کی کوشش کریں۔ میں نے اس وقت اپنے کھچڑی بالوں کو سہلاتے ہوئے خود کو نوجوان قرار دیئے جانے پر داد دی اور اپنا سوال واپس لے لیا۔

چنانچہ میں نے بخش کی کتاب ترقی پسندی کے حوالے سے نہیں بلکہ ایک شعری مجموعہ سمجھ کر پڑھی ہے۔ یہ مجموعہ میرے لسانی ذوق کے برعکس ایک دوسری ڈائمینشن پر ہونے کے باوجود موجودہ سیاسی و سماجی ابتلا کے دور میں ایک حق کے آوازے کی طرح بلند ہوا ہے۔ اس کی فکری قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو عصری مسائل پر نظر رکھتے ہیں اور ایک تبدیلی کا اسم تلاش کر رہے ہیں مگر شاید اس تبدیلی کے آثار کہیں نظر نہیں آتے کہ

گونگے بہرے عقل کے اندھے
اہل سیاست کے پروردہ
پاگل اور آوارہ کتے
معذوروں اور معصوموں کا
گلی گلی میں رستہ روکے
انسانیت کے دامن کو
نوچ رہے ہیں، پھاڑ رہے ہیں
اور تم حیراں دیکھ رہے ہو

اور پھر اس کے بعد میں نے کسی ترقی پسند سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں کی کہ آخر اس کے لفظیاتی اور تلازمی اثاثے میں فقیہہ شہر، مقتل، دار، جلاد، سر، اور خون و خنجر کی بوسیدہ تصویریں کیوں ہیں۔ جب کبھی بخش جیسا قلمکار ان کلیشوں کو توڑ کر آگے نکلتا اور "فائلوں میں لکھا ہے" جیسی کوئی غیر روایتی ترکیب وضع کرتا ہے تو ایک تازہ ہوا کا جھونکا لسانی دیاروں کے نواح میں چہل قدمی کر کے گزرتا دکھائی دیتا ہے۔

"ابھی موسم نہیں بدلا"

نعیمہ ضیاء الدین۔ جرمنی

"ابھی موسم نہیں بدلا" جناب بخش لائلپوری کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے قبل ان کے تین مجموعے، لہو کا خراج، زندانِ شہر اور بادِ شمال منظر عام پر آچکے ہیں۔ بخش صاحب منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ ذاتی طور پر اور شعر گوئی کے لحاظ سے ان کی یہ انفرادیت بخوبی نمایاں ہے۔ بندھے ٹکے مضامین کو اشعار میں بار بار بیان کرنا اور اس پر "نئے تجربے" کا لیبل لگانے پر مصر رہنا، شعراء کی عام روایت ہے۔ خال خال یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ پرانے مضامین کو ندرتِ خیال کی جگہ ندرتِ بیاں کے حسن سے بہرہ ور کر کے اس خوبیٔ بیان پر نازاں ہونے کا تیوہ اختیار کیا جانے لگا۔

لیکن بخش لائلپوری کے ہاں ذاتی تجربے اور تفکر کو ایک یکسر نئی جہت عطا ہوئی۔ ان کے اس تجربے میں آفاقیت اور انسان کے اجتماعی کرب سے یکجا ہو کر معنی آفرینی کے ہمہ گیر اُفق کی طرزِ نو سے نقاب کشائی کی۔ بخش صاحب کی رسائی فکر، کربِ انسانی کے جن گوشوں تک سفر کرتی ہے اور ان کا ویژن جس گہرائی کو چھوا کرتا ہے، وہ بلاغت کا ایک عمدہ فن پارہ بھی ہے اور شاعر کے حساس وجدان کا اعلیٰ ترین مظہر بھی، بلند ترین اوصافِ انسانی میں جو صفت بخش لائلپوری کو قدرت کی جانب سے ودیعت کی گئی ہے، وہ صفت حق گوئی ہے۔ اسی حق گوئی اور بیباکی کے برملا اظہار کا دوسرا نام بخش لائلپوری کی شاعری ہے۔ یہی خاصیت ان کی شخصیت کو بھی بطور انسان ایک نڈر اور راست باز روپ عطا کرتی ہے۔ انسانی آنکھ کے آئینے پر تجربات کے بے شمار عکس، سفرِ حیات کے مختلف زاویے منعکس کرتے، تصاویر بناتے اور مٹاتے چلے جاتے ہیں۔ گویا کہ تجربات کی بھٹی میں ذہنی تخیل و فکر کئی اقسام کے سانچوں میں ڈھلنے اور اشکال بدلنے کا عمل اختیار کرتے رہتے ہیں۔ بارہا ان کی زد میں آنے والے مقاصد اور نظریات اپنی صورت تبدیل کرتے ہوئے بھی دیکھے گئے۔ لیکن بخش صاحب کے ہاں جب ایک عالمگیر جذبے نے جنم لیا اور ان کی سوچ کا رشتہ اجتماعی کربِ انسانی سے بندھا تو پھر ایک مظبوط سلسلہ قائم ہو گیا جس کے تحت ان کے درد کا سفر عمر بھر اسی دشت کی صحرا نوردی میں جاری رہا۔

اقبال کے ویژن کو "ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات" میں جس گہرائی کے ساتھ بخش لائلپوری نے جھانکا اور اس فکر کے پرچم کو تھام لیا اس کی مثال کسی اور روایت میں ملنا محال ہے۔ خودی اور خودداری کی یہ واضح صفت ان کی حق گوئی کی طاقت کو

کہیں پر بھی نحیف نہیں ہونے دیتی کہ جس کے سبب ان کی صاف گوئی پر ذرہ برابر بھی حرف آسکے۔ بطور انسان وہ جیسے بھی ہیں، ڈنکے کی چوٹ پر اس کا اعلان کرتے ہیں۔ اپنی خامیوں اور عادت کو لپیٹ کر بیان نہیں کرتے۔

یقیناً انہیں شوگر کوٹیڈ گولیوں سے بھی نفرت ہوگی کہ جیسی اس نوع کی بیان بازی سے ہے۔ گفتگو میں جاذبیت کا عجیب رچاؤ اور مزاح کی چاشنی میں طنز کی ہلکی سی تلخ کاٹ کی ترشی اسے مزید پر لطف اور ذائقے دار بناڈالتی ہے۔ یہ ہیں بخش لائلپوری جن کی شاعری کے سفر کو ربع صدی سے بڑھ کر عرصہ ہونے کو آیا۔ میری اس ذاتی رائے سے اختلاف کسی کو بھی ہو سکتا ہے لیکن اتنا ہی حق مجھے بھی اس رائے کے اظہار کا حاصل ہے جتنا کہ کسی دوسرے فرد کو اختلاف کا۔ ایک زمانے تک شاعری بالخصوص غزل گوئی فقط گل و بلبل اور عشق و محبت کے خیالات و جذبات کو قرطاس پر منتقل کرنے کا ہی دوسرا نام سمجھی جاتی رہی۔ اس سے الگ ہٹ کر اور اپنی ذات سے بالاتر ہو کر سوچنا۔ کائناتی دائرے میں تحریک کا سفر اور نشیب و فراز کے انتشار، زبوں حالی تضادات زمانہ کے سبب انسان کی پامالی اور طبقاتی استحصال کے درد کو محسوس کرنا اسے اپنی ذات سے بڑھ کر احساس کی گہرائی میں اتار لینا۔ یہ شاعری کی یا کم از کم غزل گوئی کی سابقہ روایت نہیں رہی۔

بخش صاحب نے غزل کو بھی یہ ایک نئی جہت اور جدت عطا کی ہے۔ بلند خیالات کی اور بلند تر انسانی جذبات کی غزل میں ترجمانی کا سہرا بلاشبہ بخش صاحب کے سر بندھتا ہے۔ ان کے ہاں غزل کے تمام مضامین اسی سوچ فکر کے بیان کا مظہر ہیں جو ان کی ممتاز اور منفرد شخصیت کو حاصل ہے۔

شاعر ایسے جذبوں کو الفاظ کی سنہری جھالریں لگا کر ایک مرصع اور دلنشیں پیرایہ تو عطا کر ہی دیتا ہے جو اس کے جذبات میں مخالف جنس کی جانب سے کسی ہلچل یا بیداری کا سبب بنتے ہیں۔ محبوب کے ہجر و وصال سے لبریز مضامین اردو شاعری کا صد فیصد حصہ بنے اور بنتے چلے آرہے ہیں۔ یہ ایک محدود اور مختصر کینوس ہے جو شاعری کے جراثیم نمودار ہوتے ہی شاعر کے ہاں سے نمو پذیر ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس مخصوص سطح کی محض اپنی ذات سے منسوب شاعری سے ممتاز ہو کر افقی بلندی کے لئے "میں" کے حصار میں سے باہر نکل آنا ہنر مندی یا وجدان سے بڑھ کر ظرف کی رفعت و عظمت کی دلیل ہے۔ انسانیت کے درد کو محسوس کرنے کے لئے اپنی ذاتی خوشی یا اندوہ کو الگ ہٹا کر رکھنا پڑتا ہے۔ جذبات کا یہ ایسا سمندر ہے جس کے ہر قطرے میں شاعر کو دجلہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ اکائی میں کُل اور کُل میں اکائی ہو جانے والی کیفیت ہے۔

خیالات کو صداقت پر مبنی فقط اسی صورت میں بنایا جاسکتا ہے جبکہ وہ واردات قلبی کی شکل اختیار کر جائیں۔ تاثیر محض اس جذبے کے اظہار میں پیدا ہو سکتی ہے جو دلی جذبات کا عکس لے کر آئینۂ الفاظ پر ظاہر ہو۔ صرف الفاظ کو موزوں کر لینے سے شاعری جنم

نہیں لے سکتی۔ اس کی مثال اس تصویر کی سی ہوگی جو بے روح اور بے کشش ہو۔ شاعری تو ان تمام ارفع، پُر فضیلت، اچھوتے اور دل کو چھو لینے والے عام انداز و سطح سے بلند کلام کا نام ہے جو شاعر اپنی حساس اور دانا بصیرت سے ماحول و اطراف کی جنبشوں میں محسوس کرتا اور اپنی طبیعت کی مناسبت سے انہیں شعر کا پیراہن عطا کر دیتا ہے۔

محدود معانی کو لامحدود رنگ و روپ بخشنے اور ایک بالکل نئی معنوی دنیا آباد کرنے کو ہی عمدہ شاعری کہا جاسکتا ہے۔ ایسے شاعر کے ہاں اسلوب کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ لفظ کو اس خام مال کی طرح استعمال کر سکتا ہے کہ جسے بھٹی میں تیار کر کے اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ الفاظ و تراکیب اور معانی اس کے ہاں ظروف سازی کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ صنائی اس کی تخلی کیفیات کو بیش بہا جہتیں اور پہلو فراہم کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ کس لفظ کا استعمال کس نوع اور کس ساخت سے کرے۔ یہ اس کے کرشمہ ساز تصوراتی عرفان کا اختیار ہے۔ اس کی باکمال صلاحیت اس لفظ کو لغت کے دائرے سے نکال کر نیا آہنگ، نیا مرتبہ، نیا مقام عطا کر جاتی ہے۔

رت نہ بدلے تو بھی افسردہ شجر لگتا ہے
اور موسم کے تغیر سے بھی ڈر لگتا ہے

دشتِ وقت میں ایک عمر سے

صحرا نوردی کرنے والے مسافر کو موسموں کی تبدیلی کا بے حد انتظار بھی رہتا ہے اور اس امید پر روز و شب بھی بسر ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ کانٹا جو اندیشوں اور واہموں کی چبھن احساس میں پیہم بیدار رکھے ہوئے ہے اس کی تشویش اس لحاظ سے بھی سوا ہے کہ بیتے دنوں میں رتوں کی تبدیلی کسی طور بھی تغیر پذیری کا نیا رنگ پیش کرنے سے قاصر رہی ہے۔ اس بناء پر امید پروری بھی خار بکف رہتی ہے۔

لفظ تو لفظ ہیں کاغذ سے بھی خوشبو پھوٹے
صفحۂ وقت پہ وہ پھول کھلائے رکھنا

ایسی تعمیراتی تعبیر کی جانب نفیس اشارہ ہے جو کردار کی عظمتوں سے تاریخ میں امر ہونے کے لئے کسی جد و جہد کا ثمر قرار پاتا ہے۔ خود بخش صاحب کو اپنے کلام کی خوبی اور قیام کا واضح طور سے علم ہے۔ انہیں احساس ہے کہ الفاظ کے آتے جاتے قافلوں میں ان کے نفس مضمون کا پرتو وقت کی شاہراہ پر یقیناً سنگ میل کی مانند نصب ہونے کے لئے وجود میں آیا ہے۔

مرا آئینہ تصنیف دیتا ہے گواہی
مرا ہر نقطۂ تفسیر رہنے کے لئے ہے

رہے گا تو نہ تیرا ظلم، پر روز ابد تک
ہمارے درد کی جاگیر رہنے کے لئے ہے

کبھی کبھی معتبر حروف کی جنگ میں جب احترام کے نصیب میں تذلیل آمیز شکست لکھ دی جاتی ہے اور تیرگی روشنی پر تادیر غالب رہتی ہے تو حساس دل شکوہ کناں بھی ہونے لگتا ہے۔

خون سے ہم نے جو سینچے ان درختوں کا تمام
ہر شبستانِ ملامت میں ثمر بھیجا گیا
جو مل رہا ہے تمہیں غیر کی عنایت سے
یہی ہے سانس تو اس سانس کی ہے قیمت کیا
کھانے کو زہر، پینے کو خوں، پھانکنے کو دھول
کیا ساکنانِ شہر کی نشوونما لکھیں

''ابھی موسم نہیں بدلا'' یا دیگر مجموعہ ہائے کلام، سب میں ایک دشواری یہ ہے کہ بخش صاحب کا کہا ہر شعر قابل توجہ اور لائق بیان ہے۔ اس میں انتخاب کا مرحلہ نہیں آسکتا۔ یہ تو وہ سیلِ رواں ہے نگاہ جس میں از خود تیرنے لگتی ہے۔ اور روکے سے نہیں رک پاتی۔ بخش صاحب کے ہاں استحصالی اور کمزور طبقات پر روا رکھے جانے والے جبر و ستم کے آلام کا دکھ ہر شعر میں دہائی دیتا ملے گا۔ ان کے سخن کی مرکزیت اور محور ہی گویا ناانصافی اور ظلم کے خلاف ایک کھلا جہاد ہے۔ امن اور سکون کسی فرد، نظام، معاشرے یا علاقے کا برباد ہو، بخش صاحب کے قلم کو روانی کی وہ آتشِ غضب عطا کر دیتا ہے جہاں لفظوں کے پیرہن جلنے لگتے ہیں۔

کٹ رہی ہیں تن کی فصلیں، کارزارِ دہر میں
تیرتی ہیں جابجا لاشیں لہو کی نہر میں
اک فقط فرعون پر ہی قتل کا الزام کیوں
تم نے کتنے سر اڑائے ہیں ہمارے شہر میں

فن کار کو اپنے فن میں کمال اور قدرت دکھانے کے لئے اپنی ذات سے اور اظہار سے کامل انصاف اور سچائی کی جرأت دکھانا ہوگی۔ ورنہ شاعری یا فنکاری الفاظ و رنگ کی بازی گری ہوگی۔ شاہکار فن نہیں کہلا سکے گی۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے اور تو سب کچھ ہے بس سچائی نہیں ہے۔ مصلحت، مفاہمت، موقع پرستی، تحریصِ زر اور ہوا کا رخ پہچان کر بادبان اتارنے، باندھنے کے ناشائستہ رویوں کے سبب شاعری اور ادب کی روح بے حد متاثر ہوئی ہے۔ سچ لکھنے اور کہنے کا شعور دھندلاتا چلا گیا۔ نظام سے مرعوب ہو کر جینے کی رسم نے شاعری کی فطری لہر کو متاثر کر کے درباری بنا ڈالا۔ ایسے تابع فرمان ماحول میں اظہار کی سچائی کا علم بردار ہونا اور اپنی روش پر استقامت رکھنا وہ برتر فضیلت ہے جو قدرت سے ودیعت کردہ ہے جسے بھی حاصل ہو جائے وہ شخصیت افضل مرتبے کی حامل ہو جاتی ہے۔

خداوندِ دوعالم کی زمینیں
ہوس پیشہ کی جاگیریں نہیں ہیں
ستم سہنا سراسر اک ستم ہے
ستم کی اور تفسیریں نہیں ہیں

قدم قدم پر نظریئے اور وفاداریاں تبدیل کرنے والی اس ہر پل تغیر پذیر دنیا میں ایک آواز ایسی بھی ہے جو چٹان بن کر اپنی جگہ قائم ہے۔ ہوا کدھر سے چلی اور کدھر نکل گئی۔ وقت بدلتے پیمانوں میں کن پیران طریقت کے فرمان کا عرق بھر گیا۔ اس سے اسے کچھ غرض نہیں جس کا پیمانِ وفا کل بھی وہی تھا آج بھی وہی ہے۔

کوئی تتلی کماں داروں کے ڈر سے
فضاء میں پنکھ پھیلاتی نہیں ہے

میری نظر میں بخش صاحب کا رتبہ جس بناء پر ممتاز اور منفرد ہے وہ ان کی نظم گوئی ہے۔ میرے نزدیک نظم کو غزل پر ہمیشہ سے فوقیت حاصل رہی ہے۔ اپنے اس نظریئے کے حق میں مجھے اقبال سے لیکر حفیظ جالندھری اور ساحر لدھیانوی کے نام دہرانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ محض سرسری ساز ورد دینے پر یادداشت کے افق پر برق کی مانند کوند کر جو کلام سامنے آئے گا وہ ان کی نظمیں ہی ہونگی۔ یہی امتیازی صنف بخش صاحب کو بھی کمال و ہنرمندی سے متصف کئے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا جرأت مند اور صداقت کا علم بردار ہونا ہے جو مذکورہ صفت کو مزید منور کر دیتا ہے۔ عشق و محبت اور گل و بلبل کی داستانوں پر مبنی روایات کو اشعار میں ڈھالنے والے بیسیوں شعراء نظم گوئی کی اس سطح کو نہیں پہنچ سکتے جہاں تک محض چند شعراء کی سوچ نے سفر کیا۔

بخش صاحب کی فقط ایک نظم ''ملا، عورت اور گواہی'' دس دواوین پر بھاری ہے۔ تراکیب کے اعتبار سے ان کے ہاں کس نوع کی صناعی الفاظ کی بجنت کو کوزہ گری کی مماثلت کے رنگ سے آشنا کرتی ہے۔ اور کیسے کیسے بے مثال ظرف و حرف سامنے لاتی ہے۔

اے رام کے پجاریو زہر تعصبات
شیرینیٔ حیات میں یوں حل نہ کیجئے
لاشوں کے ڈھیر پر نیا مندر بنا کے آپ
انسانیت کی آنکھ کو جل تھل نہ کیجئے

اپنے اس مجموعۂ کلام کے نام سے کہی گئی نظم ''ابھی موسم نہیں بدلا'' میں بخش صاحب کی جولانیٔ طبع اپنے بام عروج پر ہے۔

''کہ جن کی گردنوں میں تمغۂ لعنت
لٹکتا ہے بدیسی حکمرانوں کی
اطاعت کا
کہ یہ تمغہ فقط جاگیردارانہ وراثت کا
عطیہ ہے جو نسلاً منتقل ہوتا رہا''

نظم ''دربار رسالت میں'' ایسا درد ہے جو ہر اس سینے میں جگہ حاصل کر لیتا ہے جسے مسلمانوں کے ہاں پیدا ہونے کا شرف حاصل ہو۔ لیکن اس کی نوعیت اور شدت بخش صاحب کے ہاں کس قدر مختلف ہے۔

ہر اک سیمیں بدن کا دامنِ عصمت
مری شہوت پرستی کے جہنم زار میں
شب بھر سلگتا ہے
میں ہر اک فاحشہ پر
دل کی گہرائی سے مرتا ہوں

یہ اندر کی حقیقت ہے۔ بظاہر پارلیش اور "کامل" انسان اکثر و بیشتر کچھ ایسے اشعار کی تصویر دکھائی دیتے ہیں۔

کبھی میں نعت لکھتا ہوں
کبھی میں حمد لکھتا ہوں
میرے پیارے رسول اللہ
میں گرگٹ کی طرح ہر آن
رنگ اپنا بدلتا ہوں
خدا شاہد مرے قلب و نظر میں
سینکڑوں شیطان پلتے ہیں

ایسے حق گو اور بے باک شاعر کا نام "بخش لائلپوری" ہے۔ جو اپنے قلم سے حیران کردینے والی شعبدہ گری کے ایسے ایسے کمال پیش کرسکتا ہے کہ دیکھنے والی بصارت اور سننے والی سماعت ششدر ہو کر رہ جائے۔ "ابھی موسم نہیں بدلا" انہی حقیقتوں کا مجموعہ ہے۔

××××××××××

ہمیں تو سوزنِ تدبیر سے گلہ ہی نہیں
ہمارا چاک گریباں کبھی سلا ہی نہیں

زکوٰۃِ رزق پہ قائم حیات ہے جس کی
اَنا کے کیف سے وہ شخص آشنا ہی نہیں

تمہارے شیش محل کی بِنا اُٹھی جب سے
کسی غریب کا پھر گھر کہیں بنا ہی نہیں

ہے تار تار گریباں نہ چاک چاک جگر
مرا جنوں تو ابھی محترم ہُوا ہی نہیں

ہمیں سے بزمِ جنوں میں چراغ روشن تھے
ہمارے بعد کوئی دار پر چڑھا ہی نہیں

ہمارے قتل میں شامل تھی مصلحت ورنہ
ہماری فردِ عمل میں کوئی خطا ہی نہیں

ہمیں تو ناز ہے اِس شانِ بے نیازی پر
ہمارا ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھا ہی نہیں

ہمارے باب میں کیا کیا لکھا مؤرخ نے
کسی کتاب کو ہم نے کبھی پڑھا ہی نہیں

اُنہیں گماں ہے کہ وہ پا چکے ہیں منزل کو
ہمیں یقیں ہے کہ پائے سفر اُٹھا ہی نہیں

فصیلِ شہر پہ رُودادِ شہر کندہ تھی
حدودِ شہر میں اے دوست میں گیا ہی نہیں

ابھی موسم نہیں بدلا—ایک تاثر

گوشن ادیب

بخش لائلپوری کا نام ترقی پسند اردو شاعری کا بے حد معتبر اور اہم نام ہے۔ وہ الگ بات کہ ترقی پسند تحریک کلی طور پر تو نہیں تاہم کسی حد تک زوال پذیر ضرور ہوئی ہے۔ اس زوال کا باعث سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تحریک کے سربراہوں نے اس ادبی تحریک کو ایک خصوصی اور سیاسی منشور کے تابع کر دیا اور بعد ازاں یہ انجمن ترقی پسند مصنفین بذات خود انجمن تحسین باہمی بن گئی۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے ادب کو صحت مند اور زندگی کی توانا قدروں سے بھی روشناس کرایا!

تقسیم ملک کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کا دائرہ کار چند مخصوص موضوعات تک محدود ہو کر رہ گیا جن کا تعلق محض خارجی سیاست سے تھا۔ انجمن کا دائرۂ اختیار بھی ان چند افراد کے ہاتھوں میں تھا جن کی ادبی جہت خالصتاً سیاسی اور انتہا پسندانہ تھی۔ چند گنے چنے مضامین خارجی موضوعات پر لکھتے لکھتے ادب یکسانیت کا شکار ہو گیا۔ جسے ان دنوں ادبی جمود کا نام دیا جانے لگا۔

جہاں تک میری ذاتی سوچ کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ موضوع خواہ سیاسی ہو یا ذاتی کہ اندرون ذات سے تعلق رکھتا ہو اولین شرط یہ ہے کہ کیا وہ فن پارہ ہے کہ کسی سیاسی جماعت کا پمفلٹ؟ میں ادب میں افادیت کا قائل ہوں۔ مجھے آج بھی فیض احمد فیض، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر کی بیشتر نظمیں بہت پسند ہیں جن میں ترقی پسند عنصر بھی غالب ہے لیکن فنی اعتبار سے ان میں ایک جمالیاتی احساس بھی ہے۔

ساحر لدھیانوی کی نظم ''خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا'' یا اس کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' امن عالم پر لکھی گئی وہ نظمیں ہیں جن میں افادیت بھی ہے اور وہ عصری تقاضوں کی غمازی بھی کرتی ہیں۔

فیض احمد فیض کی تو بے شمار نظمیں ایسی ہیں جو انہوں نے خارجی ماحول سے متاثر ہو کر لکھی تھیں۔ لیکن ان کی عظمت دائمی ہے۔ جس نے فیض کو اس صدی کا اہم اور بڑا شاعر قرار دیا۔

بات ادب میں آدرش کے ساتھ ساتھ فن کی چل رہی تھی۔ علی سردار جعفری کی بیشتر شاعری وقتی موضوعات سے متاثر ہو کر نعرہ بازی تک محدود ہو گئی تھی۔ وہ شاعری آج پڑھی بھی نہیں جاسکتی لیکن سردار جعفری نے عصری تقاضوں کے پیش نظر خارجی ماحول پر فنی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جو نظمیں کہی

تھیں۔ وہ آج بھی فن کی کسوٹی پر شاہکار محسوس ہوتی ہیں۔ مثلاً انکی نظم "کون دشمن ہے" ہندپاک جنگ کے موضوع پر ایک عظیم نظم ہے۔

ہمارے پاس ہے کیا دردِ مشترک کے سوا
مزہ تو تب تھا کے مل کر علاج جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیر گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم اور تمہارے درد میں ہم
شریک ہوتے تو پھر جشن آشیاں کرتے
ہمارے بیچ میں حائل ہیں آگ کے دریا
تمہارے اور ہمارے لہو کے ساگر میں
بہت بلند ہیں نفرتوں کی دیواریں
ہم ان کو ایک نظر میں گرا بھی سکتے ہیں
تمام ظلم کی باتیں بھلا بھی سکتے ہیں
تمہیں پھر اپنے گلے سے لگا بھی سکتے ہیں
مگر یہ شرط ہے تیغوں کو توڑنا ہوگا
لہو بھرا ہوا دامن نچوڑنا ہوگا
پھر اس کے بعد نہ تم غیر ہو نہ غیر ہیں ہم
تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اس کے بعد یہ پوچھیں گے کہ کون دشمن ہے؟

یا پھر اسی موضوع پر سردار جعفری کی ایک اور لازوال نظم ہے۔ غالباً اس کا عنوان "صبح فردا" تھا۔

اِسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اِسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد خون کی، اشکوں کی، آہوں کی، شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں
یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے جھلملاتے تھے
یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے بچھڑی تھی
یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا!

یہ وہ نظمیں ہیں جن کا لب و لہجہ ترقی پسندانہ بھی ہے فنکارانہ بھی۔
بخش لائلپوری کی شاعری سے متعلق بات کرنے سے پہلے میرے لئے تمہیداً ترقی پسند تحریک کا پس منظر بتانا اور کچھ مثالیں دینا اس لئے بھی ضروری ہو گیا ہے کیونکہ بعض صاحب نظر، اہل قلم ترقی پسند تحریک کو سرے سے ہی منحرف قرار دیتے ہیں۔ جب کہ بخش لائلپوری بقول نظیری

گُلے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

بخش لائلپوری کا شعری آغاز بھی اسی ماحول میں ہوا تھا۔ ان کو ادبی و سیاسی سرگرمیوں کے پیش نظر جلاوطنی بھی قبول کرنا پڑی۔ پاکستان چھوڑ کر لندن آئے برسوں گزر گئے ہیں۔ لیکن "لہو کا خراج" سے لے کر "ابھی موسم نہیں بدلا" تک وہ ذہنی طور پر سرزمین

پاکستان سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے فعال شاعر ہیں جن کے اب تک چار شعری مجموعے لہو کا خراج، زندانِ شہر، بادِ شمال اور تازہ ترین مجموعہ ابھی موسم نہیں بدلا منظر عام پر آچکے ہیں۔

میں نے ان تمام مجموعوں کا محض سرسری مطالعہ نہیں کیا بلکہ میں ان کے ہر شعر کے حرف حرف سے گزرا ہوں یعنی ان کے شعری سمندر میں جی بھر کر غواصی کی ہے۔ ان کی تمام تر شاعری شفاف موتیوں کی چمک لئے ہوئے ہے۔ میں ذاتی طور پر اشتراکی مزاج رکھتا ہوں۔ اس ظلم و جبر کے نظام میں آنکھیں بند کر کے فن کار اپنی فنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ بخش لائلپوری نے ہر ظلم اپنی ذات پر جھیلا ہے اور ہجرت کا سم قاتل پی لینے کے بعد حرف صداقت کو ایمان کا درجہ دیا ہے۔ لہٰذا ان کی تمام تر شاعری دبے کچلے عوام کے جذبات کی ترجمانی بھی کرتی ہے اور سائنٹفک سوچ لے کر ظلم و جبر، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے سامنے سینہ سپر بھی ہے۔

میں خود کو ان کی شاعری کا ناقد نہیں سمجھتا جو کہ چند بندھے ٹکے فارمولوں کی کسوٹی پر ادب و شعر کو پرکھتے ہیں۔ میں تو محض بخش کی شاعری کا ایک ایسا قاری ہوں جو کہ ابھی موسم نہیں بدلا کے ہر شعر میں اقبال کا معنوی تاثر محسوس کرتا ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

آپ ان کی کوئی بھی غزل پڑھئے۔ موضوع خواہ کتنا ہی سخت اور کھردرا کیوں نہ ہو لیکن ان کے ہر شعر میں تغزل، غنائیت کے علاوہ جمالیاتی احساس بھی ملے گا جو کہ یہ احساس دلائے گا کہ اس سے پہلے ایسا کلام نہیں پڑھا (کم از کم میرا ذاتی تجربہ یہی ہے)۔

"ابھی موسم نہیں بدلا" ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس نے بخش لائلپوری کی شخصیت کو آئینہ دار بنا دیا ہے۔ "ابھی موسم نہیں بدلا" کا انتساب شاعر کی سوچ کو واضح کر دیتا ہے۔

انتساب
روشن فکر اور زندہ ضمیر
ادیبوں کے نام

بخش لائلپوری بخوبی جانتے ہیں کہ

یہ کیسا قحطِ خلوصِ ادب ہے شہرِ ادب میں
قلم پرست ہیں عنقا، قلم فروش بڑے ہیں

قلم فروشوں نے آمرانہ حکومتوں سے مراعات حاصل کرنے کے لئے شاعری کو ذہنی عیاشی کا درجہ دے دیا اور سرکار دربار سے مراعات حاصل کرنے میں پیش پیش رہے۔ لیکن بقول مجروح سلطانپوری

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

حبیب جالب، تنویر سپرا سے لے کر

بخش لائلپوری تک حرف صداقت کے پرستار بہت ہیں جنہوں نے کسی بھی حکومت کی استحصال پسند پالیسیوں سے سمجھوتہ نہیں کیا کیونکہ ان کا ذہنی منشور طبقاتی جدوجہد کرتے ہوئے خزاں گزیدہ موسم کو بدلنا ہے۔ آج حبیب جالب، فیض، تنویر سپرا ابساط ادب پر نہیں ہیں لیکن وہ زندہ رہیں گے باشعور عوام کے دل میں۔ کیونکہ جب تک یہ سیاسی موسم نہیں بدلتا۔ عام آدمی غریب سے غریب تر ہوتا جائے گا۔ عوام کو فوجی نظام کا بھی تجربہ ہو چکا ہے اور جمہوریت کا بھی جسے بخش نے اپنی مختصر ترین نظم میں واضح کیا ہے

~ جمہوریت

سیاسی زناکاروں میں
گھری ہوئی بے بس
اور مجبور دوشیزہ

"ابھی موسم نہیں بدلا" کے شاعر بخش لائلپوری کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ ~

بخش سیکھا ہے شہیدان وفا سے ہم نے
ہاتھ کٹ جائیں، علم منہ سے اٹھائے رکھنا

بخش نے "لہو کا خراج" سے لے کر "ابھی موسم نہیں بدلا" تک ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ یہ تمام سفر 'آمد' کے تحت ہے آورد کے نہیں۔ ان کے اندر بے پناہ کرب آگہی ہے جو کہ شعر کی صورت ہمارے سامنے آیا ہے۔ انہوں نے شاعری کی ذمہ داری نبھائی لیکن کسی PR سے کام لے کر خود کو سربلند ظاہر نہیں کیا۔ وہ ان شعراء میں سے نہیں ہیں کہ دو چار غزلیں کہنے کے بعد شہرت کے زینے پر چڑھنے کے لئے جدوجہد کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ان متشاعروں کے برعکس بخش لائلپوری کو مکمل احساس ہے

میرے ہر لفظ کی توقیر رہنے کے لئے ہے
میں زندہ ہوں میری تحریر رہنے کے لئے ہے
مرا آئینہ تصنیف دیتا ہے گواہی
مرا ہر نقطۂ تفسیر رہنے کے لئے ہے

مزہ تو جب ہے کہ رنگِ سخن ہو وجہِ نمود
جو اشتہار کی محتاج ہو وہ شہرت کیا؟

تاہم بخش لائلپوری برطانیہ کے ایسے معتبر شاعر ہیں جن کا نام اور کام اہل ادب کی زبان پر عزت کے ساتھ آتا ہے۔ وہ ایک ایسے "گمنام" شاعر ہیں جنہیں ساری دنیا جانتی ہے۔

اگرچہ میری ان سے کبھی ذاتی ملاقات نہیں رہی، خط و کتابت کا تسلسل جاری ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ بخش شاعری کے تمام رموز و نکات سے بھی واقف ہیں۔ جتنی بڑی انہوں نے شاعری کی ہے اتنی بڑی ان کی اپنی شخصیت بھی ہے۔ موقع پرست، ابن الوقت مصلحت کوش شعراء سے دُور کھڑے بخش لائلپوری کو ان کی جرأت آموز، زندگی آمیز شاعری

نے درجہ امتیاز عطا کیا ہے۔ یہ بات بخش لائلپوری ہی شعر
کی صورت میں کہہ سکتے ہیں کہ

خونِ دل سے جو صلیبِ حرف کو دھوتے نہیں
زندہ لفظوں کو زمینِ شعر میں بوتے نہیں
شاعری میں خود تعین مت کریں اپنا مقام
اس طرح کے فیصلے تو اس طرح ہوتے نہیں

وہ یہ بھی برملا کہتے ہیں
لاکھ تنقید کرے مجھ پہ مگر وہ ناقد
شرط یہ ہے کہ مرے قد کے برابر نکلے

بخش لائلپوری کو شدت سے احساس ہے
کہ ابھی موسم نہیں بدلا اور جب تک موسم نہیں بدلے گا
وہ خصوصی لہجے میں کہتے رہیں گے

کسی دہلیز پہ قاتل کھڑا ہے
کسی دیوار میں خنجر گڑا ہے
ہمارا شہر تو چھوٹا ہے لیکن
ہمارے شہر کا مقتل بڑا ہے

مت پوچھیے طوافِ لوح و قلم کا حال
بازار سے اٹھی، سرِ دربار گر پڑی
اہلِ زر نے دیکھ کر کم ظرفیٔ اہلِ قلم
حرصِ زر کے ہر ترازو میں سخن ور رکھ دیے

بخش بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔
انہوں نے کھردرے سے کھردرے اور سخت جان
موضوع کو بھی نہایت ملائمیت سے پیش کیا ہے۔

دیارِ غیر میں میرا وہ سرپھرا بیٹا
گیا ہے گھر سے تو پھر لوٹ کر نہیں آیا

ہمارے خواب چوری ہو گئے ہیں
ہمیں راتوں کو نیند آتی نہیں ہے

یہ امر باعث مسرت ہے کہ انہوں نے
غزل کی روایت میں رہتے ہوئے بھی روایتی شاعری
نہیں کی بلکہ بخش سے پہلے میں نے ایسی شاعری پڑھی بھی
نہیں ہے کیونکہ ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے!

ابھی موسم نہیں بدلا میں غزلیات کے
علاوہ پندرہ بیس نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان نظموں میں
شہر نا پرساں، کربِ تخلیق، ریموٹ کنٹرول۔ ابھی
موسم نہیں بدلا۔ دربارِ رسالت میں اور گینگ ریپ جیسی
قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ خصوصاً دربارِ رسالت میں اور
دوسری نظم گینگ ریپ پڑھ کر حساس قاری کے رونگٹے
کھڑے ہو جاتے ہیں (کم سے کم میرا تجربہ یہی ہے)۔
بخش نے خدا جانے کتنے کربِ تخلیق سے گزر کر یہ نظمیں
کہی ہوں گی جب کہ وہ جانتے ہیں۔

نقش کردند کہ اظہار حقیقت کار است
ایں نہ گفتند کہ تختۂ رسن ساختہ اند

بخش لائلپوری شعر کی سطح پر زندگی کی صداقتوں کے شاعر اور ارتقاپذیر ذہن کے مالک ہیں۔ ان کی نظریاتی سوچ ترقی پسندانہ بھی ہے اور صراط مستقیم بھی۔ جس میں کسی قسم کی ہٹ دھرمی کا شائبہ تک نہیں۔ لہو کا خراج سے لے کر ابھی موسم نہیں بدلا کا بنظر غائر مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ان کی شاعری فن کی کسوٹی پر ایک زریں لکیر ہے۔ موضوع خواہ کوئی کیوں نہ ہو انہوں نے منفرد لہجے میں شعر سمویا ہے۔ جس میں نئی نئی تراکیب بھی ہیں۔ لفظوں کی تازہ کاری بھی۔ انہوں نے اپنے فن کو عام نعرے بازی سے دور رکھ کر ابھی موسم نہیں بدلا کو ایک ایسا صحیفہ بنادیا ہے جو کہ وحی کی صورت آسمانوں سے اترا کرتا ہے

نو بہ نو تخیل ہے، دل پذیر مصرعے ہیں
بخش شعر گوئی کا آخری پیمبر ہے!

"ہر چہ شک آرد کافر گردد"۔ بخش لائلپوری کی تمام تر شاعری صحت مندانہ سوچ کی شاعری ہے جو کہ آمد کے تحت ہوتی ہے۔

یہ تاثرات ایک قاری کے ہیں پیشہ ور ناقد کے نہیں کیونکہ ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرف دار نہیں!

xxxxxxxxxxxx

حرص و ہوس کے بازاروں میں جسم و جاں نیلام کریں
رزق کی خاطر شاہیں بچے کرگس کو پرنام کریں

وقت کی دیمک چاٹ گئی ہے سایہ دار درختوں کو
دھوپ میں ہم کس پیڑ کے نیچے پل دو پل آرام کریں

قریہ قریہ دھوم مچی ہے ظلم جہاں کے خنجر کی
آؤ ہم بھی سر کٹوا کر رسم حسینیؑ عام کریں

حرف و بیاں کا ایک سلگتا شہر ہمارے اندر ہے
رزم گہہ ابطال میں روشن صدق بیاں کا جام کریں

xxxxxxxxxxx

بخش لائلپوری سے خصوصی انٹرویو

شرکاء: لندن سے جتندر بلو، مجاہد ترمذی، حیدر طباطبائی، اطہر راز، ماجد عجمی اور منصور معجز۔ یورپ سے مسعود منور، سعید انجم، سائیں سچا، نعیمہ ضیاء الدین، نصر ملک اور ترعیب بلند نقوی۔ ہندوستان سے سیدہ نسرین نقاش۔ پاکستان سے ڈاکٹر سعادت سعید، جاوید شاہین اور آفتاب حسین۔

مرتب سید ابرار حسین ترمذی

سوال: بخش صاحب سب سے پہلے تو ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ آپ کی پرورش کس قسم کے ماحول میں ہوئی۔ تعلیمی مراحل کیسے طے ہوئے اور پھر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے آپ کو کیا کیا نشیب و فراز دیکھنے پڑے؟

جواب: میری پیدائش کپور تھلہ (مشرقی پنجاب) کے ایک دور افتادہ گاؤں میں ہوئی تھی۔ میرا باپ صرف پندرہ ایکٹر زمین کامالک ایک اوسط درجہ کا زمیندار تھا۔ آپ اسے مفلسی کا ہی ماحول سمجھیں میری آنکھ ایک ایسے ماحول میں کھلی جب چاروں طرف افراتفری کا عالم تھا۔ ہمارا ملک جو کہ اس وقت غیر منقسم ہندوستان تھا گوناگوں عصری مسائل کی زد میں تھا، ایک طرف پوری دنیا عالمی جنگ میں مبتلا تھی اور دوسری طرف ضروریاتِ زندگی ناپید تھیں۔ روٹی، کپڑا اور مکان پر سب کی توجہ تھی۔ اس سلسلے میں کوئی عملی پیش رفت بھی قابلِ ذکر نہیں تھی۔ تعلیمی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے اور جنگ کی وجہ سے مہنگائی آسمان پر تھی۔ دوسری طرف غیر ملکی سامراج کے خلاف جنگِ آزادی کی جدوجہد زور شور سے جاری تھی۔ پنجاب میں حریت پسندوں کا زور بڑھ چکا تھا۔ بھگت سنگھ کو پھانسی ہوئی اور پورے پنجاب میں کرانتی کی لہر دوڑ گئی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی قوم کے جذبات پر علامہ اقبال کے اشعار نے جلتی پر تیل کا کام کردیا تھا اور قیامِ پاکستان کی تحریک ایک بڑے موثر انداز میں چل رہی تھی، انہی تیز و تند دھاروں میں پھنسی ہوئی جس نسل نے بلوغت میں قدم رکھا میری نوجوانی کا آغاز اسی نسل سے ہے۔ میرے شعور میں اگر کائنات کی گھما گھمی کا تصور آیا تو سب سے پہلے جور و ظلم سے تڑپتی ہوئی انسانیت کو دیکھا اور میرے دل پر عشق کی بجائے انسانوں کے درد و کرب اور محرومیوں کی چوٹ پڑی۔ عملی زندگی میں قدم قدم

پر سیاسی محرومیوں، معاشی مشکلوں، خود غرضیوں اور ریاکاریوں سے بھی پالا پڑتا رہا۔ زندگی کی مثبت اقدار سے بہت کم پالا پڑا اور منفی سوچ، فتنہ پروری اور جبر و استحصال کے حصار دیکھنے میں زیادہ نظر آئے۔ ایسا ماحول ایک تخلیقی ذہن کے لئے زیادہ سازگار ہوتا ہے۔ معاشرہ تخلیق کار کو جس قدر ذلیل کرے گا تخلیق کار کی تخلیقی حس ایک ردِ عمل کے طور پر اسی قدر طاقت ور اور توانا ہوگی۔ جہاں تک میرے تعلیمی مراحل کا تعلق ہے تو اس کا آغاز گاؤں کے سکول سے ہوا اور اس کا اختتام براستہ اردو کالج، کراچی یونیورسٹی میں ہوا، یہ ۱۹۵۲ء۔سنہ ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے۔

سوال: یہ بتایئے کہ اپنی ذات کے حوالے سے کی گئی شاعری زیادہ جاندار ہوتی ہے یا معاشرتی اور دوسرے بیرونی محرکات کے حوالے سے کی گئی شاعری؟

جواب: ادیبوں اور شاعروں کی ذات اپنے معاشرے سے الگ تھلگ نہیں ہوتی۔ ہر فن کار کی ذہنی تشکیل اور اس کے فنی تشخص میں اس کے عصری رجحانات کارفرما ہوتے ہیں۔ شاعر ادیب یا فن کار دوسروں سے ذرا یوں مختلف ہوتا ہے کہ اس کے دل و دماغ پر اس کے گرد و پیش کا ماحول نسبتاً زیادہ شدت سے اثرانداز ہوتا ہے کیونکہ وہ شدت سے جذبات کا مارا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں ان احساسات کے اظہار کی گرمی بھی ہوتی ہے۔ اب اس کا فن کس پایہ کا ہے یہ اس کی تخلیق اور کلام سے ظاہر ہوگا۔ اگر اس کا کلام معیاری ہے اور وہ اپنے ماحول کو جذب کرنے کا ملکہ رکھتا ہے تو وہ یقیناً اپنے ماحول پر اثرانداز ہوگا۔ معاشرے کی سوچ اور اس کی تبدیلی بھی شاعر کو متاثر کرتی ہے۔ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں فن کار ازسرِ نو خود بھی کوئی نئی کروٹ لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ فن کار بغیر سماج کے اور سماج بغیر فن کار کے نامکمل ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر پرورش نہیں پا سکتے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ کسی ادیب کی ذاتی کیفیت قابلِ قدر اسی وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی ذات میں دوسروں کو بھی شامل کرلے، جب تک ادیب اپنے ذاتی درد و کرب میں اپنے معاشرے کو شامل نہیں کرتا اس کی آہ و بکا بے اثر ثابت ہوگی۔

سوال: آپ کی شاعری کا محرک کیا ہے؟

جواب: میری شاعری کا محرک استحصالی معاشرہ پر مبنی میرا دور رہا ہے اور اب بھی ہے۔ میرے محسوسات عصرِ رواں کی ہر لحہ متقلب تحریکوں کے پروردہ ہیں۔ یہ تحریکیں زیادہ تر سیاسی اور معاشی رہی ہیں اور آج بھی ہم اسی معاشی تضاد کا شکار ہیں یعنی آزادی کے بعد بھی۔

سوال: آپ کے کلام کے ناقدوں اور تبصرہ نگاروں نے آپ کو ترقی پسند تحریک کا علم بردار اور مزاحمتی شاعری کے ہراول دستے کا شاعر قرار دیا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ نے ترقی پسند تحریک کا اثر کب اور کن حالات میں قبول کیا؟

جواب: تیس کی دہائی میں مشرقی پنجاب میں ایک بڑی زوردار تحریک مہاجنوں کے خلاف چلی تھی۔ پنجاب کے ہر گاؤں میں دو چار گھر سود خور مہاجنوں کے

ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ سود در سود کے حربوں سے کسانوں کی زمین، کھیتی باڑی کی فصل اور ان کے ڈور ڈنگر قرق کر لیا کرتے تھے۔ اس تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ یہ مہاجن گاؤں چھوڑ کر شہروں میں جا چھپے۔ اس تحریک کے لیڈر کوئی چوہدری عبدالعزیز تھے۔ ان کے نائبین ہر گاؤں میں آکر کسانوں کو بھاشن دیتے۔ دھرم اور مذہب کے نام پر ہونے والی اس لوٹ کھسوٹ پر بحث و مباحثہ کرتے اور کسانوں کو ان کے حقوق بتاتے۔ لالوں اور مہاجنوں کے خلاف اس دور کا پنجابی شعری نمونہ حاضر ہے جو کہ بعد ازاں میری ترقی پسند سوچ کا محور و مرکز بنا۔

دیکھو لالہ جی کا ڈوں
دے کے اک من کچے بوں
پل وچ کر لے پورے نوں
منتر خوب چلایا اے
ساڈی اکھیں دے کے کھوپے
کیتے طرح طرح دے ٹوکے
ساڈے سارے رستے روکے
منتر خوب چلایا اے
دیکھو عبدالعزیز پیارے
حامی بن دکھلایا اے
سانوں لالیاں پنڈتاں کولوں
جس نے آن چھڑوایا اے

جب یہ تحریک چلی تھی اس وقت میری عمر نو سال کے قریب تھی۔ مہاجنوں، پنڈتوں اور ملاؤں کے رویوں، ۱۹۳۶ء کی تحریک، کارل مارکس کے نظریات اور روسی انقلاب نے مجھے مذہبی بیگانگی کے راستے پر ڈال دیا، اس پر میں آج بھی گامزن ہوں۔

سوال: آپ اپنے آپ کو شعر گوئی پر کیوں مجبور پاتے ہیں؟

جواب: عورت بچہ کیوں جنتی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ CONCEIVE کرتی ہے اور CONCEPTION کی بنا پر بچہ پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح شاعر بھی CONCEIVE کرتا ہے اور یہ مواد اسی کے ذہن کی کٹھالی میں پک کر باہر نکل آتا ہے۔

سوال: بخش صاحب! آپ کی شاعری میں مظلوم اور محکوم طبقات کی آسودگی کے لئے جلالی لہجہ کب اور کیسے آیا؟

جواب: اگر آپ نے ہٹلر کی داستانِ حیات کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہٹلر دہشت گردی کا جواب بڑی دہشت گردی سے دینے کا قائل تھا۔ اسی باعث اس نے برطانوی اور فرانسیسی نوآبادیاتی حکمتِ عملی کے خلاف دوسری جنگ کا آغاز کیا تھا۔ اگر چہ جرمنی کو شکست ہوگئی تھی لیکن اس جنگ کے نتیجہ میں ہندوستان آزاد ہوا۔ کیونکہ ہمارا شمار محکوم اور مظلوم طبقات میں ہے لہٰذا ہمیں معاشی دہشت گردوں کا جواب دہشت گردی سے ہی دینا چاہئے۔ کیونکہ شاعر سیاست داں نہیں ہوتا لہٰذا اسے اپنی تخلیقات سے استحصالی قوتوں کی مدافعت کرنی چاہئے۔ شاعر بندوق کا کام الفاظ

سے لیتا ہے۔

سوال: پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی طرح ترقی پسند تحریک کوئی منظم اور فعال ادبی ادارہ نہیں لیکن پھر بھی ترقی پسند تحریک کو بعض لکھنے والوں نے منظم ادبی لہر کے طور پر استعمال کیا۔ آپ کے نزدیک اس تحریک کا اصل رنگ و روپ کیا ہے؟

جواب: سب سے پہلے تو میں یہ واضح کردوں کہ بھائی مسعود آپ کا یہ سوال ادبی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ سیاسی حیثیت کا ہے۔ کیونکہ میں ترقی پسند تحریک سے ذہنی طور پر متعلق رہا ہوں اس لئے یہ بتاتا چلوں کہ ترقی پسند تحریک ایک فعال اور منظم تحریک رہی ہے اور ہے۔ اس کا ثبوت فیض کی ہمیشہ زندہ رہنے والی شاعری ہے۔ فیض صاحب کے علاوہ اور بھی بہت سے نام ہیں۔ اس انداز کی شاعری ۱۹۳۶ء سے پہلے بالکل ناپید تھی۔ جہاں تک ہمارا کام ہے وہ یہ ہے کہ سماج میں ہونے والی بے چینی، ظالم و مظلوم کا ٹکراؤ۔ عام آدمی کی محرومی اور بے قراری تیسری دنیا کے مظلوم عوام اور عالمی جابر حکمرانوں کے عملی تضادات کو دیکھ کر جو خیالات ابھرتے ہیں وہ ہمارے اشعار کا موضوع بننے چاہئیں۔ شاعر زندگی اور گرد و پیش کے حالات سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ ان باتوں کی فکر یا تخلیق کے لئے کسی قسم کی منصوبہ بندی نہیں کرنی پڑتی اور پھر مسعود صاحب آپ خود ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ جن حالات سے موجودہ دور کا عام انسان گزر رہا ہے یعنی انسانی حقوق کے حوالے سے بھی اور خدائی حقوق کے حوالے سے بھی، آپ مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔

سوال: ترقی پسند ادیب مثلاً سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری اور خواجہ احمد عباس اپنے رہن سہن کے اعتبار سے بورژوا تھے یا ہیں۔ بھلا بورژوا لوگ جو ترقی پسند شاعری کریں وہ ایک مصنوعی لفظی اداکاری تو ہوسکتی ہے سچی اور کھری شاعری نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی ادبی شخصیت کی ہسٹری شیٹ کو زیرِ بحث لانا ضروری نہیں ہوتا۔ غالبؔ بھی ایک خاندانی وجاہت رکھتے تھے۔ مغلیہ سرکار کے اور برطانوی دربار کے وظیفہ خوار تھے۔ فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر کے علاوہ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے علی سردار جعفری، خواجہ احمد عباس اور مزید براں حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی بڑے خاندانوں کے چشم و چراغ نہیں تھے اور نہ ہی ترقی پسند تحریک کے رکن تھے۔ البتہ اس تحریک سے متاثر ضرور تھے۔ سجاد ظہیر اور فیض صاحب اگرچہ بڑی سوسائٹی کے لوگ تھے لیکن انہوں نے اپنی ذات کو آخری حد تک DE CLASS اور نظریاتی اعتبار سے عوامی صفوں میں شامل ہوگئے۔ اپنے نظریات کی خاطر یہ ان کی بہت بڑی قربانی تھی۔ اگر ان حضرات کا تخلیق کردہ ادب مصنوعی اداکاری کی حد میں آتا ہے تو آپ علامہ اقبال کی ترقی پسند شاعری کو کس کھاتے میں ڈالیں گے؟ ”اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو۔“

سوال: ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں ہی بیرونی

اور اجنبی تحریکوں کے اثرات کا نتیجہ تھے۔ یہ اپنی مٹی سے اُگے ہوئے فطرتی پودے نہیں تھے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے آپ گاؤں کے میراثی کو لنڈا بازار سے پیرس کا کوٹ لا کر پہنادیں۔ اس باب میں آپ کے ارشادات کیا ہیں؟

جواب: آپ کے خیالات سے میں سو فیصد متفق ہوں۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے ساتھ ساتھ تحریکِ آزادی بھی باہر کے اثرات کا نتیجہ تھی۔ بلکہ ہندوستان پر ایک ہزار سال تک باہر ہی کے لوگوں کی حکومت رہی۔ اہل ہند ہر بیرونی حملہ آور کو سر جھکا کر اور ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا کرتے تھے۔ اگرچہ ان کی روش ان کے اخلاقی اور تہذیبی ورثہ کی نمائندہ تھی لیکن باہر والوں نے اس اخلاقی خوبی کو اہلِ ہند کی غلامانہ ذہنیت کے مترادف سمجھا۔ جس قوم کے اپنے فکری سوتے خشک ہو جائیں تو باہر کے خیالات و افکار کا غالب آنا لازمی ہو جاتا ہے۔ جب اپنی مٹی بانجھ ہو جائے تو پھر پودوں کی نمو کے لئے باہر سے ہی کھاد منگوانی پڑے گی۔ اور لنڈا بازار سے لندن اور پیرس والوں کی اترن خرید کر تن پوشی کا اہتمام کرنا پڑے گا۔

سوال: آپ پچھلے چھتیس برس سے برطانیہ میں مقیم ہیں۔ میں افسانے کے باب میں جاننا چاہوں گا کہ آپ نقادوں کی تحریروں کے حوالے سے بتائیں کہ کون سے افسانہ نگاروں نے مشرقی اور مغربی تضادات کو شدت سے محسوس کیا ہے؟

جواب: برصغیر کے افسانہ نگاروں اور کہانی کاروں کی تخلیقات کا میرا مطالعہ واجبی سا ہے۔ اگرچہ دنیا اب سمٹ کر ایک نقطے کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ہر ملک کے حالات گھر بیٹھے پردۂ سکرین پر دیکھے بھی جا سکتے ہیں اور سنے بھی جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ ادیب جو تیسری دنیا اور مغربی تہذیب کا ذائقہ از خود چکھ چکے ہیں وہ مشرقی اور مغربی تضادات کو اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر بہتر طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جتندر بلو، قیصر تمکین، نعیمہ ضیاء الدین، سائیں سچا اور سعید انجم دونوں تہذیبوں کے پروردہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں ان کے ذاتی مشاہدات اور معاشرتی تضادات جس خوبی سے بیان ہوئے ہیں وہ ان کے ذاتی، فکری اور احساسِ محرومی کے عملی تجربات کا نچوڑ ہیں۔ افسانہ نگاروں کی اس فہرست میں میں نصر ملک، ثریا شہاب، شاہدہ احمد، صفیہ صدیقی اور مقصود الٰہی شیخ کو بھی شامل کرتا ہوں۔ جہاں تک نقادوں کی بات ہے تو بیشتر نقاد لائی لگ قسم کے ہیں۔ وہ صرف ذاتی تعلقات کی بنا پر لفظوں کا کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ کون کیا ہے اس کا فیصلہ نقاد نہیں وقت کیا کرتا ہے۔

سوال: میرا آخری سوال یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ شاعری الہام ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ برصغیر کے اردو داں حلقوں کے تسلیم شدہ شاعر ہیں۔ میں جاننا چاہوں گا کہ آیا شاعری خارجیت سے تعلق رکھتی ہے یا کہ سماجی طبقات کی غیر ہم آہنگی سے نمو پاتی ہے؟

جواب: شاعری، افسانہ نگاری یا کہانی یہ صرف کسی خیال کو الفاظ کا جامہ پہنانے کا نام ہے۔ پہلے خیال آتا ہے

پھر الفاظ کا تانا بانا بُنا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر تخلیق کسی خیال کے اظہار کا نام ہے۔ شاعر کبھی اپنی ذات کو خارجی اثرات کے ذریعہ بیان کرتا ہے اور کبھی خارج کو اپنی ذات کی کٹھالی میں پکاتا ہے۔ شاعری کے لئے کوئی خاص قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔

سوال: ترقی پسند تحریک دراصل اشتراکی فلسفۂ حیات کی مرہونِ منت تھی۔ اسی فلسفۂ کے زیر اثر روس میں انقلاب آیا لیکن روس کی اشتراکی سلطنت صرف ۷۵ سال چلنے کے بعد دم توڑ گئی۔ کیا مارکس ازم ایک ناکام فلسفہ نہیں تھا؟

جواب: روسی سلطنت کا انہدام اشتراکی فلسفہ کی ناکامی کا جواز نہیں ہے۔ روس کے اشتراکی نظام کو ناکام بنانے میں عالمی سرمایہ داری کی غنڈہ گردی کا ہاتھ ہے۔ مغربی پریس کے مطابق روس میں افراطِ زر کی شرح پچھلے سالوں میں کئی سو گنا بڑھ چکی ہے۔ روس کا روبل دنیا میں بے وقار ہو چکا ہے۔ خودکشی کی شرح سب سے زیادہ روس میں ہے اور PROSTITUTION دنیا میں سب سے زیادہ روس میں ہے۔ طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی۔ حیلوں کا بھی دخل ہے لیکن اصل واقعہ یہی ہے کہ عالمی سرمایہ دار، مافیا اپنے بچاؤ کے لئے پروگریسیو نظریات کو ملیامیٹ کرنا چاہتا تھا۔ روس کی اشتراکی مملکت مسلمانانِ عالم کے لئے باعثِ رحمت تھی۔ روس کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کی سرکوبی کی حکمتِ عملی جاری ہے۔ مغرب کی عیسائی حکومتوں کو مسلمانوں سے خطرہ تھا۔ لیکن روس کا کمیونسٹ انقلاب ان کے لئے مسلمانوں سے بھی بڑا خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ لہٰذا اہلِ مغرب نے مسلمانوں کی فائل بند کر دی اور اسلام کے نام پر انہیں اپنے ساتھ ملا لیا۔ روسی سلطنت کی تباہی کے بعد اہلِ مغرب نے مسلمانوں کی فائل از سر نو کھول لی ہے۔ یہ بڑی لمبی چوڑی بحث ہے لہٰذا اسے یہیں ختم کرتا ہوں البتہ یہ کہوں گا کہ اشتراکی نظام روس میں ۷۵ سال تک چلا جبکہ دیگر ممالک میں یہ نظام جاری ہے۔ لیکن اسلامی نظام تو صرف ۳۲ سال چل کر ختم ہو گیا تھا۔ کیا آپ اسے اسلامی نظام کی کمزوری و ناکامی کہیں گے؟

سوال: پاکستانیوں کا پختہ عقیدہ ہے کہ روس کی بربادی میں پاکستان کے مردِ مجاہد مردِ قلندر ضیاء الحق کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اس سوال کا جواب دیا جا چکا ہے۔ ضیاء الحق مردِ قلندر تھا یا مردِ جالندھر تھا جو کچھ بھی تھا وہ مغربی سرمایہ داری نظام کا ایجنٹ تھا۔ روس کے اشتراکی نظام کی شکست و ریخت دراصل مسلمانوں کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ نیو ورلڈ آڈر کا اصل ایجنڈا یہی ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند تحریک انتظامی طور پر ختم ہو چکی ہے اور روس کے انہدام کے بعد اس تحریک کا کوئی جواز نہیں رہا۔ آپ برطانیہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر ہیں۔ کیا آپ اس رائے سے متفق ہیں؟

جواب: ترقی پسند تحریک کوئی حفظانِ صحت کا محکمہ نہیں تھا جسے ہر دور میں قائم رکھنا ضروری ہو۔ یہ ایک ادبی تحریک تھی، روشن خیالی کی لہر تھی۔ ہر تحریک کا

انتظامی بنیاد پر قائم رہنا یا انتظامی طور پر قائم رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہندوستان کی تحریکِ آزادی ایک خاص مقصد کے لئے معرضِ وجود میں آئی تھی اور یہ تحریک ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ تحریکِ آزادی کے مقاصد پورے ہوئے اور اس کے بعد اس تحریک کے انتظامی طور پر قائم رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ۱۹۲۴ء میں تحریکِ خلافت کا بڑا زور شور تھا۔ یہ تحریک اپنے مقاصد میں ناکام رہی اور اس کا انتظامی وجود بھی ختم ہو گیا۔ آزادی کی تحریک کے بعد دوسری بڑی تحریک ترقی پسند تحریک تھی۔ اس تحریک نے اس دور کے ادیبوں، شاعروں اور دیگر اہل قلم کو زندگی کے حقیقی مقاصد سے اعلیٰ اور ارفع تصور حیات سے روشناس کرایا۔ اوہام پرستی اور حسن پرستی میں مقید انسانوں کو رہائی دلوائی۔ اور ان کے اذہان کو انسانی حقوق، معاشرتی ناہمواریوں، سامراجی حربوں اور نئی روشنی سے متعارف کروایا۔ اُس دور کے شعراء محبوبہ کی کنگھی چوٹی میں الجھے ہوئے تھے اور نثر نگار طوطا مینا کی کہانیاں قلم بند کر رہے تھے۔ آج کے معاشی اور استحصالی مسائل اور جابر حکمرانوں کا ظلم و ستم اُس دور میں بھی موجود تھا۔ لیکن ہمارے ادیب اپنی ذات کے حصاروں میں بند تھے۔ لیکن ترقی پسند تحریک نے ان کے ذہنوں کو تازہ ہوا سے آشنا کروایا اور نئی روشنی سے ان کے دماغوں کو منور کر کے انہیں انسانی مسائل کے مقابل لا کھڑا کیا۔ یہ برقی رو آج بھی اردو ادب میں جاری و ساری ہے۔ اُس دورِ رفتہ کا ہم اگر جائزہ لیں تو منشی پریم چند اور علامہ اقبال کے سوا کم و بیش تمام ادیب ایک ہی بیماری کا شکار تھے اور وہ تھی ان کی ذات پرستی اور حسن پرستی۔ یہ کنویں کے مینڈک دریائی امواج سے ناآشنا تھے۔ ترقی پسندوں نے سامراجیت کی مخالفت میں آواز اٹھائی اور ترقی پسند نظریات کا پرچار کیا۔ پاکستان کے قیام کے حق میں ووٹ دیا۔ مختصر یہ کہ ترقی پسند تحریک جن مقاصد کے حصول کے لئے وجود میں آئی تھی وہ حاصل ہوئے اور اس کا انتظامی طور پر قائم رہنا ضروری نہیں۔ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند شعراء کے خلاف چند جدیدیے واویلا کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ جدیدیوں نے فیض اور جعفری تو کیا ساحر، کیفی، مجاز اور جالب کے پایہ کا ادیب بھی پیدا نہیں کیا۔ لے دے کر وہ میراجی کو پیش کرتے ہیں اور میراجی کو فیض سے بڑا شاعر ثابت کرنے میں انہوں نے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کا ادبی طالب علم میراجی کی شاعری تو کیا اس کے نام سے بھی آشنا نہیں ہے۔

سوال: پاکستان کی تحریک کے وقت آپ کی عمر کیا تھی اور آپ کا اس تحریک میں کتنا حصہ ہے؟

جواب: ۱۹۴۷ء میں، میں اندھیر ہائی سکول کپور تھلہ میں نویں جماعت میں تھا۔ سکول میں داخلہ بڑی عمر میں ہوا تھا لہٰذا اس وقت میری عمر ۱۶۔۱۷ سال تھی۔ میری تاریخ پیدائش قیاسی ۱۹۳۱ء ہے اور سرکاری ریکارڈ کے مطابق ۱۹۳۴ء ہے جو کہ یقینی طور پر غلط ہے کیونکہ یہ

تاریخ پاکستان میں از سر نو داخلہ کے وقت میں نے بذات خود کردی تھی۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے میں میرا حصہ صرف مسلم لیگ زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی شب میں، میں بھی اپنے ایک ہم عمر کے ساتھ رات کے بارہ بجے کپور تھلہ کے صدر بازار میں ریڈیو کے سامنے کھڑے ہجوم میں شامل تھا۔ عین بارہ بجے پاکستان کا اعلان ہوا تو ہم نے فرطِ انبساط سے پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگائے۔ یہ ہجوم ہندو اکثریت پر مشتمل تھا۔ ہماری وہ پٹائی ہوئی کہ بھاگ کر جان بچانی پڑی۔ پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی سارے شہر میں مسلمانوں کے خلاف آتش و خون کے کھیل کا آغاز ہو گیا۔ ہم دونوں پینڈو دوست ننگے پاؤں راتوں رات بارہ کوس کا سفر طے کر کے گاؤں پہنچے۔ گاؤں والے سفر پاکستان کے لئے کارواں کی صورت میں تیار بیٹھے تھے۔ پھر کیا ہوا قاتل حملہ آوروں سے بچتے بچاتے ساٹھ میل کا پیدل سفر طے کر کے مملکتِ خداداد میں سجدہ ریز ہوئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم نے پاکستان کے لئے ہندوؤں سے مار کھائی اور اب ہم پاکستان کے لئے جاگیرداروں سے جوتے کھا رہے ہیں۔ یہ سب ہمارے قائدِ اعظم کا احسان ہے!

سوال: ۱۹۸۵ء کی گولڈن جوبلی (ترقی پسند تحریک) کے حوالے سے آپ کے کئی بیانات اور انٹرویوز شائع ہو چکے ہیں جن میں آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے اس وقت کے سکریٹری جنرل عاشور کاظمی پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے گریٹر لندن کونسل سے ملنے والی ۹ ہزار پونڈ کی گرانٹ کو دو ہزار پونڈ بتا کر بددیانتی کی — عاشور کاظمی اپنے حلقۂ احباب کو بتاتے ہیں کہ بخش لائلپوری سنّی ہے اور وہ مجھ شیعہ کو بدنام کر رہا ہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بخش لائلپوری کو میں اپنا بڑا بھائی مانتا ہوں اس لئے میں اس کی باتوں کا برا نہیں مانتا۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: پہلی بات یہ ہے کہ عاشور کاظمی نہ کسی کا بھائی ہے نہ باپ ہے نہ شوہر ہے اور میں نہ سنّی نہ شیعہ، نہ وہابی اور نہ اہلِ حدیث ہوں۔ بس تھوڑا سا نامکمل مسلمان ہوں۔ البتہ میں اپنے آپ کو ایک انسان سمجھتا ہوں، سچ بولنا اور سچ سننا ہی انسانی معراج سمجھتا ہوں۔ عاشور رو کاظمی اس لئے خاموش ہیں کہ وہ اپنے ہی بچھائے ہوئے دامِ فریب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ گریٹر لندن کونسل نے انجمن کی گرانٹ اپلی کیشن کے سلسلے میں ہونے والی خط و کتابت کے بعد انجمن کے سکریٹری جنرل کے نام مبلغ ۹ ہزار پونڈ کا چک ۲۶ جون ۱۹۸۵ء کو روانہ کیا تھا۔ عاشور صاحب نے ایک ماہ کی مکمل خاموشی کے بعد ۲۷ جولائی کو مجھے بتایا کہ کونسل نے ہمیں دو ہزار کا چک روانہ کیا ہے۔ اس انکشاف کے پیشتر ہی مجھے، جاوید حکیم قریشی، محمد عارف اور دیگر ساتھیوں کو اصل رقم کا پتہ چل چکا تھا۔ کیونکہ گولڈن جوبلی کے انتظام و اہتمام کے سلسلے میں موصوف مجھے ساتھ ساتھ لئے پھرا کرتے تھے لیکن جب بھی کونسل کے دفتر میں جانے کے لئے تیار ہوا تو

موصوف مجھ سے یہی فرمایا کرتے تھے "کہ بھائی آپ صبح سے آئے ہوئے ہیں۔ اب گھر جائیں۔ بھابھی انتظار کر رہی ہوگی"۔ مطلب یہ کہ کونسل کے ساتھ ہونے والی ہر کارروائی کو موصوف نے خفیہ رکھا۔ ایک دن کہنے لگے کہ سنا ہے کہ کونسل کل اخراجات کا ستر فیصد کاٹ لیتی ہے یعنی ہم نے کونسل سے دس ہزار مانگا ہے وہ شاید ہمیں دو ہزار پونڈ عنایت کرے۔ "بس بھائی آپ تین ہزار پونڈ مجھے دے دینا باقی تمام اخراجات میں اپنی جیب سے خرچ کر دونگا" لطف کی بات یہ ہے کہ جب یہ مجھ سے اس طرح کی گفتگو کر رہے تھے اس وقت کونسل کی طرف سے انہیں نو ہزار پونڈ کا چیک ملا ہوا تھا۔ گویا موصوف کونسل کی گرانٹ کی لوٹ مار کے ساتھ ساتھ مجھے بھی لوٹنا چاہتے تھے۔ عاشور کاظمی ۹ ہزار پونڈ کا دو ہزار بتانے سے پیشتر اس خبر کو تسلیم کروانے کے لئے مجھے ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے۔ واضح ہو کہ انجمن کی گولڈن جوبلی کا انعقاد ۱۳ اور ۱۴ اگست ۱۹۸۵ء کو ہوا تھا جب کہ انہوں نے چیک کا انکشاف ۲۷ جولائی کو کیا تھا۔ ۲۳ جولائی کو جب میری اُن سے ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے کہ "بھائی تین دن سے سخت پریشان رہا ہوں" میرے دریافت کرنے پر کہنے لگے کہ "میری بنک سٹیٹ منٹ میں تیس ملین پونڈ کا کریڈٹ تھا۔ بنک منیجر سے دریافت کیا کہ بتاؤ یہ رقم میرے اکاؤنٹ میں کہاں سے آئی۔ اگلے دن ایرانی ایمبیسی سے ایک صاحب سفارتی کار میں آیا اور اس نے فرمایا کہ عاشور صاحب آپ بے فکر رہیں۔ یہ رقم امام خمینی نے تمہیں ایماندار شیعہ سمجھتے ہوئے تمہارے اکاؤنٹ میں درج کروائی ہے اور یہ رقم امام صاحب اسلام دشمن مغربی طاقتوں کے خلاف خرچ کریں گے۔ لیکن میں نے اس آفیسر سے کہا کہ دیکھو یہ ایمان کا معاملہ ہے میں ایک معمولی سا انسان ہوں۔ کہیں یہ خطیر رقم میرے ایمان کو متزلزل نہ کردے۔ آپ براہ کرم یہ رقم میرے کھاتے سے جلد از جلد نکال لیں اور اب تازہ سٹیٹ منٹ سے وہ رقم غائب ہے۔" اس من گھڑت کہانی کے تین دن بعد عاشور صاحب نے ۹ ہزار کا دو ہزار بتادیا۔ اس کہانی میں جو فلسفہ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص تیس ملین پونڈ کی رقم پر بے ایمان نہیں ہوا، وہ ۹ ہزار پر کیسے ہوگا؟ انگلستان میں کوئی ڈیڑھ لاکھ ایرانی رہتے ہیں۔ امام صاحب کو ان میں سے کوئی بھی ایماندار نظر نہیں آیا جو اتنا بڑا بار امانت اٹھا سکے۔ دوسری بات یہ کہ رقم آپ کے اکاؤنٹ میں آتو سکتی ہے لیکن آپ کے دستخط کے بغیر نکل نہیں سکتی۔ یہ کہانی سن کر مجھے اس کی ایمانداری پر شبہ ہو گیا تھا میں نے اسی دن محمد عارف کو فون پر مطلع کر دیا اور اس نے جی ایل سی سے رابطہ قائم کر کے اصل رقم دریافت کرلی۔

سوال: جب آپ حضرات کو اصل رقم کا پتہ چل گیا تھا تو پھر آپ لوگوں نے اس کے خلاف فوراً تادیبی کارروائی نہیں کی؟

جواب: یہ معاملہ اسی وقت انجمن کے چند ہم خیال ارکان کی ایک میٹنگ میں زیر بحث لایا گیا تھا۔ میرا اور پروفیسر محمد عارف کا خیال تھا کہ انجمن کے سکریٹری جنرل کے خلاف فوراً تادیبی کارروائی ہونی چاہئے لیکن

پروفیسر امین مغل اور انجمن کے ثقافتی سکریٹری کے دلائل کچھ اور تھے۔ان کے خیال کے مطابق اس ڈرامہ کے اب تین کردار ہیں۔ ایک طرف ہم ہیں دوسری طرف انجمن کے سکریٹری جنرل ہیں۔اور تیسری طرف گریٹر لندن کونسل ہے۔اگر ہم نے عاشور کو کٹہرے میں کھڑا کیا تو کونسل کی وجہ سے ہمارے سکریٹری جنرل کا پھیلایا ہوا سارا گند انگلش پریس کی زینت بنے گا۔اور یہ اقدام پوری پاکستانی قوم کی بدنامی کا باعث بنے گا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ فارغ بخاری نے بتادیا تھا کہ عاشور صاحب نے اس کی سادگی اور پر اعتمادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ہی بار انجمن کی چک بک پر دستخط کروالئے تھے۔کیونکہ اکاؤنٹ صدر انجمن اور سکریٹری جنرل مشترکہ دستخطوں سے چلتا تھا۔ اگرچہ اصل رقم کے انکشاف کے بعد فارغ بخاری نے انجمن کا بنک اکاؤنٹ منجمد کردیا تھا لیکن چیل کے گھونسلے سے ماس غائب ہو چکا تھا۔ تیسری اہم بات یہ تھی کہ اس وقت یعنی ۲۷، ۲۸ جولائی کی رات تک ہندوستان اور پاکستان سے تقریباً بیں پچیس کے قریب مندوبین برطانیہ آچکے تھے۔ دوستوں کا خیال تھا کہ اتنے بڑے دھماکے کے بعد گولڈن جوبلی منانے کا کوئی جواز نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس معاملہ کو گولڈن جبلی کے بعد تک مؤخر کردیا تھا۔

سوال: کاظمی صاحب نے اصل رقم کو کب تسلیم کیا؟

جواب: یہ موضوع طویل ہوتا جارہا ہے میں اسے مختصر کررہا ہوں۔ عاشور کاظمی ۹ ہزار پونڈ کو تین ماہ تک دوہزار پونڈ بتاتے رہے جہاں تک کہ موصوف نے گریٹر لندن کونسل کے ایکنو ہال میں ۱۳ اگست کے پہلے اجلاس میں کھڑے ہوکر فرمایا" بھائیو! ہم نے نہ شمال سے (یعنی روس سے) کوئی مالی امداد لی اور نہ جنوب (برطانیہ وغیرہ) سے کوئی مالی مدد ملی ہے۔البتہ گریٹر لندن کونسل نے ہماری معمولی امداد کی ہے جوکہ ہماری توقعات کے مطابق نہیں" ہم نے اپنی درخواست میں جی ایل سی سے دس ہزار پونڈ مانگا تھا جی ایل سی نے ۹ ہزار کا چک سکریٹری جنرل کو روانہ کیا۔ جی ایل سی نے اپنا ہال جس کا کرایہ کم از کم ہزار پونڈ ہوگا انجمن کو مفت دیا۔ جی ایل سی نے ہمیں مفت میں اپنے خوبصورت باورچی خانے کے استعمال کی مراعات دیں۔ اس کے علاوہ جی ایل سی نے ہمارے تمام مہمانوں کو اور کانفرنس کی انتظامیہ کو جو کہ تعداد میں ایک سو سے کم نہ ہوگی ایک شاندار عشائیہ بھی دیا۔ اُدھر عاشور کاظمی جی ایل سی کی سٹیج پر کھڑے ہوکر سفید جھوٹ بولے جارہے تھے کہ جی یل سی نے ہمیں معمولی امداد دی ہے۔ اگر ہم اس ویڈیو کیسٹ جس میں عاشور کا بیان ریکارڈ ہوا ہے جی ایل سی کے گرانٹ آفیسر مسٹر سدرلینڈ کو دکھادیتے تو وہ اس کو ٹانگ کر رکھ دیتا۔ بات پھر وہی عزتِ سادات کی تھی پاکستان کی بدنامی تھی۔ کانفرنس میں جب وقفہ ہوا تو حضرتِ مجاہد علی سید مدیر ماہنامہ کارواں، اوسلو نے عاشور سے پوچھا کہ بھائی! آپ نے گریٹر لندن کونسل کی معمولی امداد کا ذکر کیا ہے لیکن رقم کی نشان دہی نہیں کی تو فرمانے لگے کہ "جی ایل سی نے ہمیں دوہزار پونڈ دیا ہے" اس عقل کے اندھے کو یہ نہیں پتہ کہ مسٹر مجاہد علی سید جی ایل سی

کے گرانٹ آفیسر کا ۲ اگست روز جمعہ کو مفصل انٹرویو کر چکا ہے اور عاشور صاحب کا سارا کچا چٹھا ماہنامہ کارواں کے شمارہ بابت اکتوبر میں آن بان کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس نے مجھ سے، جاوید حکیم قریشی سے اور پروفیسر محمد عارف سے فرمایا کہ اس نے جی ایل سی کے گرانٹ آفس میں ایک نائجیرین ملازم کو پانچ صد پونڈ رشوت دی ہے۔ ہم نے جب انکوائری کی تو پتہ چلا کہ وہاں کوئی نائجیرین ملازم نہیں ہے۔ اس نے فرمایا کہ اس نے مسز بھابیہ (سجاد ظہیر کی بیٹی) کو ایک گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا اور اس نے اسی پاکستانی مہمان خانہ کا چار سو پونڈ کا بل بھی پیش کر دیا ہم نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ موصوفہ اپنے ایک لکھنوی عزیز کے ہاں ٹھہری تھی۔ مسز بھابیہ ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ وہ اس بات کی وضاحت کر سکتی ہیں۔ عاشور کاظمی میرے خلاف یا میرے اس پر عائد کردہ الزامات کے رد میں کوئی اخباری بیان نہیں دے سکتے کیونکہ ان کا میرے خلاف بیان جی ایل سی کے گرانٹ آفیسر کے انٹرویو کو جھٹلانے کے مترادف سمجھا جائے گا۔ موصوف اپنے وکیل سے مشورہ کر چکے ہیں۔ جو کچھ یہاں بیان ہوا ہے یہ صرف اجمال ہے تفصیل نہیں ہے۔ جہاں تک حضرت عاشور کی ذاتی باتوں کا تعلق ہے میں اس سے بحث نہیں کرونگا کہ وہ کتنی شادیاں کرتا ہے کس کس کو بہن بناتا ہے یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ البتہ ایک بار اس کا فون آیا تھا۔ کہنے لگا کہ ''بخش بھائی میں نے آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دیا'' میں نے کہا کہ آپ کے پاس جواب ہوتا تو ضرور دیتے۔ جب مجھے ہارٹ

اٹیک ہوا تو عاشور برمنگھم سے چل کر لندن میں دو بار مجھے دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ اگرچہ اس کی اس عیادت میں خلوصِ نیت شامل نہیں تھا۔ وہ یہ دیکھنے کے لئے آیا تھا بخش لائلپوری مر رہا ہے کہ نہیں۔ یہ مرے تو اس کی جان چھوٹے۔ افسوس کہ میں ابھی تک زندہ ہوں — عاشور صاحب نے آج تک جی ایل سی کو پیش کردہ حساب کتاب کی نقول انجمن کے عہدے داروں کو فراہم نہیں کیں۔ ان حسابات میں ۹ ہزار پونڈ کی گرانٹ اس نے تسلیم کر لی تھی۔ اس نے کھانے اور کرایہ وغیرہ کے جعلی لیٹر ہیڈ بنا کر بل تیار کئے۔ جن فرموں کی طرف سے بل بنانے گئے لندن میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ حسابات کی فراہمی یا انکی اشاعت سے ہر جعل سازی سامنے آئے گی۔

سوال: ۱۹۸۸ء میں آپ کا ایک انٹرویو ''نوائے وقت'' لاہور میں چھپا تھا جس میں آپ نے ڈاکٹر قمر رئیس کو چور کا بھائی گرہ کٹ کہا تھا۔ اس بیان کی ذرا وضاحت کریں؟

جواب: ڈاکٹر قمر رئیس میرے نزدیک کوئی مقدس گائے نہیں کہ خواہ مخواہ اس کی پوجا کی جائے۔ ۱۹۸۴ء میں جب قمر رئیس صاحب فیض مذاکرہ کے سلسلے میں میرے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے انہیں دنوں فیض اکادمی کے صدر مجاہد ترمذی اور فیض اکادمی کے سکریٹری جنرل بخش لائلپوری کے درمیان افتخار عارف کی لگائی ہوئی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ افتخار کی کوشش تھی کہ بخش لائلپوری کو فیض اکادمی سے نکال کر مجاہد ترمذی اور اکادمی کو اپنا

تاج فرمان بنالیا جائے اور فیض مذاکرہ پر اردو مرکز کی مہر لگادی جائے۔ عاشور کاظمی بھی فیض اکادمی کے رکن تھے اور افتخار عارف سے نالاں تھے کیونکہ وہ عاشور کو اور سب کچھ مانتا تھا لیکن شاعر نہیں مانتا تھا۔ جب عاشور کو میرے اور مجاہد ترمذی کے درمیان اختلاف کی خبر ملی تو موصوف فوراً میرے ہاں تشریف لائے اور مجھے مجاہد ترمذی کے خلاف بھڑکانا شروع کردیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر حسن صاحب ہمارے قریب بیٹھے عاشوریات سن رہے تھے۔ عاشور صاحب کے چلے جانے کے بعد قمر رئیس صاحب نے فرمایا "بخش بھائی! عاشور سے بچئے۔ یہ بڑا منافق، مکار اور بددیانت شخص ہے" میرے استفسار پر کہنے لگے کہ "میں ایک دو بار کراچی گیا ہوں اور اس شخص کے بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں" مذاکرہ کے کچھ دنوں بعد عاشور صاحب قمر رئیس کو اپنے گھر لے گئے۔ عاشور صاحب نے انہیں ایسی گیدڑ سنگھی سونگھائی کہ قمر رئیس اٹھتے بیٹھتے عاشور بھائی عاشور بھائی کی گردان کرنے لگے۔ کیونکہ اس زمانے میں عاشور صاحب نے ہمیں اپنا اصلی رنگ نہیں دکھایا تھا۔ اور ہم نے ترقی پسند مصنفین کا لندن میں احیا بھی کر رکھا تھا اور ہمارے درمیان اچھی خاصی قربت تھی لہٰذا قمر رئیس کا عاشور کاظمی کا صبح و شام کلمہ پڑھنا برا نہیں لگا۔ میں نے قمر رئیس کی عاشور کے بارے میں جملہ بازی سے عاشور صاحب کو مطلع کردیا تھا۔ ایک دن عاشور نے مجھے بتایا کہ اس نے ڈاکٹر قمر رئیس کو ہڈی ڈال دی ہے اور اس نے وہ نازیبا جملے نہ صرف واپس لے لئے ہیں بلکہ پورے خلوص کے ساتھ معذرت بھی کردی ہے۔ مزید فرمایا کہ "یہ دہلی والے بھوکوں مر رہے ہیں۔ ایک کباب سے بہل جاتے ہیں۔ اگلے سال ہم نے گولڈن جوبلی منانی ہے۔ ہمیں ڈاکٹر کے تعاون کی ضرورت ہے۔ میں نے انہیں ٹکٹ دینے کا وعدہ بھی کرلیا ہے وغیرہ وغیرہ" پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

لندن گولڈن جوبلی کے بعد جی ایل سی کی گرانٹ کے حوالے سے میں نے عاشور کاظمی کے رویے کے خلاف ڈاکٹر قمر رئیس کے نام ایک بڑا سخت اور طویل خط لکھا جس میں، میں نے قمر رئیس کی کمزوریاں بھی بیان کردیں کہ "آپ نے میرے گھر میں بیٹھ کر عاشور کاظمی کو منافق، مکار اور بددیانت شخص کہا تھا اور اب آپ اس کے ساتھ محبت اور پیار کی پینگیں بڑھا رہے ہو۔ کیوں؟ ڈاکٹر صاحب نے اس جملے کا جواب جن الفاظ میں دیا وہ یہ ہیں "برادرم! ہم آپ جب کسی بے تکلف دوست کی نجی محفل میں بیٹھتے ہیں تو رسمی تہذیب اور RESERVATIONS کی ساری قبائیں اتار کر ہی بے تکلف ماحول میں باتیں کرتے ہیں۔ کبھی ہلکی پھلکی غیبت بھی کرتے ہیں، گالیاں بھی دیتے ہیں، گویا ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کسی ایسے شخص کو جسے وہ پہلی بار مل رہے ہوں۔ منافق، مکار اور بددیانت کہنا ہلکی پھلکی غیبت ہے۔ جی ایل سی کے فنڈ کی خورد برد کے حوالے سے فرماتے ہیں CHIEF ORGANISER کی حیثیت سے انہوں (عاشور کاظمی) نے ابتداً یہ ضروری سمجھا کہ ساری رقم کا انکشاف نہ کریں۔ ان کی

جگہ اگر میں ہوتا تو شاید میں بھی یہی کرتا جو عاشور صاحب نے کیا ہے "تو حضرات! یہ ہے چور کے بھائی گرہ کٹ کا معاملہ جو صاف ہو گیا۔ کند ہم جنس بہ ہم جنس پرواز۔ قمر رئیس صاحب کے جس خط کا میں نے حوالہ دیا ہے میرے پاس محفوظ ہے۔ اگر کوئی دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا ہے۔ قمر رئیس صاحب نے میرے خط اور اپنے خط کی نقول عاشور صاحب کو بھی روانہ کی تھی تاکہ عاشور صاحب انہیں مزید ہڈی ڈالیں تاکہ ان کے "عصری آگہی" اکا کاروبار چلتا رہے۔ قمر رئیس تاشقند جاچکے ہیں اور ہڈی الہٰ باد کی طرف جا چکی ہے۔ "ترقی پسند ادب کا پچاس سالہ سفر" نامی کتاب جسے ڈاکٹر قمر نے مرتب کیا ہے (۱۹۸۸ء) اس پر تین ہزار پونڈ صرف ہونے والی رقم جی ایل سی کے فنڈ سے ہی ماری گئی تھی۔ لندن کی پروگریسو تحریک کا بیڑا غرق کرنے والا اصل شخص ڈاکٹر قمر رئیس ہی ہے۔

سوال: لندن میں بی سی سی آئی (BCCI) بنک کے زیر اہتمام اردو مرکز گیارہ سال قائم رہا جس کے معتمد عمومی افتخار عارف صاحب تھے اور جس کے چرچے بڑی شد و مد کے ساتھ پورے برصغیر کے اردو پریس میں ہوتے رہے، آپ یہ بتائیں کہ لندن میں اردو مرکز نے فروغ اردو زبان کے لئے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے؟

جواب: بی سی سی آئی بنک کا کریا کرم ۱۹۹۱ء میں ہو گیا تھا اور ساتھ ہی اردو مرکز کا۔ غالباً ۱۹۹۲ء میں ایک کتاب بہ زبان انگریزی (BCCI Inside Story) بڑی تحقیق کے بعد لکھی گئی تھی۔ میں نے اس کتاب کو پڑھا تھا۔ میں اس کتاب کے حوالے سے اور اپنے ذاتی مشاہدے کے حوالے سے عرض کروں گا۔ سچ بولنا اور سچ سننا بڑے حوصلے کی بات ہوتا ہے۔ بی سی سی آئی ایک عالمی بنک تھا۔ اس بنک کی کارکردگی اور اس کارکردگی کے اصول کو سمجھنے کے لئے آپ کو ایک پیشہ ور رنڈی کی نفسیات، کارکردگی اور گاہک کو پھانسنے کے لئے اعلیٰ اور ترقی یافتہ حربے اور اس کی کافرانہ اداؤں کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اس بنک کو اہل مغرب نے فراڈ بنک اور PROSTITUTIOIN بنک کا نام بھی دیا۔ اس بنک میں تقریباً نوے فیصد سرمایہ عرب اور باقی ۲۰ فیصد پاکستانی اور بھارتی جنس پرستوں کا تھا۔ پاکستان میں بنک میں ترقی کے مراحل طے کرنے کے لئے بنکرس انسٹی ٹیوٹ کے امتحان پاس کرنے پڑتے تھے۔ چونکہ میں پاکستان کی ایک معروف بنک میں رہا ہوں اس لئے یہ بات میں نے اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر لکھی ہے۔ لندن میں اس بنک کے مطالعہ اور اس کے چند منیجروں سے گفتگو کے دوران پتہ چلا کہ اس نیک نام بنک میں اچھی ملازمت کے لئے موڈرن دلالی کی تربیت لازمی ہے۔ تقریباً ہر بنک منیجر کے لئے یہ لازمی ہوتا تھا کہ وہ متوقع گاہک کی جنسی ترجیحات کی روشنی میں اسے مناسب خدوخال کی طوائف پیش کرے۔ یعنی عربوں کے لئے طوائف کے سینے کا گھیراؤ ناقابل یقین حد تک بڑا اور پاکستانی جاگیرداروں کے لئے قطب مینار کی طرح تیکھا اور اٹھاندار ہونا چاہئے۔ اس کے بعد گاہک کی جیب پر ڈاکہ ڈالا جائے۔

غالباً اسی نفسیات کے پیش نظر اردو مرکز لندن، جس مقام پر قائم کیا گیا تھا وہاں سے لندن کی ہیرامنڈی (SOHO) چند سو گز کے فاصلہ پر تھی۔ لندن تشریف لانے والا ہر ادبی یاتری اردو مرکز کا طواف اس لئے نہیں کرتا تھا کہ یہ کوئی عجوبۂ روزگار ہے بلکہ اس لئے کہ آپ یہاں سے گھر والوں کو مفت فون کر سکتے ہیں۔ کباب، چائے اور بسکٹ کے علاوہ آپ کو ہیرامنڈی کے بالتفصیل کوائف، سکس شاپ، نیوڈ کلبوں کی جانکاری حتیٰ کہ دنیا کی ہر نعمت میسر تھی اور ساتھ ساتھ اردو مرکز کے ذریہ نما کمرے میں فون پر بلوائے گئے چند احباب کے ساتھ مل بیٹھنے کا پروگرام یا کچن میٹنگ ہو جایا کرتی تھی جس کی تصاویر اور تشہیر ساری دنیا کے اخبارات میں نمایاں طور ہوا کرتی تھی۔ ورنہ اردو مرکز جیسی چھوٹی چھوٹی تنظیمیں اور ادبی حلقے کراچی، لاہور اور دہلی کے کونے کونے پر موجود ہیں لیکن ان حلقوں کے ساتھ موڈرن قسم کی ہیرا منڈیاں کہاں ہیں؟ ہمارے معاشروں میں جنسی بھوک بہت ہے۔ یہ کھلا معاشرہ ہے۔ وہ کام جو کہ آپ برصغیر میں رات کی تاریکی میں نہیں کر سکتے یہاں آپ دن کی روشنی میں کر سکتے ہیں۔ پھر بنک کا تربیت یافتہ گائڈ بھی مل جائے تو اسے آپ سونے پہ سہاگا سمجھیں۔ اکثر ادیب ہیرامنڈی سے فارغ ہو کر تازہ دم ہونے کے لئے پھر اردو مرکز میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ افتخار عارف نے یہ خیراتی ادارہ گیارہ سال تک چلایا۔ مثل مشہور ہے کہ کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا۔ لیکن افتخار عارف کو اس دلالی میں تمغۂ حسنِ کارکردگی مل گیا۔ یہ بھی عرض کردوں کہ اردو مرکز ہر ایرے غیرے ادیب کی پذیرائی نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ یہ کام عین تجارتی اصولوں کے مطابق کیا کرتا تھا کہ کون کتنی تشہیر کا باعث بن سکتا ہے اور کون سا ادیب محض خالی کارتوس ہے۔ مختصر یہ کہ ایک پیشہ ور رنڈی جس طرح اپنے پچکے ہوئے گالوں کو سرخی پوڈر کی تہوں میں چھپایا کرتی ہے اور اپنے ڈھلتے جسم اور سال خوردہ حسن کے لئے تشہیری حربے استعمال کرتی ہے کم و بیش حضرت افتخار عارف نے بھی ویسے ہی تشہیری حربے بڑی کامیابی سے استعمال کئے اور کامیاب ٹھہرے۔ اردو مرکز نے کرامویل ہسپتال کو بھی تشہیری حربے کے طور پر استعمال کیا۔ ہر قابلِ ذکر نقاد نے متوقع ہارٹ اٹیک کے پیش نظر افتخار عارف کی شاعری کو پر لگائے۔ کئی ایک کے میڈیکل ٹسٹ ہوئے اور ہر ایک نے افتخار عارف کی شان میں قصیدہ خوانی کی۔ حالانکہ افتخار عارف کے پاس کوئی فنانشل پاور نہیں تھی۔ کرامویل ہسپتال اور اردو مرکز کے نگراں حضرت الطاف گوہر اور ان کے صاحب زادے تھے۔ افتخار عارف اپنے آپ کو مڈل مین ظاہر کر کے اپنا تشہیری الو سیدھا کر لیا کرتے تھے۔ اردو مرکز کے سارجنٹ میجر نے گیارہ سال یہ رٹ لگائے رکھی کہ برطانیہ اردو کا تیسرا مرکز ہے لیکن جب اردو کے تیسرے مرکز کے ادیبوں کی بات چھڑتی تو آپ نے فرمایا کہ بس جہاں میں ہوں، میری بجیا (زہرا نگاہ) اور میرے گورکھپوری بڑے بھائی ہیں۔ یہ وہی بڑے بھائی ہیں جس نے افتخار عارف کو اپنے مضمون میں لکھنؤ کا بچہ سقہ کہا تھا اور زہرا نگاہ کے شوہر

ماجد علی امارات اور بنک (BCCI) کے مال مشیر بھی تھے اور اس بنک کی بنیادیں رکھنے والوں میں سے بھی تھے، عارف کے بیانات تضاد کا شکار تھے اگر چہ برطانیہ اردو کا تیسرا مرکز ہے تو پھر ان تینوں بہن بھائیوں کے علاوہ اور بھی شعر و ادب سے وابستہ سینکڑوں لوگ ہونے چاہئیں۔ اردو مرکز نے اپنے گیارہ سالہ دور میں کوئی ۲۵ لاکھ پونڈ خرچ کئے ہیں۔ صرف افتخار عارف کی تنخواہ ۵۵ ہزار پونڈ تھی اور اس کے ساتھ سرکاری خرچ پر کار بھی ملی ہوئی تھی۔ اس وقت برطانیہ کی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر کی سالانہ تنخواہ ۵۱ ہزار پونڈ تھی۔ میرا سوال یہ ہے کہ ۲۵ لاکھ پونڈ کی خطیر رقم میں سے اردو مرکز نے برطانیہ کے ادیبوں اور اردو زبان کے فروغ کے لئے کیا کیا؟ کیا اردو زبان کا کوئی قاعدہ پاکستانی بچوں کے لئے شائع کیا؟ ہرگز نہیں۔ کیا اردو مرکز نے یہاں کے شاعروں کے کلام کا کوئی انتخاب شائع کیا؟ ہرگز نہیں۔ کیا اردو مرکز نے کہیں پر بچوں کے لئے اردو کلاسز کا اہتمام کیا؟ ہرگز نہیں۔ کیا اردو مرکز نے کوئی اردو کا ادبی مجلہ، ہفت روزہ یا ماہوار شائع کیا؟ ہرگز نہیں کیا۔ اردو مرکز نے غالب، اقبال یا فیض کوئی بین الاقوامی مذاکرہ کیا؟ ہرگز نہیں اگر ان ادبی کاموں میں سے کوئی بھی کام نہیں کیا تو دنیا بھر میں شور مچانے کا جواز کیا ہے۔ انگلستان میں اردو شاعری کا پہلا انتخاب محمد شریف بقا نے شائع کیا اور میں اس کا معاون تھا۔ دوسرا انتخاب جوہر زاہری نے شائع کیا۔ ہم نے اخراجات اپنی اپنی جیبوں سے ادا کئے۔ اردو، ہندی اور پنجابی شاعری کے دو

انتخاب چمن لال چمن (ریڈیو فن کار) کی ذاتی کوششوں سے شائع ہوئے۔ اخراجات ہنسلو کونسل نے برداشت کئے۔ چمن لال چمن کی میں نے صرف اخلاقی مدد کی تھی۔ اردو کا ادبی جریدہ ماہنامہ ''صدا'' اقبال مرزا نے جاری کیا۔ پاکستانی بچوں کے لئے اردو کا پہلا قاعدہ محمد شریف بقا نے ترتیب دیا اور دوسرا قاعدہ محمود ہاشمی نے شائع کیا۔ اردو شاعری کے حوالے سے پہلا ادبی کام جو کہ بین الاقوامی سطح پر ہوا وہ فیض مذاکرہ تھا۔ یہ مذاکرہ مجاہد ترمذی اور بخش لائلپوری نے کیا جس میں ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر ایوب مرزا اور ڈاکٹر فشر نے شرکت کی۔ اس دو روزہ مذاکرہ پر تقریباً آٹھ ہزار پونڈ خرچ ہوئے یہ اخراجات مجاہد ترمذی نے برداشت کئے۔ دوسرا بڑا کام جو عالمی سطح پر ہوا وہ ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی تھی جس میں ساری دنیا سے تقریباً ساٹھ کے قریب دانشوروں نے حصہ لیا۔ برطانیہ اور مغرب کے افسانہ نگاروں کے افسانوں اور کہانیوں سے انتخاب شاہدہ احمد لندن اور سعید انجم اوسلو نے شائع کئے۔ اگر افتخار عارف نے اردو مرکز کے ذریعہ نما کرے میں کچھ منتخب احباب کے اعزاز میں تقریبات کا انعقاد کیا یا لندن یونیورسٹی میں چند تقاریب منعقد کیں تو یہ کون سا تیر مارا ہے۔ لندن میں مشاعرے تو افتخار عاف کے لندن وارد ہونے سے پہلے بھی ہوتے تھے۔ اس کے کریا کرم کے بعد بھی ہو رہے ہیں بلکہ پہلے دو برسوں میں تو عالمی سطح پر مشاعرے ہوئے جن کا انعقاد شاہد علی سید اور مجاہد علی سید نے کیا تھا۔ یہ وہی مشاعرے تھے جن میں سے ایک

مشاعرہ میں ایک پانچ ستارا ہوٹل میں زائد المعیاد قیام کی بنا پر جناب احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز کو ہوٹل کی انتظامیہ نے ہوٹل کے بل کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں روک لیا تھا اور پاکستان ہائی کمیشن کے افسر تعلقات عامہ سید مظفر الحسن نے ہائی کمیشن کے پبلک فنڈ سے بل ادا کر کے ان مشاہیر شعراء کی گلوخاصی کروائی تھی۔ اس سلسلے میں روزنامہ جنگ لندن کی فائلوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ان حضرات نے ابھی تک یہ رقم حکومت پاکستان کے سرکاری خزانے میں جمع نہیں کروائی۔ ہم انہیں بھی سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ قومی نادہندگان کی فہرست میں شامل سمجھتے ہیں۔ اگر انہوں نے یہ قومی قرضہ چکا دیا ہے تو انہیں چاہئے کہ ادائیگی کی رسید اخبارات میں شائع کروائیں۔ اردو مرکز نے میراجی، جالب اور فیض کے کلیات ضرور شائع کئے تھے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان شعراء کا تعلق برطانیہ سے نہیں تھا۔ یہ کام بھی انہوں نے اپنی تشہیر کے لئے کیا۔ فیض کے مجموعے "سارے سخن ہمارے" کی قیمت ۷۵ پونڈ فی جلد رکھی گئی۔ انہوں نے فیض کے کلام کو کیش کیا اور فیض صاحب کو ایک ڈیکوریشن پیس کے طور پر استعمال کیا۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ اردو مرکز اور بنک کی سرمایہ دار چنڈال چوکڑی یا ایلیٹ کلاس جس میں یوسفی صاحب زیادہ نمایاں تھے فیض صاحب کے شعری نظریات کو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن انہیں فیض صاحب کی شرافت بہت پسند تھی گویا پاکستان میں قلیوں اور محنت کشوں میں سے انہیں کوئی شریف آدمی نظر نہیں آتا تھا۔

مختصر یہ کہ ۲۵ لاکھ پونڈ کی رقم کسی گدھے پر خرچ کر دی جائے تو آپ اسے غالب و اقبال سے بڑا شاعر ثابت کر سکتے ہیں۔ افتخار عارف تو بہر حال ہر گدھے سے برتر انسان ہے۔ افتخار عارف کی ذرا شرارتوں کا احوال بھی سن لیں۔

۱۹۸۴ء کے ماہ جون کی غالباً ۶ تاریخ کو فیض اکادمی کے زیر اہتمام فیض مذاکرہ فیض کی مشاورت سے ہونا قرار پایا تھا۔ یہ مذاکرہ لندن یونیورسٹی کے اشتراک سے ہو رہا تھا۔ دعوت نامے جاری ہو چکے تھے۔ افتخار عارف لندن میں بابائے شعر و ادب کی مسند پر براجمان ہو چکے تھے۔ موصوف نے سب سے پہلے مجاہد ترمذی سے فیض مذاکرہ کی مالی اعانت کرنے کا وعدہ کیا بشرطیکہ بخش لائلپوری جیسے اجڈ، اکھڑ اور منہ زور شخص کو فیض اکادمی سے نکال باہر کیا جائے۔ میری بجائے اس نے شاہد علی سید کا نام دے رکھا تھا۔ کیونکہ شاہد علی سید افتخار عارف کے تابعداروں کی فہرست میں شامل تھا۔ لیکن یہ اپنے منصوبہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ موصوف نے لندن یونیورسٹی کے اس بھارتی پروفیسر کو کوئی لالچ دے کر ورغلا دیا جس کی وجہ سے لندن یونیورسٹی کا تعاون حاصل ہوا تھا بلکہ اس نے اپنی طرف سے روزنامہ جنگ میں فیض مذاکرہ کی منسوخی کی خبر بھی لگوا دی اور نیوی لزرڈ (فیض کی مترجم) جو کہ اس مذاکرہ میں شرکت کے لئے، امریکہ سے آئی تھی اسے بھی واپس جانے کا حکم صادر کر دیا۔ میں نے روزنامہ کے ایڈیٹر سے جب اس خبر کی وضاحت مانگی تو اس نے فرمایا کہ "مالکوں کا

حکم ہے کہ الطاف گوہر، ہمایوں گوہر اور افتخار عارف سچ کہیں یا جھوٹ، اسے ضرور شائع کرو۔" انہیں دنوں ایوب مرزا صاحب بھی یہاں آچکے تھے۔ ہم سب نے از سر نو لندن یونیورسٹی کے پروفیسر صاحب پر دباؤ ڈالا، قانونی کاروائی کی دھمکی دی اور وہ از سر نو تیار ہو گیا۔ ان دنوں فیض صاحب BCCI کی مشاورت میں شامل تھے وہ بنک کی ٹکٹ پر تشریف لائے تھے۔ افتخار عارف نے انہیں ائیر پورٹ سے وصول کر کے لندن کے چرچل ہوٹل میں ٹھہرا دیا تھا۔ فیض صاحب نے مجھے اور مجاہد ترمذی کو ہوٹل میں گفت و شنید کے لئے بلوایا۔ افتخار عارف میرے خلاف فیض صاحب کے کان بھر چکے تھے۔ ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے کہ افتخار عارف اپنے آپ کو زخمی محسوس کر رہے ہیں۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم افتخار عارف اور الطاف گوہر کو مذاکرہ میں شامل کر کے انہیں خوش کیوں نہیں کر لیتے۔ میں نے کہا کہ فیض! آپ کو تو یہ بھی علم نہیں کہ آپ کو کون کون سا سرمایہ دار چوس رہا ہے۔ اب فصل پک چکی ہے اور جاگیردار اسے سمیٹنا چاہتے ہیں۔ فیض اکادمی آپ کے نام سے منسوب ہے۔ آپ مجھے ڈس مس کر دیں بصورت دیگر اکادمی پر ان لوگوں کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔ کیونکہ فیض اکادمی ترقی پسند تحریک کی علامت ہے۔ نشانِ امتیاز ہے۔ آپ کو شاید بڑی سوسائٹی میں بیٹھنے کا شوق ہے، ہمیں نہیں۔ آپ کے نظریات کے وارث ہم مزدور ہیں۔ جاگیردار، سرمایہ دار اور ان کے گماشتے آپ کے نظریات کے وارث نہیں ہو سکتے۔ میری جذباتی گفتگو سن کر فیض صاحب خاموش رہے۔ اور فیض مذاکرہ ۸۔۹ جولائی کو اپنے اختتام پر پہنچا۔ اس مذاکرہ کا آخری پارٹ مشاعرہ تھا اور یہ مشاعرہ فیض صاحب کا آخری مشاعرہ ثابت ہوا۔ اس مشاعرہ میں احمد فراز نے شرکت کرنے کی بجائے وہ رات اپنی کسی داشتہ کے پہلو میں گزاری تھی۔ میں نے افتخار عارف کی شخصیت کے حوالے سے سارے منفی رویے بیان کر دئیے ہیں۔ اب ذرا ان کی ادبی خدمات کا بھی ذکر ہو جائے تاکہ مجھ پر یک رخی کا الزام نہ آنے پائے۔ اور انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔ افتخار عارف بے ضرر انسان ہیں بڑے پیار سے عرب سٹائل میں مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں ویسے ان کی چوما چاٹی کس آف ڈیتھ کے مترادف ہے۔ حضرت افتخار غالباً ۱۹۷۶ء میں ایک بہت بڑے شیعہ رہنما کی سفارش پر لندن آئے تھے۔ بنک کے شعبہ میں ان کی تربیت ہوئی تھی۔ موصوف نالائق تھے چل نہ سکے۔ بنک سرمایہ داروں کے ساتھ ساتھ ادیبوں اور دانشوروں پر بھی اپنا قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ لہٰذا اردو مرکز قائم ہوا اور حضرت افتخار عارف کو مرکز کا ادبی دلال بنا دیا گیا۔ سب سے پہلے اس نے اردو کی انجمنوں کی توڑ پھوڑ شروع کی۔ ناکامی کی صورت میں موصوف نے ان ادبی اداروں میں اپنے آدمی پلانٹ کرنے کی کوشش کی جس میں ناکامی ہوئی۔ اس آزاد معاشرے کے ادیبوں کو غلام بنانا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ ۱۹۸۳ء میں آپ نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام کا اجراء کیا۔ اس مجموعہ کے دیباچے جن کی لمبائی پچاس گز سے کم نہ ہوگی فیض صاحب اور اپنے

خاندانی بھائی گوپی چند نارنگ سے لکھوائے۔ گوپی چند نارنگ ہندوؤں کی کائستھ ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ افتخار عارف نے گوپی صاحب کو بتایا کہ میرے اب وجد بھی کائستھ تھے پتہ نہیں انہوں نے اسلام کا چولا کیوں زیب تن کرلیا۔ کتاب کی اشاعت سے چھ ماہ پیشتر ہی ان دیباچوں کی فوٹو کاپیاں تقسیم ہونی شروع ہوگئیں۔ اردو مرکز کی فوٹو کاپی انگ مشین اس مقصد کے لئے صبح وشام چلا کرتی تھی۔ کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی دیباچے مختلف جرائد کی زینت بن گئے۔ رسم اجراء پر موصوف نے اپنے خرچ پر کئی ایک نقاد بلوا رکھے تھے۔ لوگ پھولوں کے گلدستے پیش کررہے تھے۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ یہ رسم اجراء نہیں بلکہ بابا فرید شکر گنج کا عرس ہورہا ہے۔ موصوف نے اتنی غزلیں نہیں لکھیں جتنے تعزیتی بیان جاری کئے۔ ٹیلی فون کے وسیلے سے برصغیر کے ہر اردو ادیب کے بارے میں اسے تازہ ترین اطلاع ملتی رہتی تھی۔ کون ہسپتال میں داخل ہے، کتنے سانس باقی ہیں، کب مررہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسی حساب سے عارف صاحب تعزیتی بیان لکھ کر رکھ لیتے تھے اور وقت ضرورت وہ بیان بغیر کسی تاخیر کے روزنامہ جنگ کو جاری ہوجاتا تھا۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوا کہ شاعر نے مرنے سے انکار کردیا اور وہ صحت یاب ہوکر صحیح سلامت گھر آگیا۔ اب انہیں اس کے حق میں لکھا ہوا تعزیتی بیان تلف کرنا پڑتا تھا۔ مرنے والے کی تصویر میسر ہو یا نہ ہو بیان کے ساتھ ان کی تصویر چھپ جاتی تھی۔ فیض نے کافی عرصہ بیروت میں گزارا تھا۔ اسی دوران وہ کئی دفعہ لندن بھی تشریف لائے تھے ان دنوں فیض صاحب اردو مرکز کے قبضے میں تھے۔ افتخار عارف اخبار میں خبر لگاتے ہیں ''فیض صاحب نے بیروت سے چلتے وقت ایئر پورٹ سے بذریعہ فون اپنی تازہ غزل کا فلاں شعر سنایا۔ پھر خبر آتی ہے کہ فیض صاحب نے لندن ایئرپورٹ پر اتر کر اسی غزل کے فلاں فلاں شعر انہیں سنائے'' ان خبروں سے لوگوں کو یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ فیض صاحب اپنے کلام پر افتخار عارف سے مشورہ طلب کرتے ہیں، میرے خیال میں اگر ان دنوں موبائل فون کا رواج ہوتا تو عین ممکن تھا کہ فیض صاحب ٹائلٹ میں رفع حاجت کے دوران بھی افتخار عارف کو شعر سنا کر مشورہ طلب کیا کرتے۔ افتخار صاحب جب صالح نقوی اور آغا حسن عابدی کے دربار میں حاضر ہوتے تو مولا علیؑ کی خوبیاں بیان کرتے اور سنیوں کو کوسا کرتے اور جب الطاف گوہر کے دربار میں جاتے تو حضرت عمر فاروقؓ پر تقریر فرماتے تھے۔ یعنی گنگا گئے تو گنگارام، جمنا گئے تو جمنا داس۔ شیعوں میں شیعہ اور سنیوں میں سنیا۔ انسان کو حصولِ رزق کی خاطر کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ~ سگ زمانہ ہیں، یہ کیا اور ان کی ہجرت کیا۔ لندن میں تھے تو اکثر مجھ سے فرمایا کرتے تھے ''بخش بھائی علامہ اقبال تو بس سٹیٹ منٹ کے شاعر ہیں'' اب جب سے علامہ اقبال کے پاکستان میں نوکری ملی ہے علامہ کے بارے میں ان کے نظریات بدل گئے۔ اب موصوف حضرتِ علامہ کا نام سن کر کرسی سے اٹھتے وقت دوبار گرجاتے ہیں اور اس کے بعد کلام اقبال کو سجدہ کرتے ہیں۔ ۱۹۹۱ء اردو مرکز

کے کریا کرم کے بعد جامِ صادق (مرحوم کی سفارش سے افتخار عارف کو پاکستان ہائی کمیشن میں غالباً افسر تعلقات عامہ کی نوکری مل گئی تھی لیکن ہمارے چند اردو کالم نویسوں نے افتخار کو پاکستان دشمن اور ہندوستان کا ایجنٹ قرار دے دیا اور ان کی ملازمت کا پروانہ منسوخ ہو گیا۔ بعد ازاں وہی کالم نگار اور اس کے خلاف ادارئے لکھوانے والے اس کے نیاز مندوں میں شامل ہو گئے۔ ان دنوں میں نے افتخار صاحب کے حق میں بیان دیا تھا کہ افتخار عارف محب الوطن ہیں۔ میرے ان کے بارے میں نظریات اب بھی وہی ہیں۔ لیکن افتخار عارف پاکستان کی محبت میں کبھی کبھی پٹری سے اتر جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ یہ صورتِ حال ہندوستانی یاترا کے وقت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر دہلی اور لکھنؤ کی محفلوں میں پڑھا جانے والا ان کا ایک شعر حاضر خدمت ہے!

بس ایک خوف، کہیں دل یہ بات مان نہ لے
یہ ارضِ غیر ہمیں آشیاں سے پیاری ہے

شاعر کو یہ خدشہ ہے کہ کہیں ان کے دماغ کی طرح ان کا دل بھی اس حقیقت کو تسلیم نہ کر لے کہ یہ ارضِ غیر (یعنی سرزمینِ ہندوستان) آشیاں (یعنی پاکستان) سے پیاری ہے۔ کیونکہ آشیاں پر تو بجلی بھی گر سکتی ہے لیکن چمن تو قائم ہی رہتا ہے، کسی دوسری جگہ آشیانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس شعر کو آپ اہلِ ہند سے داد خواہی کا ذریعہ ہی سمجھیں ——— ورنہ افتخار عارف پاکستان کے بڑے ہی "محب الوطن" ہیں اور بے ضرر انسان ہیں۔ ماہ فروری ۱۹۹۷ء میں جب میں براستہ اسلام آباد لاہور گیا۔ افتخار عارف کو ڈاکٹر انعام الحق کی معرفت میری آمد کا علم ہوا تو موصوف نے فون کر کے اور اپنا ڈرائیور بھیج کر مجھے اپنے دفتر میں بلوالیا۔ موصوف بڑی محبت سے پیش آئے۔ عرب سٹائل میں چوما چاٹی بھی کی۔ کہنے لگے کہ "بخش بھائی یہاں مجھے صرف اٹھارہ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ اتنی رقم فلاں مد میں نکل جاتی ہے اور اتنی فلاں میں۔ بس بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ سوچا کہ اسے کہہ دوں کہ میاں اگر تم پاکستان نہ آتے تو لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن پر قلی کی وردی میں ہوتے۔ زیادہ زور مارتے تو تانگہ بان ہوتے اور زیادہ "چھال" مارتے تو پنواڑی ہوتے۔ کیونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اسی قسم کے کام مخصوص ہیں لیکن میں نے سوچا کہ مبادا اس کی دل شکنی ہو گی۔ یہ بات کہہ نہ سکا اور شاید آئندہ ملاقات پر بھی نہ کہوں۔

سوال: لندن کے سیاسی حلقوں میں آپ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ پاکستان دو قومی نظریہ کے تحت وجود میں آیا تھا اور اب پاکستان کے اکثر دانشور محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان ایک ناکام ریاست ہے۔ آپ کے محسوسات کیا ہیں؟

جواب: جیسا کہ یہ داستان بیان کر چکا ہوں کہ میں نے پاکستان کے لئے جسمانی طور پر مار کھائی تھی۔ میں تو "پاکستان ایک ناکام ریاست" کا جملہ سننا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ ویسے بھی مجاہد بھائی یہ ایک خالص سوال ہے۔ اگر چہ میں اس گفتگو کو سیاسی رنگ نہیں دینا چاہتا لہٰذا اس ضمن میں صرف چند باتیں عرض کروں گا۔ پاکستان بغیر

کسی جانی قربانی کے ہمیں ہندو ذہنیت سے تحفتاً مل گیا تھا۔ ہم نے پاکستان کے لئے جانی قربانی صرف انتقالِ آبادی کے وقت دی تھی۔ حصولِ آزادی کے وقت نہیں دی تھی۔ پاکستان نہ جناح صاحب نے بنایا تھا نہ ہی علامہ اقبال نے۔ جناح صاحب ہندوستان کے سیاست دانوں میں سب سے زیادہ دور اندیش اور سیاسی فکر کے مالک تھے۔ وہ متحدہ ہندوستان پر یقین رکھتے تھے کیونکہ وہ سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ برطانیہ جرمنی کے ہاتھوں معاشی طور پر تباہ ہو چکا ہے۔ انہیں علم تھا کہ امریکی مارشل پلان میں برطانیہ پر ہندوستان چھوڑنے کا دباؤ ہے۔ لہٰذا نہ وہ خود جیل گئے نہ ہی انہوں نے جیل جانے کی گاندھی جی کی حکمتِ عملی پر صاد کیا۔ پاکستان اگر قربانیوں سے حاصل ہوتا تو ہمیں اس کی قدر ہوتی۔ پاکستان دراصل کانگریس کے ہندو ذہنیت کے حامل سیاستدانوں کے حمل کا نتیجہ تھا۔ جناح صاحب نے اسقاطِ حمل کا نسخہ بھی تجویز کیا لیکن پنڈت نہرو نہیں مانے۔ انہوں نے جناح صاحب کو پاکستان کا اسلامی بچہ جننے پر مجبور کر دیا۔ جناح صاحب کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کانگریس نے جناح صاحب کو دو قومی نظریہ اپنانے پر مجبور کر دیا۔ دو قومی نظریہ بنگلہ دیش کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد باطل ہو گیا تھا۔ ہم بڑی ڈھیٹ قوم ہیں۔ دو قومی نظریہ کی آج بھی رٹ لگائے جا رہے ہیں۔ ہم زمینی اور زمانی حقائق کو تسلیم کرنے کا شعور نہیں رکھتے۔ دنیا بھر کے مسلمان ایک ملت سے تو تعلق رکھتے ہیں ایک قوم سے ہرگز نہیں۔ بیس کروڑ مسلمان بنگلہ دیش میں موجود ہیں۔ دنیا میں ان کی شناخت بنگلہ دیشی ہے۔ پندرہ کروڑ مسلمان ہندوستان میں موجود ہیں۔ ان کی بین الاقوامی شناخت بھارتی ہے۔ چودہ کروڑ مسلمان خطۂ پاکستان میں بستے ہیں۔ شناختی کارڈ کے مطابق یہ پاکستانی ہیں۔ پاکستان کا قومی شناخت کارڈ چند صد روپے کی رشوت سے مل جاتا ہے۔ وگرنہ پاکستان میں سندھی، پنجابی، بلوچی، پختون اور کاشمیری الگ الگ پہچان پیش کر رہے ہیں اور وہاں ایک قوم مہاجروں کی بھی موجود ہے۔ گویا دو قومی نظریہ اب آٹھ قومی نظریہ بنتا جا رہا ہے۔ یہ سب پاکستان کے کرپٹ اور نااہل سیاست دانوں کا کرشمہ ہے۔ سندھ، پنجاب، بلوچستان سرحد کے خان، سردار اور دیگر جاگیرداروں نے جناح صاحب کی لیڈر شپ کو اپنی جاگیریں بچانے کے لئے قبول کیا تھا اسلام کے لئے ہرگز نہیں۔ جناح صاحب نے انہیں لوگوں کو کھوٹے سکے کہا تھا۔ بھارت پاکستان سے چھ گنا بڑا ملک ہے وہاں کا وزیرِ اعظم اور دیگر سیاست دان سات فٹ لمبی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ ہمارے حکمران اور دیگر سیاست دان پندرہ فٹ لمبی گاڑیوں اور پجارو وغیرہ میں سفر کرتے ہیں۔ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ ایک مدت سے چھٹے ڈاکوؤں کی اس بدنصیب قوم پر حکمرانی ہے۔ تمام سیاسی جماعتیں ایک ہی کرپٹ فلسفے کی کڑیاں ہیں۔ فیوڈل حکمرانوں کے نزدیک پاکستان کے آئین کی حیثیت ایک ٹائلٹ پیپر سے زیادہ نہیں۔ سرمایہ دار مافیا پیسے کے زور پر عدالتوں، وکیلوں اور جرنیلوں کو خرید سکتا ہے۔ پاکستانیوں کی زندگی کا ہر

شعبہ کرپشن کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ کرپشن اوپر سے آئی ہے۔ لوٹ مار کا کوئی حساب کتاب نہیں۔ محتسب بھی اس کشتی کے سوار ہیں۔ احمقانہ اور ناقابل اعتبار بیانات کی بھرمار ہے۔ دانشور، ادیب اور شعراء اور صحافی بھی اندھے ہو چکے ہیں۔ جو چشم بصارت رکھتے ہیں ان کو اندھا بنادیا جاتا ہے۔ مسلمان حکمرانوں کا مزاج کبھی جمہوری نہیں رہا۔ ان کے مزاجوں میں آمریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ہماری جمہوریت اہلِ مغرب کی صرف نقالی ہے اور کھلا فراڈ ہے۔ ارضِ پاکستان پر ڈاکوؤں اور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی مافیا کے گناہوں کا بوجھ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ سفینۂ قوم کسی وقت بھی غرق ہو سکتا ہے۔ قومی نجات کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ لوگ کسی لینن کسی موزے تنگ کے انتظار میں ہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

سوال: آپ بھارت اور پاکستان کے درمیان امن کے خواہاں ہیں۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے بغیر دونوں ملکوں کے درمیان امن و آشتی کی فضا کس طرح قائم ہو سکتی ہے؟

جواب: مسئلہ کشمیر ایک انگریز گورنر کی بددیانتی کا نتیجہ ہے۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے عشق پنڈت نہرو کیا کرتے رہے لیکن اس گورنر جنرل نے سزا کشمیریوں اور مسلمانوں کو دی۔ مسئلہ کشمیر ۱۹۶۲ء سے پہلے پرامن اور کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق حل ہو سکتا تھا لیکن کشمیری عوام کی بے حسی اور پاکستان کے نااہل جاگیرداروں کی سیاست نے اس مسئلہ کو خراب کر دیا۔

حضرت ذوالفقار بھٹو نے شملہ معاہدہ کر کے اس مسئلہ سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ اب یہ مسئلہ بھارت اور کشمیریوں کے درمیان ہے۔ اس مسئلہ کا تیسرا فریق پاکستانی فوج ہے۔ مسئلہ کشمیر کا اگر کوئی حل ہوتا ہے تو پاکستانی فوج کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ پاکستانی فوج کے لئے اس مسئلہ کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ موجودہ دور میں ہندوستان پاکستان پر اور پاکستان ہندوستان پر قبضہ نہیں کر سکتے اگر یہ مسئلہ حل ہوتا ہے تو کشمیری پاکستان کے لئے ایک اور مسئلہ پیدا کریں گے۔ یہ کشمیری ۱۹۴۷ء والے کشمیری نہیں رہے۔ پاکستان کے ساتھ کشمیریوں کے جذبات ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دیتا ہے لیکن بھارت کی چھ لاکھ مسلح افواج کشمیریوں کو فتح نہیں کر سکی۔ پاکستان خطۂ کشمیر کو اپنی شہ رگ قرار دیتا ہے جب کہ عرصۂ پچاس سے پاکستان اپنی اس شہ رگ کے بغیر سانس لے رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان ایک ہی دھرتی کی پیداوار ہیں۔ دونوں کی ثقافت، تہذیب، رسم و رواج، کھانے پینے کے آداب، رہن سہن، شکل و صورت کے خد و خال، عادتیں، لباس اور زبانیں مشترک ہیں۔ دونوں کی تہذیب و ثقافت کے ڈانڈے موہنجوڈرو، ہڑپہ اور ٹکسلہ سے ملتے ہیں۔ دونوں کے منہ میں ایک ہی زبان ہے۔ دونوں اس دھرتی سے پیدا ہونے والے جڑواں بھائی ہیں۔ ان کا تہذیبی ورثہ ایک ہے۔ ایک کا نام رام ہے تو دوسرے کا رحیم ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کا بابل، نینوا اور اہرامِ مصر سے اور عرب و عجم سے نہیں بلکہ بھارت سے رشتہ ہے

اور یہ رشتہ ایک ہزار سال پرانا ہے۔ اگر محمد بن قاسم کے عہد سے لے کر مغلیہ اور برطانوی دور تک ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں تو پھر اس جمہوری عہد میں ہم مذہبی نفرت کی دیواریں گرا کر بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری کیوں نہیں کر سکتے۔ قوم کے اجزائے ترکیبی کی موجودہ دور میں اصل بنیاد ثقافت اور زبان کا رشتہ ہے، مذہبی عقائد کا رول وہ نہیں رہا جو کہ چند صدیوں پیشتر ہوا کرتا تھا۔ مذہبی تنگ نظری اور متعصب اذہان کو بدلنے کا کام سیاسی قیادت اور دونوں ملکوں کے ادیب، شاعر، صحافی اور دانشور کر سکتے ہیں۔ صرف جذبۂ صادق کی ضرورت ہے۔ بنگلہ دیش، بھارت اور پاکستان ایک تسبیح کے دانے ہیں۔ انہیں محبت اور پیار کی ایک ہی لڑی میں رہنا چاہئے۔ یہی ہماری دعا ہے اور یہی ہمارا جذبہ ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ پاکستان کی زمین میں عرب و عجم کی مصنوعی کاشت نہیں ہو سکتی۔ یہ زمین اور یہاں کی آب و ہوا اور موسم کا مزاج اس غیر ملکی تہذیبی کاشت کاری کے لئے سازگار نہیں ہے۔ ہزار سالہ تجربہ اس کی شہادت دیتا ہے۔

سوال: علامہ اقبال کے بعد کچھ احباب فیض صاحب کو اور کچھ احمد ندیم قاسمی کو بڑا شاعر مانتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: آفتاب حسین صاحب آپ کی خوبصورت غزلیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا ادبی مطالعہ بڑا گہرا ہے۔ آپ کے سوال کا دو ٹوک جواب یہ ہے کہ فیض صاحب سے ان کے ہم عصر شعرا کو وہی نسبت ہے جو ایک دریا سے کسی ندی نالے کو ہو سکتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے عزیز و اقارب یعنی منہ بولی بیٹیاں اور بہنیں اور ان کے چند نیاز مند قاسمی صاحب کو بڑا شاعر بنانے کے در پے ہیں اور دوسری طرف تمام ملکوں میں پھیلی ہوئی احمد فراز کی داشتائیں فراز صاحب کو بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ بڑا شاعر وہ ہوتا ہے جو بڑا اور تازہ ادب تخلیق کرتا ہے۔ وہ کسی ادبی پراپگنڈے کا سہارا نہیں لیتا اور نہ ہی خود اپنے منہ میاں مٹھو بنتا ہے۔ ایک بار میرے ہاں فیض صاحب سے نمبر حاصل کرنے کے شوق میں ایک صاحب نے کہا ”فیض صاحب! حفیظ جالندھری آپ کو بہت برا بھلا کہہ رہے تھے اور آپ کی شاعری کا تمسخر اڑا رہے تھے تو فیض صاحب نے خفگی کے عالم میں جواب دیا ”بھئی حفیظ ہمارے بزرگ ہیں۔ رتبہ میں وہ ہم سے بڑے ہیں۔ انہیں یہ سب کچھ کہنے کا حق ہے“ اور وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر بیٹھ گئے۔ فیض صاحب نے گلشن ادب میں اس وقت نئی طرز فغاں ایجاد کی جب اس گلشن میں الو بول رہے تھے۔ فیض صاحب ایک عہد ساز شاعر تھے۔ قاسمی صاحب کو خوش ہونا چاہئے کہ وہ فیض صاحب جیسے بلند مرتبت شاعر کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے ہم عصر ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ کے حوالے سے ادب میں تین اہم موڑ نظر آتے ہیں۔ پہلا موڑ یا پہلے سنگ میل پر اسد اللہ غالب، دوسرے پر علامہ اقبال اور تیسرے پر فیض احمد فیض کھڑے نظر آتے ہیں۔ مقامِ افسوس یہ ہے کہ احمد ندیم قاسمی کسی موڑ کے آس پاس

بھی دکھائی نہیں دیتے۔ میں ادب کا قاری ہوں اور اپنے حافظے کے زور پر غالب، اقبال اور فیض کے درجنوں اشعار سنا سکتا ہوں لیکن قاسمی صاحب کا ایک شعر بھی میرے حافظے کی گرفت میں نہیں آسکا۔ بہر حال میں اس ضمن میں اپنے حافظے ہی کو مورد الزام ٹھہراتا ہوں۔ بقول ظفر اقبال قاسمی صاحب کے ہاکی بردار اُن کے بارے میں بڑے بڑے دعوے تو پیش کرتے ہیں لیکن دلیل کوئی نہیں۔ قاسمی صاحب کے ایک نیاز مند فارغ بخاری نے لندن میں مجھے قاسمی صاحب کا ایک مجموعۂ دیا تھا۔ اس کا نام تھا ''دوام''۔ کہنے لگے کہ اس مجموعہ کا نام کتابت کی نذر ہوگیا ہے۔ تم اسے ''دو آم'' پڑھنا اور سنبھل کر پڑھنا۔ یہ آم بڑے کھٹے آم ہیں۔ گلا خراب ہونے کا سخت اندیشہ ہے۔ قاسمی صاحب کے ایک دوسرے نیاز مند نے امریکہ میں جا کر بیان دیا تھا کہ قاسمی صاحب کی طبعی عمر تو شاید سو سال تک چلے لیکن اس کا تخلیق کردہ ادب پانچ چھ سال تک زندہ رہے گا۔ حوالے کے لئے افتخار نسیم کا مضمون ''مسافرانِ کرام'' ملاحظہ فرمائیں۔ آج سے چند سال پہلے ڈاکٹر اجمل نیازی نے حسن رضوی کے ایوارڈ کے حوالے سے ایک انگریزی انٹرویو میں فرمایا تھا کہ احمد ندیم قاسمی بڑے شریف انسان ہیں لیکن ان کے نیاز مند ہاکی برداروں نے انہیں خراب کر رکھا ہے۔ مجھے نیازی صاحب کے بیان سے سخت اختلاف ہے۔ کیونکہ جب تک انسان خود نہ خراب ہونا چاہے دوسرے لوگ اسے کس طرح خراب کر سکتے ہیں۔ اس موضوع پر مجھے حضرت نیازی کا

ایک پنجابی شعر یاد آیا ہے۔ ''کجھ شہر دے لوک دی ظالم سَن۔ کجھ سانوں مرن دا شوق وی سی''۔ میں ایک ادنیٰ سا شاعر ہوں۔ قاسمی صاحب کا شمار ہمارے ادبی بزرگوں میں ہوتا ہے۔ میرا منصب ہر گز ایسا نہیں کہ میں ان کی ادبی حیثیت کے بارے میں کوئی گستاخانہ بیان دوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے نیاز مندوں ہی کے حوالے سے کہا ہے۔ میں قاسمی صاحب کے ادبی قد کاٹھ کا فیصلہ بھی انہیں کے حوالے کرتا ہوں۔ البتہ یہ بات میں حتمی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ قاسمی صاحب پہلے فیض صاحب کے حاسد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ جالب کے پیچھے پڑ گئے۔ فیض صاحب کے حوالے سے آپ فتح محمد ملک کا وہ زہریلا مضمون پڑھ لیں جو ''اوراق'' کے ۱۹۶۱ء کے پہلے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون قاسمی صاحب ہی کے ایماء پر لکھا گیا تھا۔ ملک صاحب نے اس مضمون میں فیض کو بطور شاعر ختم کر کے ان کی جگہ احمد ندیم قاسمی کو پلانٹ کیا تھا لیکن وزیر آغا نے اس مضمون کو سنسر کر دیا تھا۔ وزیر آغا اور قاسمی صاحب کے تعلقات کی خرابی کا باعث یہی مضمون بنا تھا۔ جالب کے بارے میں ان کی غصہ گری ۱۹۸۹ء میں ان کے ایک انٹرویو سے ملتی ہے جو قاسمی صاحب نے قیامِ دہلی کے دوران ایک اردو اخبار کو دیا تھا۔ قاسمی صاحب نے جیسے ایک معیاری جریدے کو زندہ رکھا ہے اور یہ ان کا ادبی کارنامہ ہے جب تک ''فنون'' جاری ہے ان کا فیض جاری ہے۔ اس کے بعد اللہ حافظ! قاسمی صاحب کا المیہ یہ ہے کہ یہ موضع ''انگہ'' کی پینڈو سیاست سے نجات نہیں حاصل

کر سکے۔ میری نظر میں قاسمی صاحب اگر فیض صاحب سے بڑے شاعر نہیں تو پھر کیا—وہ ڈاکٹر حسن رضوی، خالد احمد، امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی سے یقیناً اور بلا مبالغہ بڑے شاعر ہیں۔

سوال: حسن رضوی کے سرکاری ایواڈ پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ان سرکاری تمغات کے بارے میں باہر کے لوگوں یعنی ادیبوں کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب: ابرار صاحب! مجھے دوسروں کی وکالت کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ البتہ میرے تاثرات یہ ہیں۔ فیض احمد فیض اور حبیب جالب نے پاکستان کے مظلوم، محکوم اور محروم طبقات کی جو نمائندگی کی ہے وہ کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔پاکستان کی کسی حکومت نے ان دونوں کو ان کی زندگی میں کوئی تمغہ نہیں دیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کو رد کر کے ادبی حوالوں سے جتنے تمغات دیئے گئے ہیں وہ سب کے سب باطل تھے غلط تھے۔ ڈاکٹر حسن رضوی کے ایوارڈ پر ادیبوں نے عدالتیں سجائیں۔ حسن رضوی کا کورٹ مارشل کیا۔ کورٹ مارشل کرنے والوں میں احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، احمد فراز، شہزاد احمد اور سرفراز سید نمایاں تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا حسن رضوی سے حضرت جمیل الدین عالی بڑے ادیب وشاعر ہیں۔اگر جمیل الدین عالی کو اس کی دوہے بازی، بے کیف اور بے ربط نثر نگاری پر ایوارڈ مل سکتا ہے تو پھر حسن رضوی کے خلاف کورٹ مارشل سجانے کا کیا جواز ہے۔اگر افتخار عارف کو لندن میں کھیل تماشہ پر ایوارڈ مل سکتا ہے تو پھر حسن رضوی کے خلاف ہنگامہ آرائی چہ معنی دارد؟ حسن رضوی نے وہی طریقہ اختیار کیا جو دوسروں نے کیا۔ حسن رضوی کا Single out کرنا انتہائی بے انصافی تھی۔ پیپلز پارٹی کے آخری دور میں احمد فراز اور ہمارے سر چھوٹو رام (فخر زمان) نے جلد از جلد ایوارڈ حاصل کر لئے۔ مبادا بے نظیر کی حکومت ختم ہو جائے۔ بعد ازاں ہفت روزہ تکبیر کراچی نے ان ادیبوں پر کروڑوں روپے کی خرد برد کے الزامات عائد کئے لیکن حسن رضوی کا کورٹ مارشل کرنے والوں نے ان ادیبوں کے خلاف ایک بھی بیان جاری نہیں کیا۔ آخر کیوں؟ قاسمی صاحب اور قتیل شفائی کا فرض تھا کہ وہ ان ادیبوں کا کورٹ مارشل کرتے کیونکہ یہ ادیب تمام ادیب برادری کے دامن پر بدنامی کے دھبوں کا باعث بنے ہیں۔ لطف کی بات یہ کہ ہفت روزہ تکبیر کراچی کے لگائے گئے الزامات کو آج تک کسی نے چیلنج نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے ادیب اسی کرپشن کی کشتی کے سوار ہیں جس میں حکمراں بیٹھے ہیں۔ یہ اخلاقی طور پر مردہ ہیں انہیں کچھ نہ کہو—کیونکہ یہ لوگ بذاتِ خود نادہندگان کی فہرست میں شامل ہیں۔ پاکستانیوں کا ہر شعبۂ حیات کرپٹ ہو چکا ہے۔ قاتل، شرابی، ڈاکو اور لٹیرے لوگ دولت کے زور پر ایوانہائے نمائندگان میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس قسم کے نظام حکومت میں اس قسم کے کاروبار جاری رہتے ہیں۔ غلط بخشیوں کا سلسلہ بند نہیں ہو سکتا۔ اگر رنڈی باز اور ملکی دولت خرد برد کرنے والوں کو تمغاتِ حسنِ کارکردگی سے ہماری حکومتیں نوازتی ہیں تو پھر ہیرا منڈی کی

خواتینوں کو ایوارڈ کیوں نہیں دیے جاتے ان محترم خواتین کو ان کے فن پر داد کیوں نہیں دی جاتی؟

سوال: آپ کے خیال میں ادیبوں اور شاعروں کو سرکاری عہدے قبول کرنے چاہئیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ آپ کا روئے سخن عطاء الحق قاسمی کی طرف ہے۔ پاکستان کی سیاست باضمیر لوگوں کے لئے ایک انتہائی مکروہ کھیل ہے لیکن ادیبوں کو سیاسی نظریات رکھنے کا پورا حق ہے کیونکہ وہ معاشرے کا ایک اہم جز ہیں۔ پاکستان کی سیاست پر چند نااہل افراد کا قبضہ ہے۔ ان افراد کو سیاسی شخصیات کہنا بھی شخصیت کی توہین ہے۔ پاکستان میں سیاسی عہدے اور سیاسی تعیناتیوں کی روایت چلی آرہی ہے۔ احمد ندیم قاسمی، کشور ناہید، احمد فراز، فخر زمان، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر آغا سہیل اور اشفاق احمد اور ظفر اقبال اور نذیر ناجی اگر حکومتی محکموں کے سربراہ ہو سکتے ہیں تو پھر عطاء الحق قاسمی کے سفارتی عہدے کے لئے کسی خدائی الہام کا انتظار کیوں؟ جب کہ پاکستان میں احمق لوگ وزیر اور سفیر ہو سکتے ہیں، جب کہ کرپٹ لوگ سرکاری میڈیا کے چیئرمین وغیرہ ہو سکتے ہیں تو پھر عطاء الحق قاسمی کے سفارتی عہدے پر معترض ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ پھر عطاء الحق قاسمی کا ادبی قد کاٹھ اگر شاعری میں نہیں تو نثر نگاری میں احمد ندیم قاسمی سے کم تو نہیں۔ بڑے قاسمی نے جو ادبی معرکہ ساٹھ سال کی عمر میں انجام دیا ہے عطاء الحق قاسمی نے وہ منزل پندرہ بیس سال میں طے کرلی ہے۔ میری نظر میں عطاء الحق قاسمی عوامی ذہن اور جمہوری مزاج کا مالک ہے اور وہ صف اول کا طنزیہ کالم نگار ہے اور بڑا مثبت سیاسی ادراک رکھتا ہے۔ وہ عام پاکستانی سفیروں کی طرح پاکستانیوں کو اچھوت نہیں سمجھتا۔

سوال: مغرب میں اردو زبان کے فروغ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ کے دوست اختر ضیائی نے مقتدرہ قومی زبان میں "مغرب میں اردو" نامی کتاب میں جو مضمون لکھا ہے وہ بڑا ہی حوصلہ افزا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: مغرب میں اردو زبان کے فروغ کا وہی عالم ہے جو پاکستان میں چینی زبان کا ہے یا ماسوائے انگریزی کسی اور زبان کا ہے۔ مغرب میں اردو کا تعلق بھارتی اور پاکستانی اردو دان خطوں سے نقلِ سکونت کرنے والے لوگوں سے ہے۔ مقامی آبادی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تجارتی نقطۂ نظر سے یا سرکاری ضروریات کے مدِ نظر ہر ملک میں ہر زبان سیکھی اور سمجھی جاتی ہے۔ تارکینِ وطن کی دوسری یا تیسری نسل اردو لکھنے پڑھنے سے عاری ہے۔ زبان کا رشتہ روزی روٹی سے ہوتا ہے۔ کسی زبان کے فروغ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ زبان مقامی آبادی میں گھر بنا رہی ہے۔ یہاں کے بعض سکولوں میں جو اردو زبان پڑھائی جاتی ہے وہ صرف بول چال کی حد تک ہے۔ جس اردو زبان کے نصاب میں میرؔ، غالبؔ اقبالؔ شامل نہ ہوں وہ کیسی زبان ہوگی۔ اختر ضیائی کا مضمون صرف ایک خوشامدانہ کاوش ہے، یہ مضمون پروفیسر محمود ہاشمی کے مضمون سے ماخوذ ہے۔ ہاشمی صاحب کا مضمون بھی چند سال پیشتر مقتدرہ قومی زبان

نے ہی شائع کیا تھا۔ میں نے اس تحریر میں اردو کے حوالے سے جن کاموں کا ذکر کیا ہے اختر صاحب ان کو گول کر گئے۔ اختر صاحب کے مضمون پر شاہد احمد اچھی تنقید کر چکا ہے۔ میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اختر ضیائی نے اپنے مضمون میں اردو مرکز (مرحوم) کا تانگہ گھوڑا خوب چلایا ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید اس خوشامد کے معاوضہ میں مقتدرہ کی سفارش پر انہیں کوئی چھوٹا موٹا تمغہ مل جائے گا۔ ویسے بھی اختر صاحب کا تعلق جس سیاسی پارٹی سے ہے اس کے منشور کی بنیاد ہی دروغ گوئی پر ہے۔

سوال: برطانیہ یا مغرب میں مین سٹریم کے شاعر و ادیب کون کون سے ہیں؟

جواب: یورپ اور برطانیہ کے معتبر افسانہ نگاروں اور شعرا کا ذکر اس گفتگو کے آغاز اور دوران میں ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ یہاں سنئیر شعراء میں اکبر حیدر آبادی اور خالد یوسف کا کلام معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ احمد شریف بقا، عبدالرحمٰن بزمی، حیدر طباطبائی اور مشیر علوی کی شکل میں اردو زبان کے قادر الکلام ادیب یہاں موجود ہیں جو اردو اور فارسی ادب کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ یورپ اور امریکا میں شاعروں اور ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے جن میں صابر رضا، آغا سید، یشب تمنا، باصر کاظمی، اختر بیدی، عاصم واسطی، جمیل احسن، ایوب خاک، ندیم اقبال، کنول نین پرواز، ماجد مجمی، اعجاز احمد اعجاز، عابد ودود، حیدر قریشی، افتخار نسیم، ارشد لطیف، خالد سہیل، اقبال اختر، اشفاق حسین، صبیحہ صبا، نسیم سید، ڈاکٹر عبدالقوی ضیا، خالد خواجہ، انور خواجہ، عابد جعفری، اقبال حیدر، رخسانہ شیم، محمد علی خان، ثریا شہاب، حنیف اخگر اور حمیرا رحمٰن کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مین سٹریم میں شامل ہونا بھی کوئی قابلِ فخر بات نہیں۔ میر و غالب، اقبال اور فیض مین سٹریم کے شعراء میں شامل نہیں تھے۔ مین سٹریم کے شاعر تو کاروانِ شعراء میں گم ہوتے ہیں۔ ان کا انفرادی طور پر شعر و ادب میں کوئی بڑا مقام نہیں بن پاتا۔

سوال: لندن اور برطانیہ میں خاص کر اردو زبان کے خدمت گزاروں کی نشان دہی کریں؟

جواب: شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ اپنی ذاتی حیثیت اور ذاتی خرچ کی بنا پر اگر کسی شخص کا نام لیا جا سکتا ہے تو تمام اختلافات کے باوجود وہ شخصیت مجاہد ترمذی کی ہے۔ ترمذی صاحب نے فیض مذاکرہ، فیض لیکچر، علامہ اقبال مذاکرہ، فیض نمبر، انسانی حقوق، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان امن مذاکرے اور اسی طرح کے کئی دوسرے موضوعات پر بین الاقوامی سطح پر تقاریب کا اہتمام کیا ہے۔ اگر کوئی شخص ادبی حوالوں سے کسی ایوارڈ کا حقدار ہے تو وہ شخص بلا مبالغہ مجاہد ترمذی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

سوال: آپ نے ایک دفعہ اردو مرکز میں علامہ اقبال کی شاعری پر ایک تنقیدی مضمون پڑھنا چاہا تھا لیکن حاضرینِ محفل نے آپ کے خلاف نعرے بازی کی اور ہنگامہ کر دیا اور آپ کو سٹیج چھوڑنی پڑی۔ علامہ اقبال کے

شعری فلسفہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کے افکار کا کبھی تنقیدی جائزہ نہیں لیا۔ بلکہ انہیں مسندِ انسانیت سے اٹھا کر یا گرا کر فرشتہ بنا دیا۔ ہاتھی کی شناخت کے بارے میں ایک لطیفہ مشہور ہے۔ لیکن علامہ اقبال اردو شاعری کے کوہقامت تھے۔ ہمالیہ تھے، سمندر تھے۔ علامہ پر میر تقی میر کا شعر صادق آتا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے جذبۂ خیر سے شر پر کس قدر قابو پاتا ہے۔ کسی انسان کو فرشتہ بنانا ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی مرد کو مخنث بنا دیں۔ فرشتے کی کوئی جنس نہیں ہوتی جبکہ انسان کی جنس ہوتی ہے۔ کسی انسان کو فرشتہ بنانا اس کے انسان ہونے کی نفی کے مترادف ہے، علامہ کی شاعری کی کئی پرتیں ہیں۔ اسلامی نظریات کی شاعری اور اشتراکی نظریات کی شاعری کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ علامہ صرف شاعر تھے فلاسفر نہیں تھے۔ شاعر محسوسات کی اقلیم کا بادشاہ ہوتا ہے، شاعر فلاسفر نہیں ہوتا۔ علامہ نے مغربی فلسفہ دانوں کا بالاستعیاب مطالعہ کیا اور اسے ہضم کرنے کی کوشش بھی کی لیکن انہوں نے کوئی اپنی تھیوری پیش نہیں کی۔ ان کی اسلامی شاعری اسلامی ناسٹلجیا کی شکار ہے۔ علامہ موصوف اسلام کے دورِ رفتہ کو یاد کر کر کے آنسو بہاتے ہیں۔ مغربی سامراجیت پر علامہ نے اپنی شاعری میں ضربِ کاری لگائی۔ مغربی نو آبادیاتی نظام کو ہدفِ تنقید بنایا، غریب اقوام پر طاقتور اقوام کے قبضے، انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کو قابلِ گردن زنی قرار دیا لیکن علامہ خود اسلامی شہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز پر جھوم جاتے ہیں۔ اسلام نے اپنے دورِ عروج میں غریب اور کمزور اقوام کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا تھا جو اہلِ مغرب نے کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ علامہ ایک طرف سامراجی طاقت کو رد کرتے ہیں لیکن اسی قبیل کی دوسری سامراجی اور نو آبادیاتی طاقت یعنی آلِ سیزر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اسلام کے نام پر کمزور قوموں کو غلام بنانا علامہ کے نزدیک جائز ہے لیکن سرمایہ داری اور عیسائیت کے نام پر ایسا کرنا علامہ کے نزدیک بدتر از گناہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ علامہ اقبال کی تمام اسلامی شاعری اسلامی شاہی دور کے محسوسات اور یادداشتوں (Nostalgia) کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ علامہ اقبال کے اندر ایک اور بڑا علامہ چھپا ہوا ہے اس کا نام ہے کامریڈ علامہ اقبال۔ اس علامہ نے ابلیس کو زندگی کی علامت اور جبرئیل کو خوشامد کا پیکر قرار دیا۔ خضر اور الیاس وغیرہ کو اپاہج کہا۔ کرداروں سے قطع نظر، یہ فکر علامہ اقبال کی ہے۔ اقبال نے ابلیس کو مشتِ خاک کے ذوقِ نمو کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو' اللہ ہو' اللہ ہو'

علامہ کی شاعری میں ابلیس پہلا انقلابی اور باغی کردار ہے جس نے قادر مطلق کے آگے علم بغاوت بلند کیا۔ اس نے حضرت آدم کو بھی اسی راہ پر چلایا۔ علامہ نے کارل مارکس کو مسندِ نبوت تک پہنچا دیا۔ کسی کمیونسٹ نے کارل مارکس کو اتنا بڑا خراج عقیدت پیش نہیں کیا۔

- آں کلیم بے تجلی آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر اگرچہ در بغل دارد کتاب
- اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
- جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
- مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
- دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
- فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

کامریڈ علامہ اقبال کا کلام اس نوع کے افکار سے بھرا پڑا ہے۔ اقبال پہلا ترقی پسند شاعر ہے جس نے غلام انسانیت کو آزادی کا پیغام دیا جس نے اشتراکی فلسفۂ فکر کو اپنی شاعری کی بنیاد بنا دیا۔ علامہ اقبال پہلا شاعر ہے جس نے ظلمت کدۂ ہندوستان میں فکرِ جدید کے چاند سورج اگائے۔ میں کامریڈ اقبال کو سلام کرتا ہوں۔

جو کچھ بھی ہے وہ شوخیٔ عزمِ صمیم ہے
بانگِ درا ہے یا کہ وہ ضربِ کلیم ہے

• • •



پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک خط بخش کے نام

اوسلو ۷؍اکتوبر ۱۹۹۷ء

مکرمی بخش صاحب، "صدا" میں مطبوعہ ساقی فاروقی کی شاعری پر آپ کا مضمون نظر سے گزرا۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ میں ساقی کی نظمیہ شاعری کا مداح ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ساقی کی کوتاہیاں میری نظر میں نہیں، یا میں اس کو زبان و بیان کا ماہر سمجھتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ لندن کی ایک تقریب میں ساقی کو میں نے ٹوکا تھا کہ لفظ و معنی کے رابطے میں تم بری طرح پھسلتے ہو اور تمہارے خطوط میں املا کی ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جو بچے بھی نہیں کرتے۔ مجھے خوشی ہے کہ جن نکات پر آپ نے اپنے مضمون میں گرفت کی ہے، اُن میں سوائے دو ایک کے مجھے زیادہ تر سے اتفاق ہے۔ بیشک نئے تجربے کرنا مستحسن ہے لیکن جو شخص "اسے روشنی فردوش اندھیرا نہ کرا بھی" یا "بتادو کوئی؟" یا "نئے کلام سناؤں" فرماتا ہو اُسے روایتی زبان کو معیار بنا کر دوسروں پر کیچڑ اچھالنے کا کیا حق ہے۔ ساقی کی یہ کمزوری اس کی نفسیاتی الجھن کو ظاہر کرتی ہے۔ کسی حد تک یہ گرہ قاضی شمشاد نبی میں گورکھپور سے چلی آتی ہے۔ اب عمر کی اس منزل میں فرسٹریشن بڑھ رہا ہے۔ اس کے کئی دوست اسے کہہ چکے ہیں کہ دہشت گردی سے شاعری کا بھلا نہیں ہوتا۔ اپنی بڑائی وہی بگھارتے ہیں جن کا ظرف اندر سے خالی ہوتا ہے اور ٹن ٹنانے لگتا ہے۔ شاید ساقی کو ابھی اس کا اندازہ نہیں، مجھے بہرحال اس سے ہمدردی ہے۔
لندن کے دوستوں کو سلام۔

مخلص
دعاگو
گوپی چند



(دائیں سے) سوا میٹا شفقت سلیم، بیگم شفقت،
مُنی ثروت بخش، بخش لائلپوری، بیگم لائلپوری،
میموئی سہونا ہد اور شاہد بخش



دلی میں میزباں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر روشن آرا بیگم،
ثمینہ حسن اور ڈاکٹر حسن صاحب کی بہو۔



بخش لائلپوری بیگم
ر چھوٹے بیٹے شہزاد
ش کے ساتھ



میں (بائیں سے)
نش ثروت بخش،
نعید بیگم بخش اور
تور بخش۔



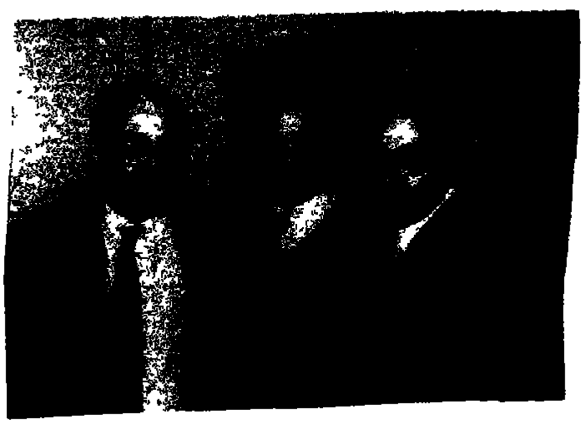
(دائیں سے) ساحل عابدی، جاوید صبیحہ قریشی، بخش لائلپوری، پروفیسر ایس مغل (صدر) اور مسعود منور۔



بخش لائلپوری اور آغا محمد سعید۔



دائیں سے بخش لائلپوری، جاوید شاہین اور ساقی فاروقی۔



بخش لائلپوری، علی سردار جعفری اور جاوید بیگم قریشی۔



دائیں سے پرویز شریف، شاہد شریف عادل اور بخش لائلپوری۔



لندن میں محمود ہاشمی اور بخش لائلپوری۔



(دائیں سے) اقبال [illegible] ، [illegible] ، [illegible] ، بخش، [illegible] اور جاوید [illegible]۔



بخش [illegible] میں غزل سرا ہیں۔



[illegible]



ہائیڈل برگ یونیورسٹی استاد اردو حامد [illegible] اور بخش لائلپوری۔



لندن میں معروف بیرسٹر حامد حسین میواور بخش لائلپوری۔



لندن میں بخش لائلپوری، شش ناہید آرا اور جاوید حکیم قریشی۔



علی مرد، مصری اور بخش لائلپوری۔



لندن میں (دائیں سے) بخش لائلپوری، جاوید شاہین، فریدہ یونس، ساقی فاروقی، جاوید حکیم قریشی، کریم رضا مونگیری مدیر روزنامہ عکاس کلکتہ اور افضل اقبال ۔۔۔ روزنامہ عکاس کلکتہ۔



(دائیں سے) ۔۔۔ سعید، بخش لائلپوری، ۔۔۔ نثار چند ۔۔۔



شوکت صدیقی او



حسن رضوی اور بخش لائلپوری بخش کے گھر پر۔



(بائیں سے) ہرچرن چاولہ، حسن رضوی، بخش لائلپوری صدر مشاعرہ، عطاء الحق قاسمی ایشین آرٹس کونسل کے مشاعرے میں۔



یاگرا آبشار پر فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد اور بخش۔



⬆ لندن میں (دائیں سے) افتخار عارف، ایک محترمہ، فیض احمد فیض، بخش لائلپوری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر قمر رئیس۔



⬅ بخش لائلپوری اور عارف عبدالمتین عارفی (مرحوم)

لندن میں (دائیں سے) بیٹھے ہوئے اشفاق حسین، بشارت ردولوی، ... پروفیسر عقیل رضوی، ... محمد حسن۔



⬇ لندن میں فیض صاحب کے ساتھ آخری مشاعرہ (بائیں سے) رام لعل، فیض احمد فیض، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس۔ بخش کلام سنا رہے ہیں اور ساقی فاروقی ...





لندن میں بخش لائبریری اور ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔



لندن میں (دائیں سے) ڈاکٹر عقیل رضوی، ڈاکٹر محمد حسن، بخش اور بیگم بخش، ماہ سے۔



ناروے میں (بائیں سے) پروفیسر فتح محمد ملک، (نامعلوم) محسن احسان، سحر انصاری
احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سلیمان عباسی، شہزاد احمد، بخش لائلپوری۔

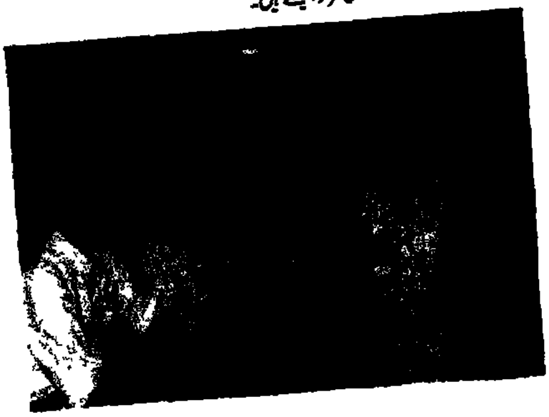


اوسلو، ناروے میں (دائیں سے)
ف۔ س۔ اعجاز۔ مدیر 'ماہنامہ انشاء' کلکتہ
شمشیر سنگھ شیر، احمد ندیم قاسمی
سریش شلا، بخش۔

(دائیں سے) نذیر ناجی، بخش لائلپوری اور سردار بالی۔



دہلی میں بخش لائلپوری اور علی سردار جعفری ایک دوسرے کو اپنا تازہ کلام سنا رہے ہیں۔ ساتھ رئیس مرزا بیٹھے ہیں۔



بخش لائلپوری اور جاوید شاہین۔



لندن میں (دائیں سے) علی سردار جعفری، بلونت کپور، گوپی چند نارنگ، جاوید حکیم قریشی، جاوید شاہین، بخش لائلپوری اور افتخار عارف۔

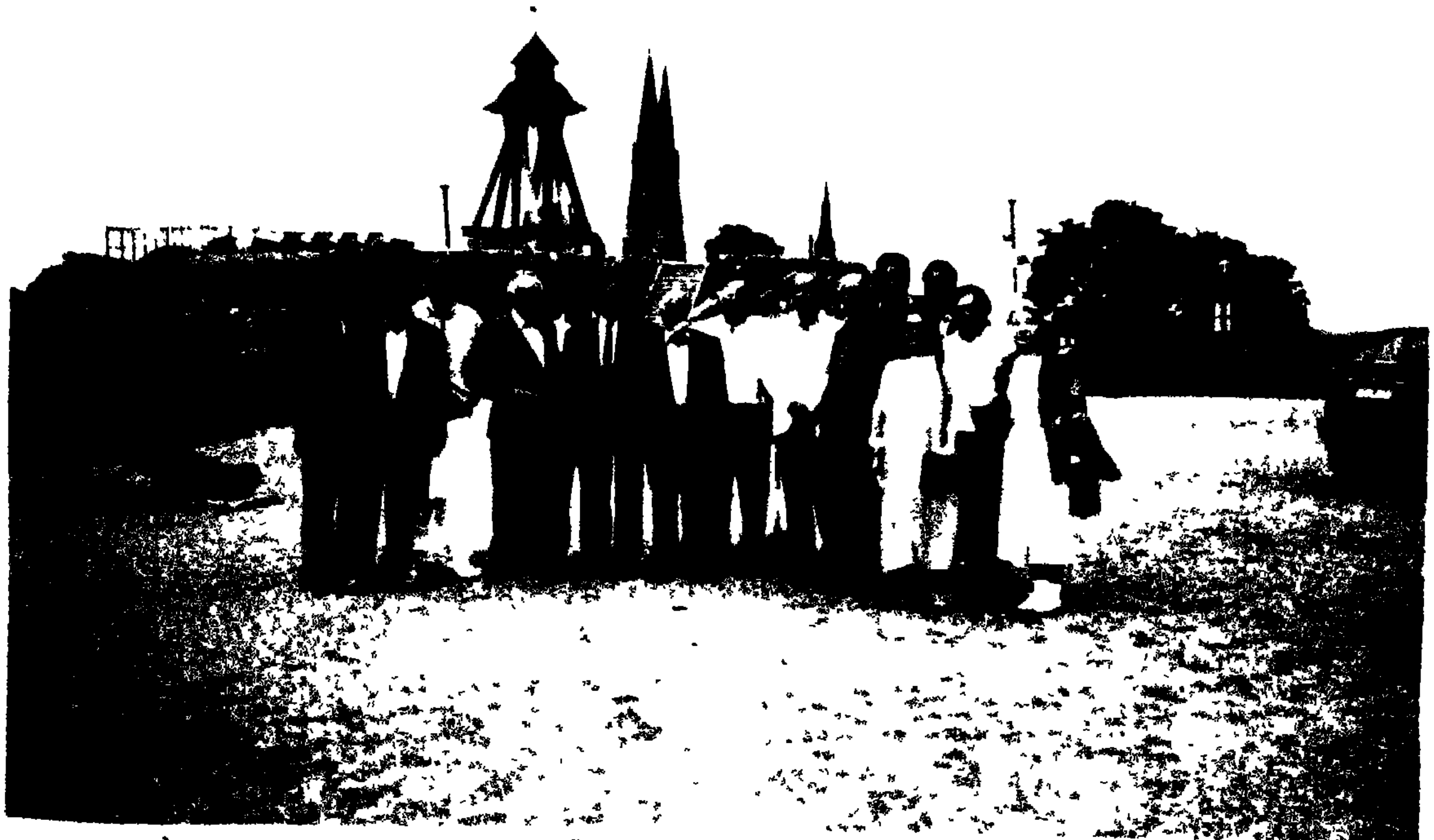


(دائیں سے) سید ابرار ترمذی، بخش لائلپوری اور سعادت سعید۔



بخش لائلپوری، علی سردار جعفری، بلونت کپور، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور جاوید حکیم قریشی۔





[illegible] اور [illegible] کے حوالے سے ایک [illegible] تصویر میں [illegible]
ڈاکٹر خالد سہیل، احمد فقیہ، بخش لائلپوری، عابد حسن منٹو، ڈاکٹر پرویز پروازی اور آخر میں عارف وقار کھڑے ہیں۔

publishers

The responsibility for this situation might in part be placed also on the widely perceived Indian attitude of abjectness before foreign fashions and value-judgements the attitude is represented very noticeably in the British-prone subservience of most Indian publishers As things are, one reflects, Baksh and other South Asian poets and writers living outside their milieu seem a great deal less unfortunate than their English-writing brethren who live in the sub-continent [1]

Muflisi se tang aa kar koi muflis mar gaya,
Khudkashi ki ek surkhi lag gayee akhbaar mein

(This might roughly be renderd as A pauper died of proverty,/ The newspaper carried a headline of suicide' The English translation cannot quite convey the associative, imaged essence of the original Urdu) Not all of Baksh's verse has verse and wit, of course As with much of progressive writing, a good bit of it is direct and without subtle nuance But it is verse that is undoubtedly part of the genius of the Urdu language And , it is this in a way which very likely creates an anomalous situation for Baksh, he is a poet living outside his milieu

Baksh's milieu is in South Asia It is in South Asia that Baksh's wit and the nuances of his Urdu might most effectively be appreciated A poet in this situation would understandably be frustrated, even though Britain boasts thousands of residents who understand and write in Urdu, Hindustani and Hindi The situation seems analogous, somewhat to that of people in South Asian countries who write in English

There is one important difference, however Consider for example the Indian scene The Indian writer living outside his milieu and writing in his own language about concerns and conditions in his country is usually acceptable, without reserve, to critics, publishers and scholars in India But the Indian writer living in India and writing in English— no matter how significant his or her work be considerd in Indian reading and literary circles— does not ordinarily seem acceptable in British literary and publishing circle Examples are by no means difficult to summon The rare exceptions seem arbitrarily chosen, and apparently for reason that have less to do with literary merit than with some special, unexplained interest and appeal on the part of British critics and

brutalisation of the individual in South Asia He says in one of his ghazals

Andar se zakhm zakhm hain baher ki chot se
Wo log jin ke jism per koi nishan nahin

(Roughly rendered 'inside they have wounds from outside hurt / whose bodies are unmarked'

Baksh came to live in England in the 1960s and is now settled in London's Hounslow district (Britain and Pakistan have, evidently a duel - citizenship arrangement - which Indians residing in Britain point out is mutually benificial) He has so far come out with three volumes of verse mostly ghazals, but also a few nazms 'Lahu ka Kharaaj' (Payment in blood) his first selection was published in 1985, 'Zindan-e-Shahr' (Prison city) in 1987 and 'Bad-e-Shumal' (Northern Breeze) in 1989 He proposes to put together another selection shortly

Baksh's verses has won accolades and approval from a number of poets and scholars, including Prof Mohammad Hasan formerly of the Jawaharlal Nehru University and now in charge of the Hindustani Projects at Ghalib Academy in Delhi the late Faiz Ahmed Faiz, Dr Gopi Chand Narang of Jamia Millia in Delhi Dr Qamar Rais of Delhi University and so on Prof Mohammad Hasan observes in an introduction to 'Zindan-e-Shahr that Baksh, rejecting tradition, keeps away in his ghazals from the conventional subjects of love affection of mysticism and human relationships generally that he stands unshaded under the burning sun - 'his poetry is the poetry of pitiless experience of anger and horror of abhorrence of injustice and deprivation He quotes a couplet from one of Baksh's ghazals which is considered characteristic of Baksh at his most witty and most indignant, a sharp expression of which is discernible beneath the surface cynicism

A POET OUTSIDE HIS MILIEU

THE HINDUSTAN TIMES, TUESDAY OCTOBER 19 1993

By Rakshat Puri, (INDIA)

LONDON

A NUMBER of Urdu and Punjabi poets live in Britain, among other South Asian poets and writers who express themselves in Gujarati, Tamil (in the main Sri Lankans), Bangla, Sindhi etc. Among Urdu poets here, perhaps the best known is Baksh Lyalpuri, now somewhere around his mid-sixties. Baksh does a job all day long, and writes verse in offduty hours His eldest son runs a general provision store in west London, not far from where Baksh and his family live

Baksh went to just created Pakistan during the communal riots and blood - letting which he is convinced were deliberately triggered— after the sub - continent was partitioned in 1947 He comes originally from a village near Kapurthala in east Punjab, from where he went to Lyalpur Although Lyalpur was renamed Faislabad to honour a Saudi Arab ruler - Riyadh has favoured Pakistan with money, oil and religion - based benefaction— Baksh did not remove the Lyalpuri "signet" from his nom de plume Baksh's own "Islamiat" or whatever is preceptible of it, has been sub - ordinated to a "progressive" sentiment, which he believes has outlived the Soviet Union and communism in east Europe, and continues in essence to be relevant as a personal attitude in most of the third World: his primary concern is at rampant commercialisation, people's "mechanistic" subordination to uniform western "culturisation", and

Bakhsh's diction is exclusive to himself. He thinks that society is plunging deeper into an abyss kof darkness, and must be saved immediately His style is determind by this urgency, which in turn, dictates his choice of words, similies, metaphors and methods of delivery Bakhsh's diction helps him in discharging his function as a Prophet of Change.

imagery, the purposes and the appeal This is what makes the couplets of his ghazals, the flowers in a boquet, each having its distinct colour and shape yet constituting a pleasant unity.

A feature of Bakhsh's poetry is *onomatopia* i e sounds of the words suggesting their meaning Here are some examples:

جس سے ملایا ہاتھ تو محسوس یہ ہوا
اک بھیڑیے کے جسم پہ انساں کی کھال ہے

(Anyone, I shook hand with, seemed a wolf in a lamb's clothing.)

Here the act of shaking hand leads to the feeling that the fellow's skin was, in fact, a covering of a wolf, the words have a quality of reverberation that reveal the meaning of the couplet.

فاقوں کے کالے ناگ ہیں خرمن کے ڈھیر پر
جاگیر ہے زمیں ابھی جاگیردار کی

(The black serpents of starvation are settling on the heaps of grains! obviously the land is still the property of the landowners.)

Here the words JAGEER and JAGEERDAR, in association with the black serpents create a sound effect to facilitate the meaning.

نہ پھول ہے نہ کہیں رنگ ہے نہ رعنائی
اگے ہیں نقش گلستاں میں اب شجر کیسے؟

(There is no flower, no colour, no elegance What kind of trees are growing in the garden?)

Repetition of "NO" suggests the purpose of the couplet

Lyrical virtue of Bakhsh's poetry also deserves attention A couplet, ought to be a lyrical expression A good poetic composition, little or large, has the built-in characteristics of musical instruments, endowed with latent soprano and bass notes, which combine to give birth to the universal magic of melody This is one of the features of Bakhsh's poetry, which he creates by the right choice of words and matching the selection of meter to his mood and theme.

Lastly, I should add that

role in it This is the reason that his verses do not constitue a series of illusive images but a phantasmagoria of real forms Since he is a Prophet of Change, the courage of his convictions and fervour of dreams seek realisation through an appeal which is highly emotional, yet the effect produced is not that of an idle lover but that of a philanthropist, who loves humanity and is eager to save a starving soul by offering his last morsel of food

His poetry radiates another feature· it is written by some one who has the natural urge to express himself through versification, its easy flow saturated in mellifluence indicates that it is neither a fluke nor a forgery, but a part of revelation which is a privilege of the few.

Many of his verses appear to be composed of colourful lines like those of a painter, owing to their picturesque effects, which create a series of sensory perceptions enabling readers to look into the depth of the poet's mind The effectiveness of his verses also reveal the sources of his pain and pleasure, which stem from his feeling of other people's plight, infested with pity, poverty and powerlessness One can see in his poetry the glimpses of emotional reminiscences, dreams and real events Occasionally, one can see his verses reflecting an outburst of memories like an earthquake, bent on destroying everything that stands in its way

Precision can be termed as the soul of Ghazal because it does not admit repetition or vain verbosity economy of words and their exact use to suit the occasion and mood of the poet, are its true ornaments. In fact, ghazal is the bride that looks a widow without these adornments. Bakhsh is a master in this field; realising the importance of vocabulary, he uses words sparsely, creating in his couplets the compactness, which boosts his

ghazal which means "expressing feelings of love to women and talking to them in an affectionate tone" This is a sad trend in the Urdu ghazal, which is leading to tastelessness, triviality and tawdriness

Love is the greatest word in any vocabulary, yet this is what is being expelled from the Urdu poetry.

Having reviewed the theoretical depth of Bakhsh's poetry, now I may gauge his literary skill

Bakhsh has used all branches of poetry for expressing his thoughts; it includes quatrains, poems, songs, rubaies and ghazals Again, he has used both meter and free verse for expressing himself

There in no English equivalent of ghazal, the favourite form of Bakhsh The verses in a ghazal are like the variegated individual beads of necklace, each having a different hue. It is the regularity of rhyme and refrain that serves as the common thread that gives different verses an aura of unity without disturbing their detachment On the contrary, the Urdu poem is a form of enjambements, enabling one couplet, and even a stanza to run into another couplet or a stanza While every verse of a ghazal is detached from the preceding and succeeding couplets, the couplets of a poem have the same significance in the composition as a link has in a chain.

In English poetry, meter is a pattern of composition dictated by the type and number of measures (feet) in a line. It has an order of accented and unaccented syllables that determine the style of each foot The same way, the (regular) Urdu poetry is governed by meters known as Bahrs, which are mainly of the Arabic origin. Bakhsh, chooses meter to express his thoughts and purpose effectively

A characteristic of Bakhsh's poetry is, that it is not just a product of imagination; experience plays a major

Pakistan As a patriotic poet he dons the mantle of a reformer and crusader In fact, this runs as the major strand throughout his versifications. His poem "Hamen Jan-O-Dil Se Bhi Pyaraa Watan He" leaves the reader in no doubt about his patriotic passion

However, Bakhsh's passions are of societal and chauvinistic nature only His poetry is almost devoid of individual love, appreciation of female beauty and romantic sighs and supplications Though he has used the ghazal-vocabulary in his verses, his words appeal to reason and not heart for lacking romantic touch which is the source of eagerness, excitement, fire, joy, rapture, transport, warmth and zeal From this point of view, his poetry is a garden where there are no flowers, no butterflies, no nightingales. One misses the ecstasy of the lovers' rendezvous, wallowing of lonely hearts, cadence of cardiac palpitations and the delights of long-awaited trysts.

Passion is the foundation of human nature. Both the Bible and Koran have confirmed this truth. So strong was Adam's romantic urge that he defied God to please his female companion and thus deliberately forfeited the luxuries of Pradise including immunity from death and disease Is there a rational man who has not felt pangs of emotion for a woman? Absence of such feelings is a sign of psychological impotence, which is extremely unmanly A woman is not just a bed-partner but a life-companion For man, she is the greatest aesthetic perfection, passion and pleasure She is not a paramour but the paradise, every man's ideal. ★

It has now become customary with the "Progressive" and the "modernists" to denigrate this virtue of

---

★ صاحب مضمون صنف غزل کو خالصتاً ایک ایسا طرز سخن مانتے ہیں جس میں عشق و محبت، ہجر و وصال، بوس و کنار اور محبوبہ کی عشوہ طرازیوں کا ذکر ہو۔ اور وہ غزل جو لوازمات عشق و محبت سے عاری ہو غزل کہلوانے کی مستحق نہیں۔ (مدیر)

Punjab and Sindh provide fine examples of this truth.

This lack of intellectual clarity has considerably contributed to the collapse of the progressive dreams. Had they mounted a direct challenge to the hold that Islam exercises on the minds of its followers, the results might have been different

However, one can vouch for Bakhsh's lucidity of mind by holding that he is a progressive poet within the Islamic context, and like most advanced-thinking Muslims blames the Mullah for all the ills of Islamic society. One can see repeated mention of this proclivity in "Zindan-E-Shahr." For example, note the following verses from his poem "MULLAH"

یہ ملا ہے جہلِ مرکب کے عالم
یہ بغض و تعصب کی روشن دکانیں

(These Mullahs are scholars of compounded ignorance; in fact, they are shops of odium and prejudice.)

جہانِ فریب و جنوں کے پجاری
یہ فرقہ پرستی کی فرسودہ لاشیں

(They are worshippers of the world of deception and insanity truthfully, they are old cropses)

نمود و نمائش سے لبریز سجدے
مساجد میں بے کیف ان کی نمازیں

(Their prostrations are brimming with showmanship, and mosques have become the centres of their tasteless prayers)

جہالت کی کشتی کے یہ ناخدا ہیں
تدبر کی دنیا سے ناآشنا ہیں

(They are captains of the boat of ignorance and are totally devoid of wisdom.)

اگر حرمتِ دیں ہے مقصد تمہارا
حرم سے تم ان آذروں کو اٹھا دو

(O Muslims) if reverence of Faith be the purpose of your life, then remove these mullahs from your presence as statues were eliminated from the Kaaba.

It is quite visible that Bakhsh is a Prophet of Change in relation to

find a solution for our problems)

Surely, the contents of these verses are not compatible with the principles of Marxism Bakhsh claims to be a Prophet of Change, and this assertion deserves attention But at the same time, it casts doubts on his clarity of mind How can a person be a prophet in the semitic traditions and also a a progressive revolutionary? One has to look at the following verse to realise this fact

قبلۂ اوّل بیتِ مقدس
روزِ ازل سے گھر ہے اپنا

(Since the first moment of existence, Jerusalem has been our first Kibla.)

His "DUA" (prayer to God) in Abhi Mousim Nahin Badla, confirms his beliefs in Islam. This tendency to be "a Muslim and a progressive writer" at the same time, has been the bane of the progressive movement because Islam is a set of divine commands, which determines social values eternally, and therefore, the question of "old and new" does not arise. The islamic device of Ijtihad (creating new meanings from the old verses) has been a vain hobby of the Muslim scholars" one cannot change the shape, taste, colour and efficacy of a banana into that of an orange This is the reason that the innovative efforts of the Muslim scholars have led to the creation of several sects, eager to cut one another's throats

For example, Islam is a staunch advocate of capitalism amd feudalism. How can a "Muslim" communist seek it's abolition? Of course, there were politial leaders like Zulfiqar Ali Bhutto, who dreamt up "Islamic Socialism" by twisting the Koranic verses but it led to a disaster Saudi Arabia is the nearest model of an Islamic society, which provides the most favourable climate for capitalism and feudalism. One does not have to travel to Saudi Arabia to realise the veracity of these statements;

message through a determined effort of love which has the same relationship with masses as a surgeon's knife has to a wound A surgical operation is painful but proves to be *comfort - giving through a* process of healing

پریتم پیار کے نشتر سے
دل کے زخم ٹٹولے گا

(The lover treats the wounds of heart with a knife of love)

کشتگاں ستم پہ مرتا ہوں
کیونکہ یہ خاندان ہے میرا

(I will sacrifice my life for the wronged ones because they happen to be my family)

That Bakhsh is a Prophet of equality, justice and social change, and not a Red Revolutionary, is vouched by the fact that he neither believes in cohabitation nor is he an atheist He is a happily married man who adores consortial fidelity His verses speak of his faith in God, the foundation of prophethood, addressing his poem to God, he prays.

دلِ خاموش کو طوفان کی اچھل دینا
درد بھی دینا تو اک درد مسلسل دینا

(O Lord, create an upheaval in the storm that lies silent in my heart, and if you give pain, let it be a never - ending one)

سورجوں کی ہے تمنا نہ ستاروں کی طلب
شب گزیدوں کو فقط عزم کی مشعل دینا

(We the passers of dark nights, do not desire suns and stars but the torch of a staunch determination)

جو تعصب کی ہر اک آگ کو ٹھنڈا کر دے
وہ محبت وہ اخوت ہمیں پل پل دینا

(Give us the sentiment of love and brotherhood that extinguishes the fires of hatred and prejudices.)

میرے اشعار کی لو سے ہو درخشاں ہر آنکھ
میرے لکھے ہوئے الفاظ کو کس بل دینا

(Please Lord, let my verses kindle every eye and let my written words have the fiery power.)

صدقِ نیت سے ہماری یہ دعا ہے یارب
ہمیں درپیش مسائل کا کوئی حل دینا

(O Lord, I pray thee sincerely to

due to a class struggle between the capitalists such as industrialists and landowners, whose aim is profiteering, and the workers who resist exploitation He suggested that the solution of the problem was a head - on collision between the workers and the capitalists The workers must enter the bloody struggle because they have nothing to lose except their chains He assured them the final victory in the contest, leading to the dictatorship of the proletariats, which will put an end to social injustice arising from economic inequality

Those writers who blieved that the Marxist society could be created through sword and fire only, came to be known as the Progressive Writers. They dedicated their pens to the abolition of the old era There was a great deal of good in their thinking, removing injustice and social inequalities were some of their adorable objects but they wanted to realise them through violence, their hatred of the old values was absolute Of course Bakhsh also does not trust the ancient ways but his dislike of them, does not emanate from his dotage to Marxism it is rooted in reason He comes to the conclusion that the Past is no longer representative of the Present

پلٹ پلٹ کے نہ دیکھ اب جہانِ گزراں کو
کہ عہدِ ماضی ترا ترجمانِ حال نہیں

(Do not keep harping at the past because it no longer represents your present way of life)

Bakhsh is still an advocate of change but not through a bloody revolution; his approach is prophetic, to him it is a form of Jehad which is undertaken for righteousness to improve the lot of one's fellow - beings

اہلِ باطل نے ہمیں جھٹلا دیا ورنہ ہم
شمعِ حق ہم نے جلائی تھی رسولوں کی طرح

(It is the lovers of falsehood who turned us down, otherwise we had lit the candle of truth like Prophets).

He wants to convey his

study Bukhsh's poetry, we realise that he is continuing the revolutionary message of Karl Marx, which was echoed by Dr Iqbal and further orchestrated by Faiz and his contemporaries However, Bakhsh is not a mean imitator in this field, his devastating style decorated with the ebullient delivery, which seeks to transform a metaphor into majestic reality, breaks ranks with such progressive writers, whose traditions of pusillanimity and fake morality lead nowhere but to the blind alley His poetic fervour is fuelled by the power of his own experience he has seen money - lenders rob the peasants legally, he has seen children wallowing in poverty; he has seen the innocent being hanged by the corrupt judges and he has seen young widows humiliate themselves for a few coins From the palpitations of his heart comes his message, which is way above the sorcery of words, associated with the lethal tongue of a politician. This is the reson that his poetry knows nothing about the freezing point; it is always boiling and boisterous, yet beautiful and beneficent This is why his verse is creative and carries a message of hope and action for the present and future generations At this juncture, one cannot help noticing that the stress and strength of his message is reinvigorated by the force of a style, which is exclusive to him.

There is a significant point which needs clarification: Bakhsh would have been a Marxist, even if there was no Karl Marx; he is naturally placed in the same gear that happened to be the distinction of Karl Marx, who preached a philosophy, which has come to be known as Dialectical Materialism Karl Marx believed that history is a conflict between two opposing forces, which he termed as thesis and antithesis; their tension is resolved by the forming of a new force, called synthesis. He stressed that the present conditions are

excuses to get myself ensnared

چارہ گروں کے پاس تو ہم بھی گئے تھے بخش
پتھر کی آنکھ زخمِ جگر دیکھتی نہیں

3 O Bakhsh, I also want to see many physicians but their stony eyes were not capable of diagnosing the malady

جلالِ شاہی سے جن کی زبان گنگ ہوئی
سخن کے شہر میں ان بزدلوں کی بات نہ کر

4 Those whose tongues were made dumb by the imperial grandeur, are not worthy of mention in the verse

بخش جو ہر ایک گھر کی روشنی کو پی گئیں
اُن ریائی خانقاہوں پہ کوئی پتھر گرا

5 O Bakhsh, the apparently holy graves, whose light serves as darkness, must be stoned

بخش ہمارا حرفِ صداقت
انسانی منشور بنے گا

6 O Bakhsh, our Word of Truth (one day), shall become the Guide Line for mankind.

These verses clearly state what has inspired Bakhsh to become a people's poet and why he espouses their cause at all costs, it is the penury of the helpless folks and their weeping children that force them to sell their soul to the Devil for making a living under circumstances, no matter, how devious, disgraceful and devastating He believes that those, who have set up their political shops to look as the Messiahs of the nation, are, in fact, like physicians who have stony eyes and cannot diagnose the maladies of their patients. People dare not complain against these wolves in lambs' clothing They are daunted by their pomp and power and take no steps to remedy their plight These Mullahs and Sufi saints are no different either Instead, they are a source of superstition and mental slavery Their tombs, therefore, deserve to be demolished. Bakhsh does hope that his truthful poetry, one day, shall become the Manifesto for the depressed, the deprived and the desolated

In this perspective, when we

usurious system of money - lending. The rustics rebelled against cruel conditions again and again but only to be crushed, creased and crumpled So overwhelmed was he by their plight that he came to believe in the remedial powers of Revolution This thinking had a mutative effect on his religious beliefs as well; he came to realise the occult competence of Lord Lucifer, who revolted against the tyrannical orders of God to establish the rule that every one has the right to justice and self - respect He wonders why God respited this rebel, perhaps, it is a tribute to his courage and the demand for reverence to his right as the Chief of the Angels This is why Bakhsh indulges in revolutionary poetry to demand the restoration of human rights that have been denied, diluted and devastated almost everywhere To him, Iblis is the first revolutionary that this universe saw Yet his respect for Islam is unabated!

Expanding his thesis, he wrote to me· "Shaikh Sahib, I assure you that I sincerely include you in the same category for your courage and commitment to resist tyranny, dictatorship and social injustice because I have learnt a lot from the study of your books "

May be, this short introductory note will suffice to explain the background of this article about the poetry of Bakhsh Lyallpuri

What does Bakhsh stand for? Let him answer the qestion in his own words

غریب شہر کے بچوں کی آنکھ پرنم تھی
وہ دلفریب کھلونے سجے دکان میں تھے

1 Eyes of the poverty - stricken children were moist with tears but shops of the town had been decorated with beautiful toys.

کتنی کشش ہے رزق کے دانے میں دوستوں
کس کس بہانے دام میں پھنسنا پڑا مجھے

2. What a great attraction is in grains of food that I had to make many

BAKHSH LYALLPURI, The Prophet of Change

Anwar Shaikh (London)

Judging poetry is a wasteful, if not a sinful effort because a verse is a thing of beauty which must be enjoyed through admiration, adoration and acclamation Every verse is like a flower, which carries its own mystique, it may vary in colour, fragrance and beauty, yet a flower is a flower and must be appreciated Perhaps, the best appreciation of beauty is, to leave it as it is; never put it to a test, rules of critical appreciation to poetry may prove what sun is to dew, blindness to eyes and stammer to oration But we live in a competitive world where people want to excel others, and this spirit of emulation serves as the fountain of man's priorities, progression and prestige. Therefore, one has to differentiate between the tough and tender, sweet and sour, and dole and delight

Bakhsh Lyallpuri is possibly one man, who deserves an assessment of his poetic talents, but who is he? In November, 1934, he was born in a village near Kapurthala (India) As a result of th partition, his family emigrated to Pakistan in August, 1947, and settled in Lyallpur, now called Faisal Abad He holds a Master's Degree in Economics His second wife, Shamim Akhtar, whom he married after the death of his first spouse in 1967 has been a great companion to him Bakhsh is blessed with five children

A recent letter of Bakhsh tells me about the turning point in his life as a poet in his native land, he noticed how the Banyas had inflicted extreme penury on peasants through a merciless



VOL 13
Regd. No D 162 / 86
Postal Regn WB / CC - 550

MAHNAMA INSHA
Bakhsh Lyallpur Number
NOV - DEC 1998

ISSUE 11 - 12
R N. I Regd No 44083 / 86
ISSN 0971 - 6009

PRINTED AT INSHA PUBLICATIONS 6-A, KANAI SEAL STREET, CALCUTTA - 700 073
PRINTED AND PUBLISHED BY F. S. EJAZ & PUBLISHED FROM 25-B, ZAKARIA STREET, CALCUTTA - 700 073